اضطراب

مدیر
نسیم سندیلوی

السلسلہ ادبی مکمل ناولیات ۱۰۱

ماہنامہ **اضطراب** لکھنؤ

علمی - ادبی - معاشرتی و اخلاقی رسالہ

جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۱

چندہ سالانہ عہ / فی پرچہ ۳ /

مدیر
نسیم سندیلوی - بی اے - آنرز

جولائی سنہ ۴۰ء

نمبر شمار	مضمون		مضمون نگار	صفحہ
۱	اشارے		مدیر	۲
۲	عشق سوچا کیا جواب ترا۔	(نظم)	جناب احتشام حسین صاحب ایم - اے لکھنؤ یونیورسٹی۔	۵
۳	ادب اور زندگی۔	(مضمون)	جناب احمد علی صاحب ایم - اے - لکھنؤ یونیورسٹی۔	۶
۴	اُردو زبان۔	(تقریر)	سر تیج بہادر سپرو۔	۹
۵	تلاشِ سکون ۔	(نظم)	جناب یکتا صاحب حقانی امروہوی ۔	۱۱
۶	دودھ کی لاج	(افسانہ)	جناب آہر القادری صاحب حیدر آباد - (دکن)	۱۲
۷	غزل ۔		حضرت بہزاد لکھنوی - آل انڈیا ریڈیو - دہلی۔	۱۴
۸	قلم استار	(مضمون)	جناب شوکت تھانوی صاحب آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ۔	۱۵
۹	ہماری سوسائٹی	(نظم)	حضرت جوش ملیح آبادی ۔	۱۸
۱۰	ہندوستانی موسیقی ۔	(مضمون)	محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ۔	۱۹
۱۱	ساقی۔	(نظم)	حضرت مجذوب انسپکٹر آف اسکولز۔	۲۳
۱۲	خودکشی۔		نسیم سندیلوی - بی - اے - آنرز۔	۲۴
۱۳	دنیا۔	(نظم)	حضرت آہر القادری۔	۲۶
۱۴	ماں جایا۔	(افسانہ)	محترمہ شفیق بانو صاحبہ۔	۲۷
۱۵	ایک خط کا جواب۔	(نظم)	جناب مسعود اختر جمال صاحب۔	۳۰
۱۶	ادب لطیف۔		تنویر فاطمہ شفیق بانو صاحبہ۔	۳۲
۱۷	ادب کثیف ۔		حاجی لق لق صاحب۔	۳۳
۱۸	بے خبر۔	(افسانہ	جناب طارق صاحب۔	۳۴
۱۹	مجھکو پہ تم نہ کرو سپرد خیال کے الک۔		جناب سلیم صاحب صدیقی۔	۴۰
۲۰	ماں۔	(ڈرامہ)	محترمہ سعیدہ وجاہت علی۔	۴۱
۲۱	خدا۔	(نظم)	حضرت نشتر سندیلوی۔	۴۳
۲۲	طرز الخبرہ۔		مدیر	۴۴
۲۳	کشیدہ کاری۔		بیگم منظور الحسن - آصمہ خاتون۔	۴۷

اضطراب

جلد | جولائی سنہ ۱۹۴۰ء | نمبر

ہم اور آپ

ان حضرات کا احسان مند ہوں جنہوں نے "اضطراب" کو اپنے بیش بہا مضامین سے تسکین دی اور اس میں علم و ادب کی روح پھونک کر میری ہمت افزائی فرمائی۔ میرے خیال میں میری پہلی کوشش نہایت درجہ کامیاب رہی۔ مگر اس کا سہرا ان محبان علم و ادب کے سر ہے جنہوں نے میری اس بیتابی کو رفع کرنے کی کوشش کی اور نمایاں معاونت فرمائی۔

ہر راہ کی پہلی منزل نہایت درجہ تشویش کن ہوتی ہے خصوصاً راہ ادب میں پہلا قدم امید و ناامیدی کی کشمکش کا سچا نمونہ ہے۔ امید ایسی کہ اس کی پرواز عرش اعلیٰ تک پہونچنے کے لیے بیتاب ہے اور ناامیدی یہ کہ میرے محبان علم و ادب کہیں پہلی ہی منزل پر ساتھ نہ چھوڑ دیں اور میں "اضطراب" کو دل کی گہرائیوں میں دبائے بے یار و مددگار رہ جاؤں۔

دراصل "اضطراب" کا مستقبل آپ ہی لوگوں کے ہاتھ ہے۔

آپ ہی لوگوں پر بھروسہ رکھتے ہوئے میں نے منزل مقصود کی طرف قدم اٹھانے کی ہمت کی۔ جہاں تک ممکن ہو سکا مشاہیر کی خدمت میں خود جا کر دست سوال دراز کیا بہتوں نے ہمت دلائی اور مدد کا وعدہ کیا چند حضرات نے راستہ کی دشواریاں سمجھائیں اور اکثر نے بوجہ مصروفیت معذرت چاہی مگر میں نے ہمت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ امید و ناامیدی کو ساتھ لے کر میدان عمل میں قدم بڑھایا ہے

"ہر چہ بادا باد من کشتی در آب انداختم"

اس ماہنامہ کو سیاسیات سے بالکل الگ رکھنا چاہتا ہوں تاکہ یہ سیاسی کشمکش سے بچ کر ادبی۔ معاشرتی۔ اخلاقی و اصلاحی خدمات انجام دے سکے۔

ہمارا ادبی معیار گر گیا ہے چند حیوانی خواہشات کو ابھارنے والے افسانوں اور مضامین میں الجھ کر علم و ادب سے کوسوں دور ہوتا جا رہا ہے۔ اس کو سلجھانے کے لیے میری واحد ناچیز ہستی کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ یہ کام بغیر علم دوست حضرات کی توجہ کے سرانجام نہیں پا سکتا۔ افسانہ نویسی بھی ادب کا ایک بہت بڑا جزو ہے اور جو موثر خدمات ادب اردو کو اس کے ذریعہ سے پہونچ سکتے ہیں وہ نہایت زود اثر اور کار آمد ہیں۔ اگر ہم اپنے اخلاق و معاشرت کو چھوڑ کر خیالی دنیا کی سیر کرنے لگیں تو یہ کب تک اور کہاں تک ہم کو چاہیے کہ ہم اپنی معاشرت اور اخلاق پر گہری نظر رکھیں تاکہ ہمارا ادبی معیار ذلت و رسوائی سے بچ کر ادب کی اگلی صف میں آ کھڑا ہو۔

اس ماہنامہ کو رواج دینے سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اخلاق و معاشرت کے پس پردہ بھاگ متی کا پٹارہ کھول دوں۔ سوسائٹی کی دلچسپی کی خاطر کوک شاستر کے ہر پہلو پر ایک رنگین تبصرہ پیش کر دوں۔ راز و نیاز کی داستان کو رات کی گہرائیوں میں پڑھنے اور لطف اٹھانے کا موقع دوں بلکہ میرا مقصد ہر مرد و عورت اور بوڑھے و بچے میں پاکیزہ و سچے جذبات کو ابھارنا ہے۔ ان سوئے ہوئے جذبات کو جو نفسیات کی اصلاح کر سکیں جو بوڑھوں کو جوان نہ بنائیں بلکہ ان کو دنیا کی نیرنگی و بے ثباتی کا پتہ بتائیں۔ جو ہمارے نوجوانوں میں جوانی کی یاد دلانے کے بجائے معاشرتی و اخلاقی روح پھونکیں۔ جو ہماری بہنوں کو سنیما گھروں، ریل گاڑی اور ہائیڈ پارک کی سیر نہ کرائیں۔ بلکہ ان کے دلوں کو پاکیزہ محبت کے زیور سے آراستہ کریں۔ ان کی زندگی کے معیار کو بلند کریں اور وہ یہ سمجھنے لگیں کہ وہ صرف "عورت" نہیں بلکہ خدا کی وہ عظیم ترین مخلوق ہیں جن پر دنیا کا دار و مدار ہے۔

عریاں اشتہارات جو دماغی و اخلاقی پاکیزگی پر برا اثر ڈالتے ہیں اور جو شریف گھروں میں پہونچ کر نیک بیویوں پر بار خاطر گزرتے ہیں۔ ایسے بازاری اشتہارات بیدخل کر دیے گئے ہیں ان کو خارج کر کے مالی نقصان ضرور ہوگا لیکن مجھے کامل امید ہے کہ میں اس خسارہ کو پرچہ کی اشاعت اور خریداری بڑھا کر پورا کر سکوں گا۔ رسالہ کی ترتیب میں اس بات کی

ہلکا ہی کوشش کی گئی ہے کہ یہ خاندان کے تمام افراد کے لیے یکساں دلچسپ ہو۔ بہت سے گھرانے ایسے ہیں جو مردوں عورتوں اور بچوں کے لیے الگ الگ رسالے نہیں منگا سکتے۔ "اضطراب" مردوں میں ادبی ذوق۔ عورتوں میں حق گوئی یا ہمدردی عزیزی اور بچوں میں سچائی کی لہر دوڑا کر مقبول عام ہونے کی کوشش کرے گا ساتھ ہی ساتھ معلم اکثر اس کے صفحات جو خاص طور پر ترتیب دیے گئے ہیں معلومات میں اضافہ کریں گے۔

مجھے امید ہے کہ پرچہ ہر طبقہ میں مقبول ہوگا۔

مشاہدات

امیر زادے تو زمین پر پیر ہی نہیں دھرتے۔ یہ غرور۔ یہ تکبر۔ یہ طرہ۔ الامان الحفیظ جیسے یہ حضرت آدم کی اولاد سے ہیں ہی نہیں۔ اینٹھے جاتے ہیں سیدھے قدم نہیں دھرتے بات بات میں خود غرضی۔ خودستائی۔ حق تو یہ ہے کہ ان کی دنیا ہی الگ ہے۔ ننگوں بھوکوں کی بستی سے دور ——— بہت دور۔ ان کی راتوں کو تاروں کی جگہ بجلی کے قمقمے روشن کرتے ہیں۔ ان کی نیند فطری نہیں ہوتی بلکہ جام و سبو کا خواب ہوتا ہے۔

ایک صاحب چوڑی بازار سے گزر رہے تھے منہ سے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے۔ پان کی گلوری گال میں دبائے۔ بال بنے۔ آڑی ٹوپی لگائے۔ اٹھلاتے۔ اینٹھتے سنبھلتے۔ ایک ہاتھ میں دستے سگار تنگ کے پورے۔ ساتوں سنگار کیے چلے جا رہے تھے۔ وہ چلتے انھیں ایک نئی طرز سے دیکھتے اور وہ منہ پھیر لیتے۔ ان حضرت کی نگاہیں کوٹھوں کی سیر کر رہی تھیں اور دماغ میں لگائی ہوئی رقم کا تخمینہ کر رہا تھا "دس ہزار کے ریلی کے پرچے پر تیس دو ہزار کا منافع ہوگا۔ منی جان کی ہیرے کی انگوٹھی ہار کی فرمائش کل پوری کی جاسکے گی اس وقت مجھے جاتے شرم نہ لگی۔ میں قالین پر اس کے ساتھ فاتحانہ انداز سے بیٹھ سکوں گا ———"

سیٹھ جی پان کی دوکان پر کھڑے تھے تمباکو کی عادت تھی گزشتہ دو گھنٹے تمباکو کا انتظار کر رہے تھے سیٹھ جی کو تکتے دیکھا تو دوکان سے ہٹ کر سیدھی کی طرف ہو گئے۔

"چوڑی بازار کی سیر ہو رہی ہے۔ یہ گل چھرے اڑائے جا رہے ہیں۔۔" سیٹھ جی نے سوالیہ انداز میں تبسم کے سلام کے جواب میں کہا۔

"سیٹھ صاحب ابھی کام پر سے آ رہا ہوں تمباکو کھانے کو کھڑا ہو گیا تھا۔"

"اچھا تو پھر اب تمباکو ہی کھاتے رہیے کل حساب سمجھا دیجیے گا۔ چوڑی کی سیر کا مت ابھی ہے۔"

کاش کہ دنیا میں لوگ اپنے عیوب کو ہنر نہیں عیب سمجھتے اگر برائی کرتے تو اس کو برا سمجھتے اور کچھ نہیں تو تھوڑی دیر گردن نیچی کر کے اپنے افعال پر نادم ہی ہو لیتے۔ برائی کو اچھا سمجھنے والے کون ہیں؟ وہی اونچے اونچے محلوں میں رہنے والے جو خدا کے بندے نہیں بلکہ بندۂ زر ہیں۔ جو دوسروں کو ذلیل اور اپنے کو سب سے بڑھ چڑھ کر سمجھتے ہیں۔ جو غریب و شکستہ نازک دل رکھنے والی جانوں پر ستم ہی اور ترچھی نگاہ ڈال کر اپنے نفس امارہ کو تسکین دیتے ہیں۔ ان سے پوچھیے کہ اگر کوئی ان کی بہو اور بیٹیوں پر بری ہوئی نظر ڈالے تو شاید اس کی جان ہی لے لیں۔ کتوں سے نچوا دیں۔ اگر وہ "جیسی کرنی ویسی بھرنی" کا کچھ بھی خوف کریں تو پھر انسان ہی کیوں نہ کہلائیں۔

کھاتے پیتے غریب پیٹ کے مارے راہ چلنے کو بدچلن آوارہ اور بدمعاش کہہ دیتے ہیں۔ کہتے ہیں "وہ گھر میں آنے کے قابل نہیں۔ اس کو فوراً نکال دو۔ کہیں چوری نہ کروا دے۔ ڈاکہ نہ ڈلوا دے۔ بدمعاش کہیں کی۔" اگر کسی غریب کو دو گلی یا تالاب پر کھڑے ہوئے دیکھ پاتے ہیں تو غنڈہ شہدہ اور نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالتے ہیں۔ نوکری سے برطرف کر دیتے ہیں پیٹ کا مارا در بدر خاک چھانتا ہے کوئی روادار نہیں ہوتا۔ آپ رات رات بھر الو کی طرح گھوم کو زیب دیتے پھریں سنیما گھروں کی سیر کریں ناچ گھروں کو رونق دیں۔ شب کی تاریکیوں میں بدفعلیوں میں وقت گزاریں اور پھر بھی شریف زادے کہلائیں۔ آپ ولیے۔ یہ ہے دنیا اسی کو دنیا کہتے ہیں۔

وقار۔ عزت۔ رعب۔ دبدبہ یہ سب پیسہ کے دوسرے نام ہیں۔ غریب ضرورت سے مجبور ہو کر کنویں پر پانی بھرنے جائے بازار سے سودا خرید لائے تو بدچلن آوارہ ہے۔ امیر زادے پارک سنیما اور ناچ گھر میں من مانی اٹکھیلیاں کریں تو راج رانی۔

۴

اضطراب

دل کی لگی اور حسن کی دیوی کہلائیں۔

"وہ کیا چیز جو غریب کے لیے ہو؟ تھی جسے امیر کے لیے ضرورت بھی جاتی ہے۔ الحمد للہ انسان انسان ہی تو تھا بات بات پر غریب پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں، وہ وہی امیر کے لیے روا سمجھی جائیں۔ یہ پابندیاں کیا صرف غریبوں کے لیے ہیں۔ غریب ہی پابندیاں برداشت کرے۔ امیر انسان نہیں فرشتے ہیں ان کا احترام باوجود ان کی گندی زندگی کے ضروری ہے۔

ہے کیوں؟۔

کیا ہمارا تمدن اتنا گر گیا ہے۔ ہماری معاشرت اتنی بدل گئی ہے کہ پیسے کے فرق کے علاوہ زندگی کے قانون میں بھی نمایاں تبدیلی کرنی ہوگی۔ غریب کے لیے ہر چیز ناجائز قرار دی جائے گی اور امیر کو اسکی مرضی پر چھوڑ دینا ہوگا؟

النسیم ہما۔
ابو القاسم

۴

؟

پھر صبح سے ہے تیرا اضطراب
آنکھوں سے غنودگی ہے خواب
کس زندگی پہ ہے
کیا یہ زندگی ہے عذاب
زمین میں ذرہ ذرہ

محبوب

رباعی

ہر چہرہ بدلا ہوا ہے اب اور انتخاب
ہے ساز کا انداز شگفتہ گلاب
باغ اور سب کے لیے اضطراب
شاید اسی کا ظرف نام اضطراب

مرزا علی

اپنی پہلی فرصت میں آرڈر دیجیے

گلدستۂ نشاط

ہندوستان کے مشہور ہر دلعزیز ادبا و شعرائے کرام کے مضامین نظم و نثر کا بے حد دلگداز، دلچسپ اور سبق آموز مجموعہ ہے۔ جسے ہندوستان کے ہر دلعزیز ادیب حضرت عادل رشید بمبئی کی شادی خانہ آبادی کے موقع پر بطور تحفہ پیش کیا گیا ہے۔ اپنی پہلی فرصت میں بذریعہ ڈاک پانچ آنہ (۵) کے ٹکٹ ارسال فرما کر "گلدستۂ نشاط" جیسے گرانمایہ مجموعہ کو حاصل کیجیے۔

مینیجر "شاہد" ویکلی گلشن محل لیڈی جمشید جی روڈ۔ ماہم بمبئی نمبر ۱۶

عشق سوچا کیا جواب ترا

عالیجناب سید احتشام حسین صاحب لکھنؤ یونیورسٹی

یہ جمال اور یہ شباب ترا ۔۔۔ دل سے ممکن نہیں جواب ترا
دیکھ کر روئے بے حجاب ترا ۔۔۔ عشق سوچا کیا جواب ترا
بھر گئی کائنات نغموں سے ۔۔۔ کیا کہیں چھڑ گیا رباب ترا؟
آہ! حقیقت بھی سامنے آجائے ۔۔۔ یوں تو دیکھا بہت سے خواب ترا
زہر کا گھونٹ بن گئی تھی شراب ۔۔۔ ہائے اُس دن وہ اجتناب ترا!
پھٹ پڑی ہے بہار دُنیا پر ۔۔۔ کیا اُٹھا گوشۂ نقاب ترا؟
ہائے در پردہ مہر کی وہ نظر ۔۔۔ اور دکھانے کو وہ عتاب ترا
عشق وارفتہ سر کے نالوں پر ۔۔۔ آج خود ہنس پڑا شباب ترا
دل میں شمعیں ہزار جل اُٹھیں ۔۔۔ کیا تبسم تھا کامیاب ترا!
یہی کونین کو سنبھالے ہیں ۔۔۔ میری دیوانگی شباب ترا

ڈوبتی روح کو سنبھال گیا
وقت رخصت وہ اضطراب ترا

مئی ۱۹۵۵ء

ادب اور زندگی

جناب احمد علی صاحب پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی

"ادب زندگی کا آئینہ ہے" یہ فقرہ بار بار ہمارے استعمال میں آچکا ہے لیکن اس کے کیا معنی ہیں؟ کیا ادب واقعی زندگی کا عکس ہے؟ کیوں
اور کیسے؟ یہ سوال ہیں جو ہمارے سامنے پیش آتے ہیں۔ اردو تنقید میں تو میں کہہ نہیں سکتا کہ اس قسم کی کوئی بحث
بہت سے نقاد ایسے ہیں جو اس بات کے ماننے پر غالباً تیار نہ ہوں گے۔ لیکن مغرب کے نقاد اس مسئلہ پر کافی بحث
ہوئی ہے یا نہیں — غالباً نہیں کیونکہ اردو میں جو کچھ تنقید ہے وہ یا تو دقیانوسی ہے یا مہمل اور بے معنی — سرمایہ داری کے حامیوں اور ماننے والوں میں سے ہیں
کر رہے ہیں۔ وہاں دو قسم کے نقاد ہیں۔ ایک تو وہ جو موجودہ اقتصادی اور سیاسی نظام یعنی اس اسکول کو جو کارل مارکس کے فلسفہ پر اپنی تنقید
وہ پر دیتا ہے ادب اور تنقید کو اپنی دنیا میں جگہ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اس لیے وہ
ادب کو تبلیغ کرتا ہے ہرگز گوارا نہیں کر سکتے
دوسرا اسکول ان لوگوں کا ہے جو اپنے تجربہ اور دنیا کی موجودہ رفتار کی بنا پر اس نتیجہ پر پہونچ گئے ہیں کہ سرمایہ داری کے نظام میں
اب گھن لگ چکا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ یہ ہم کو ادب پیچھے کی طرف کھینچتا ہے، اور کسی طرح ہمارے تمدن کو ترقی نہیں دے سکتا بلکہ
وہ تمدن کو مسمار کرنے پر آمادہ ہے جیسا کہ فاشسٹ جرمنی میں تمدن کے خلاف موجودہ جہاد سے ظاہر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صرف ایک نئی اشتراکی
سوسائٹی میں ہی ادب اور تمدن، بلکہ آرٹ اور ہماری زندگی پوری طرح سے پھل پھول سکتے ہیں۔ کیونکہ سوشلزم بجائے انسان کے باہمی
تعلقات کو ختم کرنے یا کچلنے کے (جیسا کہ موجودہ سرمایہ داری نظام میں ہو رہا ہے جہاں مزدوروں کا گلا کاٹا جا رہا ہے اور معدودے چند
روپیہ والے ان کی محنت اور مشقت سے سارا عیش و آرام اٹھا رہے ہیں)، زیادہ انسانیت پسند اور آزاد کر دیتا ہے۔
پہلے اسکول کے نقاد اپنی تنقید کو اپنے یعنی بورژوا ادب پر مبنی کرتے ہیں۔ لیکن یہ ادب صرف انسانیت کے ایک طبقہ دکھاتے
اپنے طبقہ اور اس لیے زندگی کے صرف ایک پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ سرمایہ داری نظام کا ادب بالکل مہمل اور
خراب ہے، اور اسی طرح سے نقاد بھی خراب اور مہمل ہیں۔ نہیں۔ لیکن بورژوا ادب اور نقاد زندگی کے ایک اہم پہلو اور انسانیت کے بیشتر حصہ کو
اپنی دنیا سے نکال دیتے ہیں، اور جو کچھ وہ لکھتے ہیں اس کا نقطۂ نظر صرف ایک جماعت اور اس کے خیالات پر مبنی ہے، اور وہ جماعت متوسط
طبقہ ہے۔ نقاد بجائے اس ادب میں اس جماعت کی موت کے احساس کے صرف اس کی اچھی باتوں پر نظر ڈالتے ہیں اور
دوسری باتوں یعنی سرمایہ داری کی برائیوں پر جو اس ادب میں جھلکتی ہیں، بالکل غور نہیں کرتے۔
دوسرے اسکول کے نقاد سرمایہ داری نظام کے ادب کو مردہ تصور کرتے ہیں اور اس کے اندر موت کے جراثیم پاتے ہیں۔ اس لیے
وہ مزدور جماعت کے ادب کو ترقی پسند قرار دیتے ہیں، کیونکہ اس جماعت میں جان ہے، اور یہ ادب مظلوم انسانیت سے متعلق ہے۔
یہ اسکول زندگی اور سماج کو ایسی چیز تصور کرتا ہے جس میں ہر وقت تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ یہ لوگ اپنی تنقید میں سماج اور انسان پر
روح یا روحانیت کی نسبت مادہ پر زیادہ زور دیتے ہیں کیونکہ بغیر مادہ کے روحانیت وجود میں نہیں آسکتی۔ اور چونکہ دنیا کی ہر چیز میں
زندہ رہنے کے لیے حرکت ضرور پائی جاتی ہے اس لیے وہ اس اصول پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ بہرحال یہ فلسفہ کا ایک مسئلہ ہے جس پر میں اس
وقت بحث کرنا نہیں چاہتا۔
اس وقت تو میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ادب کا زندگی سے کیا تعلق ہے۔

ہم کو معلوم ہے کہ ادب کی بنیاد زندگی پر ہے۔ اور جیسی زندگی ایک قوم یا ملک کی ہوتی ہے ویسا ہی اُس کا ادب بھی ہوتا ہے۔ زندگی کے معنی محض جینا ہی نہیں ہیں۔ زندگی میں اور بہت سی باتیں شامل ہیں۔ جو کچھ ہم کرتے ہیں، جو کچھ ہم سوچتے ہیں۔ جو کچھ ہم کرتے اور سوچتے ہیں زیادہ تر مبنی ہوتا ہے ہمارے ماحول پر۔ اور ہمارا ماحول خود ڈھلتا اور بنتا ہے ہمارے اقتصادی، سیاسی اور سماجی احساسات اور کیفیات سے۔ ہر زمانہ میں اُس زمانہ کے پیداوار کے طریقے ماحول پر اپنا اثر ڈالتے ہیں، اور اس کی شکل بدل دیتے ہیں۔ اس لیے پیداوار کے طریقے انسان کی زندگی پر بڑا اثر رکھتے ہیں۔

ادب بغیر زندگی کے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ دراصل ادب زندگی سے پیدا ہوتا ہے اور اس کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ چونکہ زندگی ماحول پر مبنی ہے اس لیے ادب بھی اُس خاص ماحول کا عکس ہوتا ہے ——— یعنی ادب بھی پیداوار کے طریقوں کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا اور شکل بدلتا رہتا ہے۔

ہر زمانہ کے مسائل اور اس کی ضروریات اُس سے پہلے اور اُس کے بعد کے زمانہ سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس لیے ہر زمانہ کا ادب ایک خاص رنگ رکھتا ہے یعنی شعر کی صنعت ہمیشہ ایک سی نہیں رہ سکتی، کیونکہ صنعت نتیجہ ہے مصنف کے اُن احساسات کا جو زمانہ، روش، مبنی ہیں اور روش ماحول سے ہوتی ہے۔ چنانچہ الف لیلہ اور قصہ چہار درویش اپنے زمانہ کا پورا اور مکمل عکس ہو سکتے تھے، اور اس کی صنعت صرف اسی قسم کی ہو سکتی تھی جیسی ہے۔ لیکن اب چونکہ ہمارے ماحول میں اُس زمانہ کی نسبت زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے، وہ ہرگز اس زمانہ کے صحیح ترجمان نہیں ہو سکتے۔ اب تو ہم یا تو ناول یا افسانہ یا اور اسی قسم کی صنعت کے ذریعہ اپنے زمانہ کا نقشہ کھینچ سکتے ہیں۔ لیکن ناول نویسی کی صنعت میں بھی بڑی تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ مولانا شرر کے تاریخی ناول اب ہمارے زمانہ کی ضروریات کے لیے ناموزوں ہیں۔ اب طلسم اور ظفرنامہ کے قصے نہیں بلکہ ایک اور ہی قسم کی ناول نویسی کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ ناول نویسی جو ہماری زندگی کے مسائل کو پیش کرے اور نہ کہ اُن سے آنکھ چرائے اور تخیل میں پناہ لے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آج کل تاریخی ناول بالکل نہیں لکھے جا سکتے۔ لیکن تاریخی ناول صرف اس وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب قصہ ہماری زندگی کے لیے مفید ثابت ہو اور اُس کے کسی اہم پہلو پر روشنی ڈالے۔

آج کل ہمارے مسائل بنیادی طور پر مذہبی نہیں ہیں بلکہ سرمایہ داری اور سامراجی زمانہ کے ہیں۔ اب جو جماعتیں اہمیت رکھتی ہیں وہ کھاتی پیتی، سرمایہ والی جماعتیں نہیں ہیں، بلکہ غریب انسان ہیں، مزدور اور کسان جو محنت اور مشقت سے روٹی کماتے ہیں، جن پر سرمایہ داروں اور زمینداروں کی نہ صرف نگاہیں گڑی رہتی ہیں بلکہ جو ان کو مشینوں کی طرح استعمال کر کے دھن دولت جمع کرتے ہیں صرف اپنے استعمال کے لیے نہیں بلکہ سرمایہ کو دوگنا اور چوگنا کرنے کے لیے اور غریب انسانوں کو غربت اور مصیبت میں سڑانے کے لیے۔

اس لیے ہمارے زمانہ میں جو ادب جان رکھ سکتا ہے وہ ایسا ادب نہیں ہوگا جو خوابوں یا تصوف میں پناہ لے، بلکہ وہ ادب جو زندگی سے آنکھیں ملانے کی ہمت رکھتا ہو اور اس کے تمام اہم مسائل پر غور اور بحث کرے۔ اور دراصل وہ ادب جو خوابی ہے کبھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر الف لیلہ اُس زمانہ کے لوگوں کی زندگی کو ظاہر نہ کرتی تو وہ آج زندہ نہ رہتی۔ لیکن اس کتاب میں اُس زمانہ کے سماج کا پورا عکس ملتا ہے، اور وہ کتاب مرنے والی نہیں۔

ہمارے یہاں جو قصے اور کہانیاں آج کل زیادہ تر لکھے جا رہے ہیں حقیقت کو ظاہر نہیں کرتے، اور نہ صرف بیکار اور بے معنی ہیں، بلکہ مردہ بھی۔ اور جب تک کہ ہم لوگ زندگی کے نزدیک جا کر اس کے بارے میں نہ لکھیں گے کبھی کوئی زندہ رہنے والا ادب پیدا نہیں کر سکتے۔

ایک طرف ہم سامراجی اور فیشزم کے بڑھتے ہوئے زور کو دیکھ رہے ہیں جو انسان کو ایک اندھیری کوٹھری میں بند رکھنا چاہتے ہیں جہاں تمدن اور علم اور آرٹ کی جھلک کبھی نہیں پہنچ سکتی۔ دوسری طرف جنتا ہے جو اپنے حقوق کے لیے لڑائی پر آمادہ ہے، اور جس نے کم از کم روس میں تو جیت حاصل کر لی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ فیشزم اور سامراج کو جو کہ اپنی موت کا احساس ہو گیا ہے، اس لیے وہ انسان کے دماغ کی بہترین پیداوار یعنی آرٹ، اور زندگی کے بہترین احساس یعنی تمدن کو ہم سے دور رکھنا چاہتے ہیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ کہیں ہم ان زندہ اور ترقی پسند چیزوں کی جھلک دیکھ لیں اور اُن کی طرف بڑھیں اور فیشزم اور سامراج کو ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دیں۔

بحیثیت مصنف اور آرٹسٹ ہونے کے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس چیز کا ساتھ نہ دیں جو موت کے لگ بھگ ہے بلکہ اس کا جس کے اندر زندگی کی موج لہریں لے رہی ہے۔ وہ جماعت جو اب تک پیروں کے نیچے کچلی جا رہی تھی، لیکن جو اب بیدار ہو گئی ہے اور جس کے اندر زندگی کا پورا احساس ہو گیا ہے۔

اور جب تک ہم زندگی کی حرکت اور تغیر کی طاقت کو اس کے اندر کام کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے، جب تک کہ ہم زندگی کی نبض کو محسوس نہیں کر سکتے۔ اس وقت تک ہم بھی اپنے وجود کا اور اپنے زندہ ہونے کا ثبوت نہیں دے سکتے۔

مصنفہ نسیم سندیوی

آغاز خیال

مختصر افسانے

"باوجود اس آواز کے جو بار بار ہمارے کانوں میں پڑتی رہی ہے کہ افسانہ صرف تفریح اور وقت گزاری کی چیز ہے، ہم اسے زندگی سے، حالات سے اور حقیقت سے الگ نہیں سمجھتے ہیں۔ کون ہے جس نے افسانہ پڑھتے وقت اپنے دماغ کے تمام خانے بند کر لیے ہوں۔ دل کے خانے چھوڑ اور افسانہ کو صرف افسانہ سمجھ کر پڑھا ہو۔ کون ہے جسے افسانے سے ایک نہ ایک کردار سے ہمدردی نہ پیدا ہو گئی ہو" (ماخوذ از مقدمہ، سید احتشام حسین رضوی) "آغاز خیال" حضرت نسیم سندیوی کے بارہ منظوم افسانوں کا مجموعہ ہے۔

ماہنامہ "اضطراب" کے خریداروں کو "آغاز خیال" کی ایک کاپی نصف قیمت پر دی جائے گی۔ آرڈر کے ساتھ نمبر خریداری "اضطراب" اور تین پیسہ کا ٹکٹ برائے محصول ڈاک قیمت کے علاوہ آنا ضروری ہے۔ قیمت ۱۰ر رعایتی ۸ر

منیجر "اضطراب" نمبر ۲ دیندیال روڈ لکھنؤ

شاہی روغن مقوی دماغ نمبر ۲۱

یہ نسخہ ایک شاہی طبیب کی بے انتہا کوشش کا نتیجہ ہے۔ شاہی۔ روغن مقوی دماغ ہے۔ یہ تیل بادام صندل۔ خس۔ چمیلی۔ رات کی رانی۔ شنگرف۔ دھنیا۔ انور۔ کھجور۔ کچری۔ ناگرموتھا۔ ہڑ۔ بہیڑہ۔ چھیل چھبیلا اور دوسری جڑی بوٹیوں سے خاص ترکیب سے نکالا جاتا ہے۔

روغن کی خوشبو دماغ کو معطر کر دیتی ہے۔ روغن کی خاص خوبی ہے کہ بالوں کو بھورا ہونے سے بچاتا ہے۔ روغن مقوی دماغ کے استعمال سے بال نہیں گرتے۔ شاہی۔ روغن بالوں کو ملائم، کالا اور گھنا کرتا ہے۔ دماغ کو قوت دیتا ہے۔ حافظہ بڑھاتا ہے۔ طلبا۔ وکلا۔ عورتوں اور بچوں کے لیے یکساں فائدہ مند ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود شاہی روغن مقوی دماغ نمبر ۲۱ کی دو اونس کی چھوٹی شیشی کی قیمت ۹ر اور خوبصورت چار اونس کی بڑی شیشی کی قیمت ۱۵ر ہے۔

ملنے کا پتہ

ماسٹر فتح الرحمٰن حافظ عبدالسلام نزد پریس ٹیلرنگ ہاؤس پل بنگش۔ دہلی

ایک تقریر!

اُردو زبان

یومِ اُردو کے موقعہ پر تیج بہادر سپرو کے ارشادات

ڈھائی سو برس گزرے جبکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپس کے میل جول سے ایک ایسی مشترکہ زبان بنی جسے ہم اردو کہتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ آج یہ کہا جارہا ہے کہ اردو، صرف مسلمانوں کی زبان ہے، ہندوؤں کی زبان تو ہندی ہے، بدنصیبی سے آج کل ہندستان میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوگیا ہے جو ہندوؤں سے یہ کہتا ہے کہ انھیں صرف ہندی کو فروغ دینا اور ہندی ہی کی اشاعت کرنا چاہیے، میں نہیں سمجھتا کہ اس قسم کے لوگ ہندوستان میں ایک مشترک زبان میں تفریق کرکے کیا پائیں گے اس خراب ذہنیت کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زبان جس کو ہندو مسلمان سب ہی بولتے اور سمجھتے ہیں وہ مسلسل مشکل بنائی جارہی ہے اور روز بروز اس کی اصلی روح کا خون ہورہا ہے اگر اردو زبان کو مسلمان صرف اپنی زبان کہیں تو یہ اُن کی سخت غلطی ہے اسی طرح اگر ہندو اُردو زبان کو مسلمانوں کی زبان سمجھیں تو یہ اُن کی ناواقفیت ہے، حقیقت یہ ہے کہ اُردو زبان ہم ہندو مسلمان دونوں کو اپنے آباؤ اجداد سے ایک مشترکہ اور مقدس ترکہ کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابلِ تقسیم ہے اور یہی وہ زبان ہے جو قریب قریب ہر صوبہ میں کم و بیش بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

ہندی ایک بناوٹی اور مصنوعی زبان ہے

مجھے یہ دیکھ کر بڑا قلق ہوتا ہے کہ تقریباً چالیس پچاس سال سے یہ کوشش ہورہی ہے کہ عوام غیر فطری طور پر ایک بناوٹی زبان کو سیکھیں اور اس زبان سے کنارہ کشی اختیار کریں جو فطری طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی میل جول سے پیدا ہوئی ہے اور ان کی آپس کی رواداریوں اور صدیوں کی قربانیوں کا نتیجہ ہے۔

لوگ مجھے جماعت سے بھٹکا ہوا ایک فرد کہتے ہیں، لیکن کوئی سمجھدار آدمی ایسے لوگوں کو اپنے آباؤ اجداد کا سپوت نہیں کہہ سکتا جو اپنے بزرگوں کی قربانیوں کو جان بوجھ کر بھلا سمجھیں اور اپنی پائی ہوئی ایک مقدس میراث کو سرِ بازار لٹا دیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ وہ زبان یعنی اُردو جو قطعاً وقت کی فطری ضرورت سے پیدا ہوئی ہے، مٹائی نہیں جاسکتی، اگر مسلمانوں نے اُردو کی اشاعت میں بہت کچھ کیا ہے تو ہندوؤں نے بھی کسی حالت میں اُردو کے ترقی دینے میں کمی نہیں کی، اُردو ہمیشہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جائداد رہی ہے اور ہے، اگر ہندو اردو کو تباہ کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود اپنی ہی جائداد کو تباہ کر رہے ہیں۔

سنسکرت کے موٹے موٹے الفاظ

ایک گروہ ہے جو اُردو زبان میں سنسکرت کے نامانوس اور نہ سمجھنے والے الفاظ بلاضرورت ٹھونس رہا ہے۔ اور

دوسری طرف جو ابی طور پر عربی فارسی کے نئے نئے الفاظ زبان میں ٹھونسے جا رہے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مشترکہ قومی زبان کا تو ذکر ہی کیا آئندہ ہمارے ہندو بھائیوں کو روزانہ زندگی میں معمولی بات چیت کرنے کے لیے بھی اپنے ساتھ ایک مترجم رکھنے کی ضرورت ہوگی۔ میری نظروں سے روزانہ اردو اور ہندی دونوں اخبارات گزرتے ہیں۔ جن میں اب ایسے ایسے عجیب الفاظ دیکھنے میں آتے ہیں جن کو دیکھنے پڑھنے میں نہیں آتا تھا۔ عوام کا ذکر ہی کیا، ان الفاظ کو اس زبان کے پڑھے لکھے حضرات بھی بغیر سیاق و سباق کے نہیں سمجھ سکتے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ مستعمل الفاظ، وہ الفاظ جو ایک مشترکہ زبان کی ترکیب و ترتیب میں بالکل گھل مل گئے ہیں انہیں کس طرح بدلا جا سکتا ہے اور کس طرح غیر مانوس اور اجنبی الفاظ کو مشترکہ زبان کی عبارت میں کھپانا ممکن ہو سکتا ہے۔ جو لوگ اپنی طرف سے زبردستی عربی یا سنسکرت کے اجنبی الفاظ لا لا کر اپنی زبان میں بھر رہے ہیں کوئی سمجھدار اور انصاف پسند اس کو قومی زبان کی خدمت نہیں کہہ سکتا۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ اگر آپ ہماری زبان کو سنسکرت اور عربی کے نامانوس الفاظ سے بھر رہے ہیں جنہیں ہماری زبان کسی طرح قبول نہیں کرتی تو آپ زبان کی خدمت نہیں کر رہے ہیں بلکہ آپ اس کے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں۔ بعض لوگوں کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ اردو زبان میں استعمال کیے جاتے ہیں جو دیہات میں عام طور پر بولی اور سمجھی جا سکتی ہے لیکن جیسے ہر گاؤں اور قصبہ کی مقامی بولی اور لب و لہجہ میں فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح دیہاتی اور شہری محاوروں اور الفاظ میں فرق ہے تو آپ کہاں تک ان کی تقلید کریں گے۔

زبان کا سوال ہندو مسلم سوال نہیں ہے

میں جو زبان بولتا ہوں۔ اسے میں نے کسی مولوی اور پنڈت سے نہیں سیکھا بلکہ وہ ہمارا آبائی ترکہ ہے جس طرح باپ دادا سے سنتے چلے آئے ہیں اسی طرح ہم بولتے ہیں۔ میں اس وقت بھی جو آپ کے درمیان موجود ہوں تو اس وجہ سے نہیں کہ میں آپ لوگوں میں سے کچھ لوگوں کو خوش کرنا چاہتا ہوں اور نہ میں اس معاملہ کو صرف آپ کا معاملہ سمجھ کر آپ کا ساتھ دینے آیا ہوں، بلکہ میں اس لیے آیا ہوں کہ وہ ترکہ جو ہمارا آبائی ترکہ ہے اسے محفوظ کرنے اور محفوظ رکھنے میں حصہ لوں بلکہ ان چیزوں کا رد کروں جو اس کو پامال کرنے میں استعمال کی جا رہی ہیں۔ یہ ہمارا حق ہے اور بحیثیت ہندوستانی کے ہمارا فرض ہے۔ ہمیں اس معاملہ میں ایک دوسرے کا لحاظ کرنا ہوگا۔ ملک میں سیاسی اختلافات کتنے ہی کیوں نہ ہوں مگر زبان کا مسئلہ ایسا مسئلہ نہیں ہے جس پر ہاتھ ڈالا جائے، یہ ضرور ہے کہ یہ زبان تمام صوبوں میں بولی اور سمجھی جانے کے لحاظ سے کہاں مرتبہ نہیں رکھتی اور نہ کسی زبان کے لیے ایسا ممکن ہے مگر پھر بھی ہر جگہ سمجھی جانے کی وجہ سے قومی زبان ہونے کا مرتبہ رکھتی ہے تو ایسی صورت میں کسی کا یہ کہنا کہ ہم سنسکرت الفاظ استعمال کریں گے کہاں تک مناسب اور حق بجانب ہو سکتا ہے اور ہمارے لیے یہ کہاں تک جائز ہے کہ ہم کسی کے کہنے سے اپنے ادب کو خراب کر لیں اور ہم سب کچھ کھو دینے کے بعد اسے "ہندوستانی" زبان بھی کہیں۔

ہندوستانی کی اصطلاح دھوکے کی ٹٹی ہے

میں "ہندوستانی" کو ایک دھوکے کی ٹٹی سمجھتا ہوں جس کے ذریعہ یقیناً خود غرض لوگ اپنے خودساختہ پیمانے سے زبان اور ادب کو مٹانا چاہتے ہیں۔ حضرات میں آپ کی کوشش میں ہر طریقہ سے شامل ہوں، اگر آپ بھی اپنی قومی زبان کی وراثت کو اپنی اصلی حالت میں محفوظ رکھیں اور اپنی قومی زبان "اردو" کو اردو کہنے سے نہ ڈریں اور اعلان کے ساتھ کہیں کہ ہماری زبان "اردو" ہے اور اس کی عبارت کو ایسی سلیس بنائیں کہ اس کی اشاعت روز بروز بڑھتی جائے تو میں ہر حیثیت سے آپ کے ساتھ ہوں۔

اگر کوئی صاحب اپنی طرف سے عربی کے الفاظ قصداً استعمال کریں گے تو وہ اردو کی خدمت نہ ہوگی، اگر ہندو بھائی اپنی قومی زبان میں سنسکرت کے الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر بھر دیں گے تو سمجھ لیں کہ وہ اٹھتے بیٹھتے اپنی قومی زبان کی

کی بنیاد کو ہلا رہے ہیں۔
میں چاہتا ہوں کہ "اردو" روز بروز ترقی کرے آپ میں یہ اخلاقی جرأت ہو کہ آپ لفظ اردو کو استعمال کرنے میں نہ شرمائیں اور خواہ مخواہ اس کے بجائے لفظ "ہندوستانی" استعمال کرنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ یہ زبان ہمارے آباؤاجداد کا ایک ناقابل تقسیم مشترکہ اور مقدس ترکہ ہے جس کی نہ روح بدلی جاسکتی ہے نہ نام۔

ماخوذ از نیرنگ خیال سالنامہ جنوری سنہ ۱۹۳۹ء

خاص "اضطراب" کے لیے

تلاشِ سکون

(از۔ ابوالحسنات ..... یکتا حقانی امروہوی)

مری نگاہ میں جلوے ہزار پنہاں تھے — تصورات حسیں صد ہزار رقصاں تھے
مرے دماغ میں لاکھوں تھے وہ خیال حسیں — کہ جنکے سامنے جھک جائے لاکھ بار جبیں
خدا گواہ کہ مجھ کو کوئی جنوں بھی نہ تھا — مگر مرے دلِ ہشیار کو سکوں بھی نہ تھا
فقط سکوں کی مجھکو تھی جستجو باقی — قرار دلکو ہو بس یہ تھی آرزو باقی

یکایک آپکے جلووں میں کھو گئیں نظریں
سکوں نصیب ہوا مست ہو گئیں نظریں

خاص "اضطراب" کے لیے

دودھ کی لاج

از حضرت ماہر القادری حیدرآباد (دکن)

شاکر کے باپ کھاتے پیتے زمیندار تھے، گاؤں کی پنچایت کے سرپنچ، ضلع کلکٹر کے اسپیسر، کچہری دربار میں اُن کی رسائی تھی۔ آس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی اُن کی بات سنتے تھے ــــ اور اُن کی بات کیا مانتے تھے، اُن کی غلامی میں تھے۔ شاکر کی عمر مشکل سے چھ مہینہ کی ہوگی کہ اُس کی ماں چل بسی۔ شاکر اپنے باپ کا اکلوتا بچہ تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد شاکر کے باپ نے اپنے چہیتے بچہ کی ٹہل کے لیے ایک عورت کو نوکر رکھ لیا۔ اس نوکرانی کا نام وفاتن تھا۔ وفاتن کہنے کو تو ذات کی تیلن تھی، مگر سیکڑوں شریف زادیوں سے اچھی۔ شاکر کو اُس نے اپنی اولاد کی طرح پالا۔ بچارے شاکر کو مشکل سے چھ مہینے ماں کا دودھ پینا نصیب ہوا۔ اب وفاتن کا دودھ اُس کی نشوونما کے کام آ رہا تھا۔ وفاتن خود گیلے میں سوتی اور شاکر کو سوکھے میں سلاتی۔ اگر "ماں" محبت اور ہمدردی کا نام ہے، تو وفاتن میں یہ سب باتیں پائی جاتی تھیں۔ وہ نوکرانی تھی اور پیٹ کی خاطر نوکری کرتی تھی، مگر قدرت نے شاکر کی ماں کی محبت اُس کے سینہ میں بھر دی تھی۔ وفاتن کا لڑکا خیراتی شاکر سے عمر میں ڈیڑھ سال بڑا تھا، اور وہ بھی ماں کے ساتھ شاکر کے باپ شیخ جی کے گھر میں رہتا تھا۔

وفاتن نے اپنی نیک چلنی، دیانت داری اور ہمدردی کی بدولت شیخ جی کی نگاہوں میں اعتبار قائم کر لیا تھا۔ گھر کا سارا کاروبار وفاتن کے ہاتھوں پر ہوتا، اور بعض کاموں میں تو شیخ جی اُس سے مشورہ بھی لیتے۔ وفاتن سب کچھ اختیار اور اعتبار رکھنے کے باوجود شیخ جی کے حکم اور مرضی کے باہر تنکا بھی نہ توڑتی ــ ایسی وفادار نوکرانیاں قسمت والوں کو ہی ملتی ہیں۔

شاکر نے ہوش سنبھالا تو وفاتن کی ہمدردی اور محبت کے چشمے کو بہنے کے لیے بیتاب ہوا پایا۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے، تو شاکر بھی وفاتن سے ماں کی طرح محبت کرتا تھا۔ ایک دفعہ وفاتن اپنے کسی رشتہ دار کی شادی میں کہیں باہر چلی گئی تو شاکر نے وہ بیل مچائی کہ آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ محبت تعلقات کا نام ہے، اور یہاں تعلقات اور محبت دونوں ایک دوسرے میں سموئے جا رہے تھے۔ خیراتی، وفاتن کا اپنا بچہ تھا، مگر وہ شاکر کو اُس سے کچھ بڑھ کر ہی سمجھتی تھی۔ ایک مرتبہ شاکر نے خیراتی کے بدن پر کلی کر دی، جاڑے کی رُت تھی، ٹھنڈا پانی بدن پر تیر کی طرح جا کر لگا، خیراتی نے شاکر کے گھونسا رسید کیا۔ شاکر رونے لگا، وفاتن شاکر کے رونے کی آواز سن کر بھاگی ہوئی آئی۔

"میاں! کیا ہوا، کیوں رو رہے ہو"ــــ وفاتن نے شاکر کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"خیراتی نے مارا" ــــــ شاکر نے ہتھیلیوں سے آنکھیں ملتے ہوئے جواب دیا۔

"تو نے میاں کو کیوں مارا"ــــ وفاتن خیراتی کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"شاکر میاں نے میرے اوپر کلی کر دی تھی"۔ خیراتی نے جواب دیا۔

"کلی ہی تو کر دی تھی، کوئی بندوق تو نہیں مار دی تھی" یہ کہتے ہوئے وفاتن نے خیراتی کو پکڑ کر جو مارا ہے تو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا۔ شاکر نازک مزاج تھا، بات بات پر مچل جاتا، وفاتن خوشی کے ساتھ اُس کے ناز اُٹھاتی۔

ایک دفعہ باورچی خانے میں وفاتن چائے کا پانی گرم کر رہی تھی، پانی خوب گرم ہو گیا، تو وفاتن چائے کی کیتلی چولھے سے اُتارنے لگی، شاکر باورچی خانہ میں بیٹھا ہوا تھا، تیز طبیعت تھا، اتنی دیر اُس سے بھلا کب بیٹھا جاتا، اُس نے گیند اچھالا، گیند روشندان سے

اضطراب

ٹھوکر جانے کی کیتلی پر گرا، اور پوری کی پوری کیتلی وفاتن کے ہاتھ پر الٹ گئی۔ کھولتا ہوا تیز پانی جو ہاتھ پر گرا تو وفاتن کے منھ سے بےساختہ "دہائی ہے" نکل گئی۔ شاکر یہ حالت دیکھ کر بھاگ گیا۔ شاکر کے باپ شیخ جی، دالان میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے تھے، وفاتن کی آواز سن کر باورچی خانہ میں آئے، انھوں نے دیکھا کہ وفاتن ہاتھ پکڑے ہوئے بیٹھی ہے۔

"وفاتن کیا ہوا خیر تو ہے"۔ شیخ جی نے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں کیتلی اتارنے میں مجھ سے پانی گر گیا"۔ وفاتن نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

اس واقعہ سے شاکر کے ساتھ، وفاتن کی ہمدردی اور محبت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

شاکر پانچ سال کا ہوا تو اس کے ماموں شاکر کو اپنے ہمراہ لے گئے۔ گاؤں میں پڑھنے پڑھانے کا انتظام نہ تھا۔ شاکر کے ماموں کا بیجانا اسی غرض سے تھا۔ تیز مزاج بچے عام طور پر ذہین ہوتے ہیں، شاکر نے پڑھنے کی طرف جو توجہ دی تو اپنے ہم سبق بچوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ زمانہ کو کروٹ بدلتے کیا دیر لگتی ہے، جب شاکر کالج میں پہونچا تو اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ زمینداری کی دیکھ بھال ماموں ہی کرنے لگے کیونکہ اب ماموں ہی شاکر کے سب کچھ تھے۔

کالج کی پڑھائی ختم کرنے کے بعد، شاکر ڈپٹی کلکٹری کے مقابلہ میں شامل ہوا اور اول آیا۔ ٹریننگ کے بعد وہ مستقل ڈپٹی کلکٹر ہو گیا، ماموں ہی کی بیٹی سے شادی ہو گئی، اور شاکر ہنسی خوشی کی زندگی بسر کرنے لگا۔ شاکر سے سب لوگ خوش تھے۔ حاکموں اور افسروں سے رعایا عام طور پر خوش نہیں رہتی، لیکن شاکر نے رعایا کے دلوں کو بھی موہ لیا تھا۔ وہ ایک فرض شناس افسر اور رعایا کا ہمدرد تھا۔

وفاتن اور اس کا بیٹا گاؤں میں دکھ اور مصیبت کی زندگی بسر کر رہے تھے، وفاتن اب بہت بوڑھی ہو گئی تھی۔ وہ خود دوسروں کی ٹہل اور خدمت کی محتاج تھی، خیراتی نے محنت مزدوری کر کے تھوڑا بہت جمع کیا تھا، سو وہ گاؤں کے جواری چوروں کی نذر ہو گیا۔ ماں اور بیٹے دونوں بہت پریشان تھے۔ خیراتی کو خبر لگی کہ شاکر کسی ضلع میں ڈپٹی کلکٹر ہے، اس نے اس بات کا ماں سے ذکر کیا، وفاتن نے کہا کہ چلو شاکر میاں کے پاس چلیں۔ گاؤں کے لوگوں نے سمجھایا کہ اس بڑھیا کا دماغ خراب ہو گیا ہے، بھلا ڈپٹی صاحب اس سے مل سکتے ہیں! ۳

وفاتن نے کہا کچھ بھی ہو، میں شاکر میاں کو ایک دفعہ دیکھ کر رہوں گی، اگر وہ میرے دودھ کا بھی پاس نہ کریں گے، تو بہت سے بہت یہی دھتکار دیں گے، مگر میں ان کو دیکھ تو لوں گی۔

وفاتن اور خیراتی شہر میں آئے اور شاکر کی کوٹھی کا پتہ لگاتے ہوئے وہاں پہونچے، شاکر اپنی کوٹھی کے ہال میں بیٹھا ہوا دوستوں کے ساتھ برج کھیل رہا تھا۔ چپراسیوں نے ان کو سختی کے ساتھ روکا۔

"ہم شاکر میاں سے ملنا چاہتے ہیں"۔ خیراتی نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"سرکار نہیں کہتا، نام لیتا ہے صاحب کا! ابے کیا تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے"۔ چپراسی نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا تو سرکار سے ملا دیجیے، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی"۔ خیراتی نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"یہ منھ اور مسور کی دال! ذرا آپ کی شکل تو دیکھیے! ڈپٹی صاحب بہادر سے ملنا چاہتے ہیں"۔ چپراسی دوسرے چپراسی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں، صاحب ہم ڈپٹی صاحب سے ملنے کے لیے ان کے وطن سے آئے ہیں، وہ ہمیں جانتے ہیں، آپ ہمیں ان تک پہونچا تو دیجیے۔"

خیراتی نے ذرا زور سے کہا، چپراسی خیراتی میں ذرا تیزی کے ساتھ گفتگو ہونے لگی، شاکر نے یہ آوازیں سنیں تو چپراسی کو آواز دی کہ یہ کیا شور ہو رہا ہے، چپراسی نے حاضر ہو کر کہا کہ ایک گاؤں کا آدمی کہتا ہے کہ میں سرکار کے وطن کا رہنے والا ہوں اور سرکار سے ملنا چاہتا ہوں۔

"میرے وطن کا آدمی" شاکر نے تاش کے پتوں کو میز پر رکھتے ہوئے کہا اور باہر نکل آیا۔ بوڑھی وفاتن اور شکستہ حال خیراتی دونوں کھڑے ہوئے تھے۔ شاکر نے ان دونوں کو غور سے دیکھا۔ اس کا دماغ ابھی معلومات ہی ترتیب دے رہا تھا کہ وفاتن نے بڑھ کر کہا۔

"شاکر میاں، میں تمھاری وفاتن ہوں، کیا مجھے بھول گئے"۔

شاکر نے جھک کر وفاتن کے پیر چوم لیے اور خیراتی کو گلے سے لگا لیا۔ وہ ان کو اپنے گھر لے گیا، اور دنیا کو دودھ کا حق ادا کر کے دکھا دیا۔

خاص اضطراب کیلیے | بالکل نئی

غزل

(از حضرت بہزاد لکھنوی آل انڈیا ریڈیو دہلی)

یاد آتی ہے وہ صورت زیبا کئی دن سے
دل میں ہے مرے حشر سا برپا کئی دن سے

رو کے نہ رکیں گے یہ کبھی اشک محبت
مجبور ہے مجبور تمنا کئی دن سے

بے کار سی ہے لذتِ تسکینِ تصور
کچھ اور ہے آنکھوں کا تقاضا کئی دن سے

شاید دل مایوس ہے مانوس شب غم
ہے بند شب و روز کا رونا کئی دن سے

اب تک تو طلب دل کی تھی بس دید کی طالب
بدلا ہے ان آنکھوں کا اشارا کئی دن سے ۱۱

جس درد سے ہوتی نہیں تا عمر رہائی
وہ درد مرے دل میں ہے پیدا کئی دن سے

اس درد کی قسم اب ہوا احساس جبیں کو
ہاں اب تو میں کرتا نہیں سجدا کئی دن سے

لے جان و عالم تری تنویر کے صدقے
بے چین سی رہتی ہے یہ دنیا کئی دن سے

اس درد محبت کی قسم چین نہیں ہے
دیکھا جو نہیں ہے ترا جلوہ کئی دن سے

کیا جانیے کیا بات ہے کیا سوچ ہے کیا فکر
بہزاد حزیں کچھ نہیں لکھتا کئی دن سے

فلم اسٹار

از حضرت شوکت تھانوی

اسکولوں کے نابالغ لڑکے ہوں یا کالجوں کے والدین نا اہل بے علم، خواہ وہ پروفیسر ہوں یا پولیس آفیسر، ایڈیٹر ہوں یا لیڈر، وکیل ہوں یا بیرسٹر، شربت کی دوکان رکھتے ہوں یا پان بیچتے ہوں، یکہ والے ہوں یا کار والے، بیکار ہوں یا برسرِ روزگار، مختصر یہ کہ خواہ کیسے ہی بلند ہوں یا کیسے ہی پست مگر سب حسبِ حیثیت اور بقدرِ ظرف ایک سرے سے فلمی جنون میں مبتلا نظر آتے ہیں اور پردۂ سیمیں کی حسین پرچھائیوں پر مرمٹنے کی وبا آپ کے ہندوستان میں ماشاء اللہ روز افزوں ترقی پر ہے۔ کالجوں کے ہوسٹل کے کمروں میں جہاں پہلے تاریخی ہستیوں کی تصاویر یا اور دلفریب مناظر کے مرقعے نظر آتے تھے اب ان کی جگہ فلمی ممثلات کی تصاویر نظر آتی ہیں۔ مصور اخبارات انہیں تصاویر سے پُر کیے جاتے ہیں۔ سیاسی اخبارات میں بھی ایک آدھ کالم ان ہی فلمی مباحث کے لیے مخصوص پایا جاتا ہے۔ پان والوں کی دکانیں اور ہوٹل ان ہی سینما کی تصاویر سے سجائے جاتے ہیں اور ہر بلند سے بلند اور پست سے پست سوسائٹی میں یہی مباحث زیرِ بحث رہتے ہیں کہ کس فلم میں کس ایکٹر یا ایکٹرس نے کیسا کام کیا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ فلمی وبا اس قدر عالمگیر ہو چکی ہے کہ اب ہندوستان بھی اس سے محفوظ نہیں ہے بلکہ فاقوں کی مصیبت اور تن ڈھانکنے کی فکر کے باوجود جس کو دیکھیے وہ اس مرض میں مبتلا نظر آتا ہے اور اس فلمی جنون کی بڑھتی ہوئی رفتار بتا رہی ہے کہ جو اب تک محفوظ ہیں ان کو بھی آج نہ سہی کل اس مرض میں مبتلا ہونا ہے اور کسی نہ کسی پرچھائیں کے لیے سر دھننا اور ٹھنڈی سانسیں بھرنا ہیں ؎

شوکت میں جانتا ہوں مآلِ حیات کو
مرنا پڑے گا ایک ستمگار کے لیے

واللہ کمال تو یہ ہے کہ راستہ میں کسی دہقان کا کان پکڑ کر پوچھیے کہ "موتی لال کون ہے؟" تو وہ آپ کا منہ اس طرح دیکھے گا گویا آپ کسی اور زبان میں بات کر رہے ہیں۔ اگر آپ اس سے پوچھیں کہ "فلاں ایکٹر کون ہے" تو وہ آپ کو ایسے ایسے حوالے دے کر اس کے متعلق بیان دے گا کہ آپ خود حیرت سے اس کا منہ دیکھیں۔ ممکن ہے کہ کسی بچہ کو اپنی ماں کا نام نہ معلوم ہو مگر فلمی ایکٹرس سے وہ ضرور واقف ہوگا۔ سر تیج بہادر سپرو کو جاننا ہر ایک کے لیے اتنا ضروری نہیں ہے جس قدر کہ فلم ایکٹرس سے واقف ہونا۔ مسز سروجنی نائیڈو کے متعلق کسی ان پڑھ سے کچھ پوچھیے تو وہ نہایت معصومیت کے ساتھ کہہ دے گا کہ ایک صاحب دوکان کا پتہ بتائیے اور … [illegible] … ایک بیچو کا ترجمہ کرنے کی کوئی ضرورت کسی کے لیے نہیں ہے سب ان کے متعلق اتنا ہی جانتے ہیں جتنا کہ وہ خود اپنے متعلق غالباً نہ جانتی ہوں گی۔ خدا گواہ کہ شوکت تھانوی کے جاننے والے باوصف اس ریڈیو نوازی کے شاید چند ہی ہوں گے مگر گھٹیا قسم کے فلم ایکٹروں سے بھی بچہ بچہ واقف ہے یہ دراصل ثبوت ہے اس بات کا کہ پردۂ سیمیں کی پرچھائیوں نے ہندوستان پر مسلط ہو کر اپنا جادو اس طرح جگا دیا ہے کہ ان کے مقابلہ میں کسی کی دال نہیں گل سکتی۔

ان تمام واقعات کے بعد واللہ قائل ہونا پڑتا ہے ہندوستانیوں کے اس بھولے پن کا جس کے ماتحت وہ پردۂ سیمیں کو مفروضہ ماحول کو واقعات کی ایک دنیا جانتے ہیں اور تمثیل کو حقیقت سمجھ کر واقعی سنجیدگی کے ساتھ اس سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ ان کو کیا معلوم کہ اکثر اوقات مثلاً ایک حسین پرچھائیں کی صورت میں پردۂ سیمیں پر ان کی نگاہوں کے سامنے آتی ہے اس کو فنِ تکمیل کے کمالات فسانہ کا پلاٹ اور کردار، ڈائرکٹر کی ہدایات، مصور کی مہارت اور اسٹیج کا ماحول خود اس کی اصلیت سے کس قدر بلند بنا دیتا ہے۔ کالا منہ گورا کر دیا جاتا ہے، چندھی آنکھوں کو غزالی کہا جاتا ہے … قدرتی چہرہ کو تندرست بنا کر پیش کیا جاتا ہے، بیڈھنگی چال کو …

ست تبدیل کیا جاتا ہے۔ دونوں آنکھوں میں [illegible] بھرے جاتے ہیں موٹے موٹے نیلے نیلے ہونٹوں پر پانی سے رقصاں کیے جاتے ہیں مختصر یہ کہ کبھی چونا گندم فروشی سے کام لیا جاتا ہے تو کبھی گندم نما جو فروشی کی ضرورت پیش آتی ہے آپ کو کیا معلوم کہ جس کا فرہ کو آپ پردہ سیمین پر ایک غارت گر دوشیزہ کی صورت میں دیکھ رہے ہیں وہ کتنے [illegible] اور کتنے تو اسوں کی نالی ہے جس سرخ و سفید رنگ والی نازنین پر آپ کا نفس [illegible] [illegible] [illegible] آواز کے نوح پر آپ کی روح وجد میں آ رہی ہے وہ دراصل کیسی کرخت [illegible] جن نرگسی [illegible] والی آنکھوں کا آپ شکار ہو رہے ہیں وہ دراصل مشاطگی کے بغیر آنکھیں بھی معلوم ہوتی ہیں یا نہیں آپ تو اس کو اصلیت سمجھتے ہیں جو کچھ آپ پردہ سیمین پر دیکھتے ہیں حالانکہ وہ اصلیت سے کوسوں دور ایک بہروپ ہوتا ہے اور آپ اس بہروپ کے دیوانے ہیں۔

آپ کو نہیں معلوم [illegible] [illegible] زبردست اہر فلسفہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے وہ علم سے کتنا بیگانہ ہوتا ہے آپ جس کو پردہ سیمین پر [illegible] دیکھتے ہیں وہ فلم کمپنی کا ایک ادنیٰ ملازم ہوتا ہے آپ جس کو شاہزادی جانتے ہیں اگر وہ واقعی شاہزادی ہوتی تو اس کی جوتی کو کیا غرض پڑی تھی کہ [illegible] شاہزادی کا بہروپ بنا کر آپ کے سامنے پیش ہوتی آپ سنیما کی دیوار پر [illegible] کو ہائی کورٹ کا [illegible] فاضل جج دیکھتے ہیں وہ بیچارہ [illegible] خواب میں بھی دیکھنے سے قاصر ہے اور قانون سے اتنا بیگانہ ہے کہ شاید خود اس کا بھی کبھی [illegible] نہ ہوا ہو۔ آپ [illegible] عورت کی وفا شعاری کے قائل ہو جاتے ہیں آپ کو نہیں معلوم کہ وہ واقعات کی دنیا میں کیسی بے وفا ہوتی ہے [illegible] [illegible] ایثار قابل قدر ثابت ہوتا ہے وہ [illegible] میں اس غریب پر تہمت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا قصہ مختصر یہ کہ آپ اکثر فلمی اداکاروں کی خلوت اور جلوت میں کوئی امتیاز نہیں کرتے اور اس تخیلی احول کو واقعاتی دنیا سمجھتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر آپ نے اس تمثیل کا اثر قبول کیا ہے تو یہ تمثیل کا کمال ہے مگر اس کے ساتھ اس کو بھی تسلیم کر لیجیے کہ اس طرح خود آپ کی [illegible] اس شخص کی طرح مسلم کبھی جائے گی جو بیداری کے بعد بھی اپنے خواب پر نہ ہنسے بلکہ خواب میں جو کچھ دیکھا ہے اس کو بیداری کے واقعات میں شامل کرے اور نتائج کا منتظر رہے۔

دراصل ایک فلمی اداکار کی زندگی عجیب و غریب ہوتی ہے اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ ہے اسی صورت اور انہیں حالات کے ساتھ آپ کی نگاہ [illegible] [illegible] پردہ سیمین پر آ جائے ورنہ عام طور پر تو یہ ہوتا ہے کہ ایک اداکار نہایت متقی پرہیزگار ہے پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہے [illegible] روزے رکھتا ہے عورت کو دیکھ کر استغفر اللہ کہتا ہے اور شراب کے ذکر پر اس طرح منہ بناتا ہے کہ گویا کسی نے اس کے منہ میں [illegible] ڈال دی مگر اس کو ایک نہایت بدمست شرابی ایک حد سے گزرے ہوئے عیاش ایک قابل ملامت [illegible] اور ایک نہایت ناپاک کیرکٹر کے انسان کی طرح پردہ سیمین پر آپ پھر اس طرح دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی اس کی پاکبازی کے متعلق قسم بھی کھائے تو آپ یقین نہ کریں اس طرح ایک کم خرچ بالا نشین طبقہ کی عورت آپ کو عصمت و عفت کی دیوی بنی ہوئی نظر آتی ہے ایسی پاکباز کہ آپ اس کی پاکبازی کی قسم کھائیں ایسی پاک دامن کہ آپ وضو کر کے اس کے دامن پر کھڑے ہو جائیں نماز پڑھنے کے لیے بلکہ ع

دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

اسی طرح ضرورت شعری کی طرح ضرورت فلمی کے اعتبار سے بعض اوقات ایک عورت کو اپنے حقیقی شوہر کے ساتھ فلم میں اس طرح کام کرنا پڑتا ہے کہ شوہر بنا ہوا ہے بھائی اور آپ اس کی ہمشیرہ عزیزہ کی طرح اداکاری فرما رہی ہیں یا ڈائرکٹر نے اس کو مناسب سمجھا کہ بیوی ان کا کیرکٹر اچھا پیش کرے گی اور شوہر میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ نہایت سعادتمند بیٹا بن جائے لہٰذا ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیوی کو آپ ماں سمجھیں اور شوہر کو بیٹا جانیں مگر یہ دونوں میاں بیوی تھے میاں بیوی ہیں اور اگر بوجہ طلاق کی نوبت نہ آئی تو میاں بیوی رہیں گے مگر ان کی خلوت سے یہ جلوت کس قدر جدا گانہ ہے کہ یہاں وہ ماں بیٹے ہیں اصلیت اس تخیل کے بعد کیسی منقلب ہو گئی مگر وہ خود اس دلچسپ اور مفروضہ انقلاب کے ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ ان کو اس کی پروا بھی نہیں ہوتی حالانکہ ہم اور آپ اگر اس قسم کا خواب بھی دیکھیں تو گھبرا کر آنکھ کھل جائے۔

ایسا تو اکثر ہوتا ہے کہ طالب و مطلوب قسم کے ایکٹر اور ایکٹرس کو ڈائرکٹر نے مذاقاً نہیں بلکہ نہایت نیک نیتی اور ایمانداری

۱۷

کے ساتھ بہن بھائی کی تمثیل کے لیے منتخب کیا لہذا وہ اس صورت سے آپ کے سامنے پیش ہوں گے اور اسوقت اگر کوئی آپ کے کان میں اصل واقعہ کہدے تو آپ دانتوں کے نیچے انگلی دبا کر یہی کہیں گے کہ بری بات ہے کسی پر اس قسم کا الزام لگانا بھلا کہیں ایسا بھی ہوا ہے" یا یہ کہ در اصل حقیقی بہن بھائی کو ڈائرکٹر نے زن و شو یا طالب و مطلوب کا کیرکٹر دیدیا تو وہ اس تمثیل کو اس طرح پیش کریں گے کہ پھر کوئی قسم آپکو یقین نہ دلا سکے گی کہ یہ بھائی بہن ہیں مگر ان تمام حالات میں خطرہ اول یہ ہے کہ آپ معاف کیجیے گا ذرا بدھو ضرور ہوں اور اگر آپ ان تمام حالات سے باخبر ہوے تو آپ خود ان دیوانوں پر ہنستے ہوں گے جو دیوار کی پرچھائیوں سے سر پھوڑتے ہیں ان کی تیر نظر کے گھائل نظر آتے ہیں ان کے لیے ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہیں اور ان کی تصویر کو کلیجہ سے لگائے پھرتے ہیں حالانکہ وہ اگر بغیر فلمی تخیل اور بجائے اس افسانوی ماحول کے ان کو ان کی اصل شکل و صورت میں روزمرہ کی گھریلو زندگی میں دیکھیں تو شاید پہچان بھی نہ سکیں کہ یہ وہی ہیں جنکی تصویر رہزن تمکین ہوش ثابت ہوئی تھی اور یہ وہی ہیں جن کی موہنی صورت آنکھوں میں سمائی اور دل میں بسی ہوئی ہے۔

بالکل اسی طرح آج کل کے فلمی مجنون اس خبط میں بھی مبتلا نظر آتے ہیں کہ اسکول یا کالج چھوڑنے کے بعد سرکاری نوکری ملے یا چولھے میں جائے تجارت میں کامیابی ہو یا نہ ہو وکالت چلے یا مفلوج ہو جائے لیکن اگر کسی فلم کمپنی میں جگہ مل جائے تو یہ گویا ان کی معراج ہے آجکل کے نوجوان طالب علموں کی بہت بڑی اکثریت وہ ہے جو شب و روز اس دھن میں نظر آتی ہیں کہ اگر ہم یوں بھاندیں تو اس ایکٹر کی ادا پیدا ہوتی ہے اور اگر یوں منہ بنائیں تو بالکل وہ اداکار معلوم ہوتے ہیں اگر اس طرح سنجیدہ بن کر گفتگو کریں تو شاید کسی ایسے اداکار کو بھی رشک پیدا ہو جائے اور اگر یوں آنکھیں پھیر کر گال پھلا لیں تو ایک مضحک اداکار بھی مزاحیہ اداکاری چھوڑ دے یہ طالب علم اپنی سوسائٹی میں یہی نقالیاں کرتے ہیں اسکے بعد تنہائی میں آئینہ کے سامنے اپنی اداکاری کی داد خود ہی دیتے ہیں اپنی چال بھول گئے ہیں اور کسی ایکٹر کی چال چلنا سیکھ لی ہے اپنی ہنسی کی اداؤں دانستہ چھوڑ کر کسی فلم اسٹار کی ہنسی ہنستے ہیں گفتگو کرتے ہیں تو فلمی مکالمہ کا مزا آتا ہے مختصر یہ کہ سوتے میں بھی شاید وہ فلستان ہی کی سیر کرتے ہوں گے اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں سنیما دیکھ دیکھ کر اور فلمی رسائل کا مطالعہ کر کر کے فیل ہوتے ہیں اور جب یونیورسٹی سے پاس ہو کر یا اپنی ذاتی قابلیت کی وجہ سے فیل ہو کر تعلیمی اداروں سے نکلتے ہیں تو چھوٹتے ہی فلم کمپنیوں میں پہونچتے ہیں اور وہاں در در ٹھوکر کھاتے ہیں قصہ دراصل یہ ہے کہ ان کے نزدیک ایک فلم اسٹار سے زیادہ شاندار زندگی کسی اور کی ہوتی ہی نہیں وہ پردہ سیمین کے خوشگوار واقعات کو فلم اسٹار کی نجی زندگی سمجھتے ہیں جس میں سوائے دلچسپیوں کے اور کچھ ہے ہی نہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بھی ایک نظارہ کی طرح اگر اس دریا میں شامل ہو گئے تو جن خواب و خیال کی پریوں کو محض پرچھائیوں کی صورت میں دیکھ رہے ہیں ان کے جلووں میں خود ہی گھرے ہوے نظر آئیں گے ان کی زندگیاں ہماری ہوں گی بات کی لطافتیں ہماری ہوں گی اور ہماری زندگی جس کا اب کوئی مفہوم پیدا نہیں ہوتا وہاں پہونچ کر دوسروں کے لیے قابل رشک ثابت ہوگی حالانکہ جب وہ ایک فلم اسٹار بن کر دیکھیں گے تو ان کو معلوم ہوگا کہ وہ کیا ہیں اور ان کی زندگی کیونکر تماشا بنی ہوئی ہے زندگی کی تمام تلخیاں ان کو وہاں بھی موجود ملیں گی کلفتوں سے ان کو وہاں بھی نجات حاصل نہ ہوگی اور وہی زندگی جو آج ان کے لیے رشک کے قابل بنی ہوئی ہے بلائے جان بن کر رہ جائے گی۔

وہ اندازہ کریں گے کہ ڈائرکٹر کی ماتحتی کیا چیز ہے ان کو معلوم ہوگا کہ ان فلمی پریوں کے قرب کا ذوق ان کو کشاں کشاں کھینچ کر یہاں لایا ہے ان کی حکومت کیسی تکلیف دہ ہے وہ کہیں گے کہ اگر وہ فلم اسٹار نہ بنتے تو دنیا کے ایک کارآمد انسان ہو سکتے تھے اور ان کو احساس ہوگا کہ انھوں نے اپنے لیے جو راستہ تلاش کیا ہے وہ دراصل ان کے لیے نہ تھا ان کی وہ تمام اداکاری کی مہارت جو طالب علمی کے زمانہ میں ان کے لیے مایۂ صد ناز تھی یہاں آکر ان کا اداکارانہ جہل ثابت ہوگی وہ سپر و بشنک آرزو میں جان دیں گے اور ان کو دربان سے زیادہ کوئی کام نہ ملے گا وہ کالج کی ڈگری دکھائیں گے اور ڈائرکٹر کہے گا کہ ناچ دکھاؤ وہ انگریزی میں غصہ کریں گے اور ڈائرکٹر کہے گا کہ ہندوستانی زبان میں مکالمہ بولو وہ اپنی عالی خاندانی کا سکہ بٹھانا چاہیں گے اور ہیروئن کہے گی کہ میری خوشامد کرو ان کا دل رو رہا ہوگا مگر وہ پردہ سیمین پر ہنستے ہوے نظر آئیں گے ان کی ابھی خاصی آنکھیں ہوں گی مگر وہ کانے بنا کر پیش کیے جائیں گے وہ نظرتاً نہایت شریف ہوں گے مگر ان کو حد درجہ کا بدمعاش بن کر اس طرح آنا پڑے گا کہ چار آنہ والے خوب جی کھول کر گالیاں دیں گے وہ نہایت عالی نسب سہی مگر پردہ سیمین پر بھی بھنگی بنے ہوے نظر آئیں گے وہ اس خیال سے فلم کمپنی میں آئے تھے کہ اپنی مردانگی کا جادو چلائیں گے مگر ان کو اس صورت

میں پیش کیا جائے گا کہ عورتوں کو صرف ان ہی سے نہیں مردوں کی جنس سے نفرت ہو جائے گی نہ ہنسی ان کی ہنسی ہوگی نہ رونا ان کا رونا بلکہ وہ تو ڈرامہ کے اشاروں پر اس طرح چلتے ہوئے نظر آئیں گے جس طرح مداری کی لکڑی پر بندر ناچتا ہے اور آخر کار اس تمام زندگی کا آخری تجربہ ان کو یہ حاصل ہوگا کہ وہ ایک تماشا بن کر رہ گئے ہیں اور ان کی زندگی از سرتاپا سوائے بہروپ کے اور کچھ نہیں ہے اگر ایسی ہی ان میں علمی قابلیت ہوتی تو شاید کمپ کے مشہور ایکٹروں میں شامل ہو جائیں۔ کامیابی کی جو امیدیں ہوتی ہیں وہ بغیر فلم اسٹار بنے ہوئے بھی پوری ہو سکتی تھیں بلکہ ممکن تھا کہ وہ اگر فلم اسٹار نہ بنتے تو کوئی نامی گرامی مصنف کوئی مقنن کوئی تاریخی لیڈر یا کوئی اہم شخصیت بن جاتے اور ان کے بعد یہ فلم والے ان کو اس طرح حیرت سے دیکھتے جس طرح وہ خود ان فلم والوں کو دیکھتے ہیں بہرحال چونکہ انھوں نے واقعاتی دنیا پر فلمی دنیا کو ترجیح دی ہے لہٰذا وہ ہمیشہ ایک نقال ہی رہیں گے اور آخر کار کچھ دنوں کے بعد خود اپنے متعلق بھی یہ شبہ ہو جائے گا کہ ہم اصلی ہیں یا نقلی بعد غور کرنے کے بعد وہ اپنے کو غالباً نقلی ہی پائیں گے۔

ہماری سوسائٹی

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

حوصلے سرنگوں، امیدیں شل
آرزو، بار یاس سے بوجھل

نشہ۔ بجھتا ہوا سا ایک شرار
کیف۔ گرتی ہوئی سی اک دیوار

ہر لطیفے کی تہ میں رنج و محن
ہر ظرافت میں ایک پھیکا پن

شرم سے آب آب جولانی
ہر ہنسی۔ شرمسار کھیانی

خال و خط پر دھواں بناوٹ کا
کرب بالقصد مسکراہٹ کا

ہندوستانی موسیقی

(محترمہ عطیہ بیگم کے قلم سے)

ہندوستانی موسیقی کے علاوہ چند ہی مضامین اور ایسے ہوں گے جو اس قدر تاریکی اور گمنامی میں پوشیدہ رہے۔ بڑی تحقیق و جستجو کے بعد ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کے لیے مواد کی کمی یا کال نہیں ہے۔ عہد خیالی اور گزشتہ انسانوی ہمیں چالیس صدیوں کے بڑے وقفوں میں اس بات کی کوششیں کی گئیں کہ اس مواد کو جمع کیا جائے، ترتیب دی جائے۔ موجودہ عمل کو باقاعدہ اصول پر چلایا جائے اور موجودہ اصولوں کو یکجا کیا جائے۔ لیکن ذوق و شوق کی کمی کی وجہ سے عہد گزشتہ کے علم کی ساری دولت اب گرد و غبار کے انبار میں دبی پڑی ہے۔ جب تک کوئی انسانی قوتوں سے بالاتر قوت اس کو از سر نو پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے گی اس وقت تک اس علم کے متعلق ہماری معلومات ہمیشہ ناقص اور غیر مسلسل رہیں گی۔

ہندوستانی موسیقی کا علم اتنا پرانا ہے کہ اگر ہم اس کی اصلیت و ابتدا کا سہرا ابتدائی دیوتا کے سر باندھیں تو مبالغہ نہ ہوگا اس کے تاریخی حالات معلوم کرنے کے لیے یورپ کے موجودہ اندازہ لگانے کے قاعدے کی رو سے ادب سنسکرت کو چار مختلف ادوار میں تقسیم کرنا ہوگا۔

(۱) عہد سنگرہ از [illegible] تا [illegible]

(۲) عہد چاناز [illegible] تا [illegible]

(۳) عہد برہمن از [illegible] تا [illegible]

(۴) عہد سوترا از [illegible] تا [illegible]

ہمیں ایک ایسے گزشتہ زمانے میں لے جاتا ہے جہاں ممکن ہے کہ ہمیں معلوم ہو کہ وہ بہت ہی پرانا ہے لیکن اس سے یہ صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد میں موسیقی نہ صرف موجود تھی بلکہ اس نے ایک اعلیٰ معیار حاصل کر لیا تھا اور راگوں کا یہ قول جو کہ اس علم کا لازمی اصول ہے اور موسیقی کے برہمارس کے نتائج پر وید جاننے والے رشی عمل کرتے تھے اس لیے آریا سب سے پہلی قوم ہے جس نے اس ہنر کو تقریباً پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ ارتقا اور اختراعات اور ایجادات اس زمانہ کے "سام وید" میں نظمیں ہیں کہ رگ وید کا ایک جزو ہے اور جو قربانی کے وقت پڑھا جاتا تھا اس کے اوزان کی مثال وہ خود اپنے آپ ہے۔ ویدوں کے منتروں کے گانے بجانے کا قاعدہ سام شاستر میں دیا ہوا ہے۔ دور حاضر کی موسیقی کی خوبیاں اور نکات موجود ہیں، راگوں کے سرگم باقاعدہ دیے ہوتے ہیں، جس سے وزن کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے اور پھر اس کے گانے کا بھی طریقہ لکھا ہوا ہے۔

اُدگاتری کو (سام گانے والا پجاری) جو کہ قربانی کے احکام پورے کرنے والا ہے اپنی آواز سریلی اور موثر ہونے کی دعا کرنے دو اور اس کو اُدگیتا صاف ستھری اور سادی آواز سے راگوں کے سرگم سیکھنے دو، اور پھر اسی اُدگیتا سے جس میں راگوں کا جزو خوب موجود ہے رت وگ کی رسوم ادا کرو) یہ ایک مستند قول ہے۔

سام وید چلاہی نہ ساستر "جو ایک رسالہ ہے اور سات بابوں پر مشتمل ہے جس میں وید کیسے جاننے کے طریقے بتائے گئے ہیں

مخاذ مکانات اور آوازوں کے سروں، راگوں اور گنگری بھرنے کے اصول بنائے گئے ہیں، موسیقی اور ویدوں کی تعلیم کو لازم و ملزوم بتایا گیا ہے۔ وار عبارت سے کسی طرح الگ نہیں کی جاسکتی۔" ویدوں کی نظمیں گائی جاتی تھیں، "اپ ویدوں" سے اس کو ایک بہتر بنا دیا اور رشیوں منیوں نے جو نذر پرستش کیے اور قابل لوگ ہوا کرتے تھے، اس کو اپنی تعلیم میں داخل کر لیا۔

اس وجہ سے موسیقی کو جو عظمت و بزرگی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور کس نے اور کب تصنیف یا تالیف کیا یہ خود ایک راز ہے۔ حالانکہ علم موسیقی کی ساری کتابوں کا انحصار کامل طور سے یا جزوی اعتبار سے جہاں تک فن اصطلاحات کا تعلق ہے گاندھرو وید پر ہی ہے۔

گاندھرو وید سام وید کی تالیف سے پیشتر اس بات کا صحیح سراغ ملتا ہے کہ آزادانہ طبع اور رجحانات دنیا کے موسیقی میں کار فرما تھے۔ اس کے بعد ایک ایسے طور کا آغاز ہوتا ہے جبکہ وہ رجحانات جو ناقص و فضول تصور کر لیے گئے تھے، اُن کو حرم ساتر کی رو سے پھر مفید ثابت کیا گیا۔ یہ علم ناستر مذہب کی متبرک کتابوں کے نام سے آریائی و رشی منی لوگوں نے تالیف کیا ہے۔

اب ویدک عہد میں موسیقی نے فنون لطیفہ کی حیثیت اختیار کر لی، برہمنوں کے زمانہ سے صرف یہی پتہ چلتا ہے کہ عہد گزشتہ میں صرف راگ راگنیوں کے سر گم کا استعمال ہوتا تھا یا اُن کی آوازوں کی باقاعدہ علمی طریقہ سے تحقیق کی جاتی تھی، جب تک کہ ہم اس سے قبل کے زمانہ میں موسیقی کا ارتقا تصور نہ کریں یہ بات ناقابل فہم معلوم ہوگی۔

عہد برہمن کا ادب اور اپنیشد کا ادب و علم نا فہم اشارات اور کنایات میں پوشیدہ ہے جس سے اس زمانہ کے بعد مذہب کی روحانیت کی خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن جب اشعار کو وہ جامہ جس سے مذہبیت اور روحانیت کا دھوکا ہوتا ہے، اتر جاتا ہے تب سروں اور راگوں سے ان کا براہ راست تعلق واضح طور پر ظاہر ہو جاتا ہے، موسیقی کے "سر جن" اور "گرم" وغیرہ اور راگنی لطیف ساخت سروں کا شمار ترتیب اور ردو بدل اور ان کے مجموعہ بناتے ہیں۔ ان میں ایسے گانے ہیں جن کا بعض سے کوئی سروکار و تعلق نہیں ہے اور باقاعدہ بعض اور راگنیوں کا تعلق ان نام دیوتاؤں کی نسبت سے ہے۔ ۲۰

"چیندوگیہ اور دوسری "اپانشد" میں باوجود تمام چیزوں کو معدوم کرنے کے یہ بات صاف کہی گئی ہے کہ ویدوں کے پڑھنے میں بہت ہی زیادہ معنی خیز اور فوق الفطرت "اوم" کو ضرور پڑھنا چاہیے، ویسے "اوم" ہے کیا؟ یہ سب پر چھایا ہوا ہے، سب سے زیادہ اہم ہے اور سب سے زیادہ جاذب، اور سب سے زیادہ پاک و متبرک ہے۔

رگ "تمام گفتگو کا اصل ہے اور "سام" "پران" یعنی سانس ہے "رگ" اور "سام" مل کر "ادگیتھ" یعنی جو الاپتا "اوگیتا" "سوارہ" ہے (یعنی صاف ستھری اور سادی آواز) اور "اوگیتا" تمام اصلوں کا اصل ہے۔

"اوم" "اوگیتا" ہے جو سب سے زیادہ بزرگ و برتر اور سب سے زیادہ قابل پرستش ہے، اس کی آواز دل کے اندر مع اپنے ساتوں سروں کے گونجا کرتی ہے، جو کہ خاموشی میں بھی موجود ہے، بزرگ و برتر ہے، اور پوشیدہ بھی ہے "برہمن" (یعنی قابل لوگ) بھی غیر متاثر اور ناقابل امتیاز اسی طرح ہوتے جاتے ہیں، جس طرح شہد میں مختلف پھولوں کی مہک و خوشبوئیں معدوم ہو جاتی ہیں اور وہاں اُن کو دائمی حفاظت اور "حیات ابدی" حاصل ہوتی ہے۔

اس طرح "اوگیتا" اور اس کی مختصر آواز میں "اوم" موسیقی الفاظ اور راگوں کی ایک ترتیب ہے، گوتم بدھ کے عہد کی تمام تصانیف سے یہ پتہ چلتا ہے کہ موسیقی باجے، گانے اور ناچ سب جزو زندگی تھے، زندگی میں اختیار کرنے والے اخلاقیات کے اعلیٰ اصولوں کی تشبیہات ہمیشہ دوران گفتگو میں سروں اور راگوں سے دی جاتی تھیں۔

ساتویں سے انیسویں صدی تک اس مضمون پر بہترین کتابیں دستیاب ہوتی ہیں، یہ ایک قابل تعریف بات ہے کہ مستقل مکانات اور پرامن حکومت کی غیر موجودگی میں بھی "پنڈتوں" نے اپنی زندگیاں، غیر فانی تاریخ مرتب کرنے میں اور عہد تاریخ سے پیشتر کی موسیقی کو آنے والی صدیوں سے وصل کرنے میں صرف کر دیں۔

بادشاہ خود علم موسیقی کے ماہر اور قدر دان اور مربی ہوتے تھے اور یہ شہزادوں کی ابتدائی تعلیم کا ایک لازمی جز تصور

اضطراب

کیا جاتا تھا، یہاں تک کہ شاہی عورتیں اور شہزادیاں بھی سنگیت یعنی ناچ گانا اور بجاؤ بتانا خود اپنے "سنگیت شالا" (یعنی خانہ رقص و سرود) میں جو کہ خاص طور پر اسی مقصد کے لیے تیار کیے جاتے تھے اور محلوں سے ملحق ہوتے تھے، سیکھا کرتی تھیں۔

یگانہ عصر و بے مثل فن موسیقی، (بعد میں سارے دنیا پر اثر کرنے کے لیے مخصوص تھا) "عہد دیبنیچی" جو کہ لسانیات کا ماہر تھا، سے قبل ہی، راگوں کا ایک باقاعدہ طریقہ ۵۰۰ ق م میں معلوم کر لیا گیا تھا اس کے ایک عرصہ کے بعد اسی اصول پر ایرانیوں، یونانیوں، عربوں اور سب سے بعد میں انگریزوں نے بھی اپنے اپنے اصول اور قواعد مرتب کیے، جب "بہرام گور" نے جو کہ ایران کا بادشاہ تھا، ہندوستانی گویوں کے کمالات کو سنا تو اس نے ان کو اپنے دربار میں مدعو کیا۔

تقریباً دس ہزار "موجنیں" (یعنی معمولی گویئے) ہند کے بادشاہ "شانکا" نے ایران بھیجے وہاں بہرام گور کی کشادہ دلی سے ان کی حوصلہ افزائی کی گئی اور ان کو سلطنت میں داخل ہونے کی بخوشی اجازت دی گئی۔

جس وقت یونان کے "چندا" نامی شہرہ آفاق بربط نواز (یعنی چنگ بجانے والے) نے راگوں میں "اسے" اور "دای" داخل کی اور ایتھنا عورت نے "نیا" داخل کر کے دوہرے سروں کا سرگم سات سو سال قبل مسیح مکمل کیا تھا، اس سے پہلے ہندو دوہرے سروں کے سرگم ہندوستان میں مکمل کر چکے تھے، یہ سکندر اعظم ہی تھا جو دریائے سندھ کے کنارے سے اپنے ساتھ راگوں کے سرگم اپنے وطن لے گیا تھا اور تاریخی اعتبار سے یونانی ہی وہ پہلی قوم ہے جس نے پرانی دنیا میں سب سے پہلے "مرچن" یعنی چوتھائی سرگم چلائے۔

ہندوؤں کا علم موسیقی کا بابا آدم کہا جا سکتا ہے، رفتہ رفتہ ایران میں داخل ہونے لگا، اس کے بعد یونان میں پھر عرب میں اور وہاں سے وہ پھر ہندوستان دیس لایا گیا اس طرح اس کو پھر پرانے طرز پر لایا گیا اور وہی آج ہندوستانی موسیقی ہے ایک ہزار سال گذر گئے کہ مسلمانوں کے آغاز سے ہندوؤں کی تمام تخیلی ترقی مسدود ہو گئی لیکن انجام کار فاتح بادشاہوں نے ہندوؤں کے علم موسیقی کو ایک اعلیٰ فن ہی تصور کر کے اختیار نہیں کیا بلکہ انھوں نے اپنے زور آور اور تاکیدی حمایت اور راہ و رسم سے اصلی موسیقی کے کچھ خد و خال بھی تبدیل کر دیے، جنوبی ہند باہر کے اثرات سے محفوظ رہا اور خونی جنگوں نے آریوں کے جذبات اور احساسات کے مواد کو ضائع نہیں ہونے دیا اور شاستروں کی روایات کو قائم و برقرار رکھا ہے وہ بہت ہی صحیح ہے اس لیے اس کو بتدریج کتابوں سے باقاعدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

شمالی ہند میں بڑی گڑبڑ ہو گئی موسیقی کو موجودہ دو اقسام میں تقسیم کر دیا گیا، ہندوستانی یعنی شمالی اور کرناٹکی یعنی جنوبی یہی دو اسکول صدیوں اس ملک میں رائج اور قائم رہے ہیں اور خاص فرق ان کے دو مکمل آزاد "شدھ" یا ابتدائی سرگم میں پایا جاتا ہے، ہندوستانی کا انحصار "بلاول" کے سرگم پر ہے، اور کرناٹکی کا دار و مدار "کناکنگی" کے سرگم پر ہے، ان دونوں میں سے شمالی موسیقی کی لطافت، کشش و جاذبیت کا اس موجودہ بگڑی ہوئی حالت میں بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مورتی میناور پاس" کے مشہور دور حکومت میں اصلاحات اور فنون لطیفہ کو عروج کمال پر پہونچانے میں بہت ہی پر جوش کوشش کی گئی، اسی وجہ سے اس دور کی لاتعداد ہر قسم کی شاندار یادگاریں۔ بہادر، شریف، پر شوکت اور شاندار قوم کی جس نے فتح کیا حکومت کی ترقی کی اور جس نے دائمی برقرار رہنے والی شان و شوکت حاصل کی برقرار ہیں، اٹھارھویں صدی کے آخری نصف حصہ میں مسلمانوں کا نزول ہو چلا تھا اور ملک پر انگریزوں کا اثر ہوتا جا رہا تھا اور تمام ملکی صنعت و حرفت تباہ ہو چلی تھی، موسیقی بھی آہستہ گر یقینی تباہی کے نتیجہ میں آ گئی تھی، یہی وجہ ہے کہ آج ہندوستان کا بہترین یگانہ صرف نام کو باقی رہ گیا ہے۔

فنی اعتبار سے ہندوستانی موسیقی نہایت ہی عمدہ اور باقاعدہ طور پر مکمل ہے جہاں تک سروں اور راگوں کا تعلق ہے ان میں پورے بائیس راگ ہیں، اس لیے سروں کو ان کی اصلی حالت میں باقاعدہ ادا کرنا جوئے شیر لانے سے کم دشوار نہیں ہے جس کے لیے سالہا سال کی محنت و کاوش درکار ہے اس مختلف اقسام (تحت) میں پورے دو سو مختلف راگ ہیں اور قاعدہ کی رو سے وہ دن اور رات کو پہنے اپنے وقت و محل کے لحاظ سے گائے جاتے ہیں، راگوں اور سروں کا اتار چڑھاؤ علم الحساب کی رو سے بہتری

باقاعدہ ہے۔ یہ راگ یعنی سُر کی شکلیں ہوا کی سنسناہٹ ستاروں کی رفتار پانی کی روانی اور چڑیوں کے زمزموں اور جھونکوں سے اخذ کیے گئے ہیں۔ عہد گذشتہ کے قانون ساز فطرت کو نظر غائر سے مطالعہ کرنے والے طلبا ہوتے تھے اُنھوں نے آوازوں کے پوشیدہ رازوں کو کھول کر منظر عام پر سب کے سامنے پیش کیا۔ اور انھوں نے بعض صاف اور نمایاں آوازوں کو باقاعدہ وقت و موسم کے لحاظ سے ترتیب دے کر راگوں کو طبیعت کے مطابق بنا دیا۔

مغربی اور ہندوستانی موسیقی میں دو نمایاں فرق پائے جاتے ہیں، اول الذکر تو بالکل ایک کل کی مانند صرف وہی چیز پیدا کرتی ہے جو اس سے پہلے کوئی پیدا کر چکا ہے گو اس میں اس غریب اُستاد کو اپنی انفرادیت دکھانے کا موقع نہیں ملتا، بس کل کی مانند ایک ہی چیز کو دہراتا رہتا ہے لیکن ہندوستانی گویا راگ کے ڈھانچہ کو لے کر اس میں تاؤس و مختلف الانواع تبدیلیاں پیدا کرتا ہے اسی طرح کی قوتیں اور رنگینی میں پیدا کرتا ہے اس کو خود اپنی ذہانت اور قابلیت کے اظہار کا موقع ملتا ہے اور گانے کے دوران میں وہ اسی وقت نئی نئی تانیں اور اُتار چڑھاؤ پیدا کر کے اپنی انفرادیت ظاہر کر سکتا ہے۔

یہی حال تال اور سُر کا ہے۔ مغربی نالک میں بڑا اُتار چڑھاؤ کے لحاظ سے صرف ایک ہی قسم کی تال اختیار ہوتی ہے، جب کہ ہندوستانی میں مختلف سروں کے اعتبار سے کئی قسم کی تال اور لے ہوتی ہے، جس میں گویّے کو یکایک بہترین اُتار چڑھاؤ، لطافت و دلکشی پیدا کرنے کا اچھا موقع ملتا ہے۔ جس سے کہ تم ایک سُر یا راگ سے لطف اندوز ہوسکو وہ فوراً دوسرے پر پہونچ جاتا ہے اور اس طرح اس میں نہایت ہی لطیف دلکشی اور ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے۔ ایک انجان اور ناواقف شخص کے لیے سروں کا یہ اُتار چڑھاؤ، حرکت، لطافت اور تانوں میں یکی دلکشی لامعنی و فضول معلوم ہوتی ہے اور مشکل سے قابل سماعت تصور کی جاتی ہے۔ وہ محض نغمہ میں ایک ... والی بات ہے جو ایک دوسرے میں جذب ہوتی چلی جائے اور اس کو "فردوس گوش" بنا دے۔

(ترجمہ) اثر فتح پوری

ماخوذ از سالنامہ نیرنگ خیال جنوری ۱۹۳۹ء

انعامی سوال

"ایک آدمی ایک کتاب کی تین جلدیں خریدتا اور انھیں اپنی الماری میں رکھتا ہے ہر کتاب میں سرورق کے علاوہ تین سو صفحہ ہیں۔ ایک کیڑا پہلی جلد کے پہلے صفحہ سے لے کر تیسری جلد کے آخری صفحہ تک ایک سوراخ کر دیتا ہے۔ بتاؤ کیڑے نے کتنے صفحہ اور کتنے سرورق کاٹے"

اس سوال کا صحیح جواب دینے والے حضرات کی خدمت میں حضرت نسیم سندیلوی کے افسانوں کے مجموعہ "آغاز خیال" کی ایک کاپی جس کی قیمت آٹھ آنہ ہے مفت پیش کی جائے گی۔ اس سوال کا جواب صرف وہی حضرات دے سکتے ہیں جو "اضطراب" کے خریدار ہیں۔ جواب پر نمبر خریداری لکھنا ضروری ہے۔ ایک خریدار صرف ایک جواب بھیج سکتا ہے۔ محصول ڈاک کے لیے تین پیسہ کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں۔ تمام جوابات ۲۸۔ جولائی تک پہونچ جانے چاہییں۔ اس سوال کا جواب اگست کے پرچہ میں شائع ہوگا۔

منیجر ماہنامہ "اضطراب"
نمبر ۲ دین دیال روڈ۔ لکھنؤ

ساقی

(از حضرت مجذوب انسپکٹر آف اسکولس بنارس ڈویژن)

گھٹا اٹھی ہے تو بھی کھول زلف عنبریں ساقی
ترے ہوتے فلک سے کیوں ہو شرمندہ زمیں ساقی

مجھے ہر شے ہے ساقی جب ہے تو دلنشیں ساقی
شجر ساقی حجر ساقی فلک ساقی زمیں ساقی

تری محفل میں کیا انوار ہیں اے مہ جبیں ساقی
اتر آیا زمیں پر آج کیا عرش بریں ساقی

یہیں سے پاؤنگا ہر نعمت دنیا و دیں ساقی
کہیں کیوں جاؤں تیرے میکدے میں کیا نہیں ساقی

ترے رندوں پہ سارے کھل گئے اسرار دیں ساقی
ہو اعلم الیقیں عین الیقیں حق الیقیں ساقی

یہاں تو محتسب ہر وقت ہے اب دلنشیں ساقی
جہاں گردن جھکا کر بیٹھ جاؤں میں وہیں ساقی

زبردستی لگا دی آج بوتل منھ سے ساقی نے
میں کہتا ہی رہا ہاں ہاں نہیں ساقی نہیں ساقی

عجب ہے تیرے میخانے کا اے پیر مغاں عالم
کہیں ساغر کہیں میکش کہیں مینا کہیں ساقی

کہاں سے مجھکو پہونچا یا کہاں پیر مغاں تو نے
مرا میخانہ اب لاہوت ہے روح الامیں ساقی

نہ چھیڑ اے محتسب میں ہوں مے وحدت کا متوالا
میں وہ میخوار ہوں جسکے ہیں ختم المرسلیں ساقی

وہی باتیں تو مجذوب اپنی بڑ میں بھی سناتا ہے
ذرا سنبھلے ہوئے لفظوں میں جو تو نے کہیں ساقی

خودکشی

(نسیم سندیلوی)

یہ مانا کہ خودکشی حرام ہے۔ ملک کے قانون سے جرم۔

لیکن ۔۔۔؟

ایک انسان جو دن رات [illegible] اپنے قوت بازو پر بھروسہ کیے ہوئے رات دن کی مشقت سے فصل بوتا ہے [illegible]۔ لہلہاتی ہوئی کھیتی کی آبیاری کرتا ہے۔ [illegible] اپنا سکون فصل کی امید پر قربان کرتا ہے۔ لیکن اس پر بھی پیداوار اس کی اتنی مزدوری کے لیے ناکافی ہوتی ہے۔ اس کو لگان کی ادائگی کے لیے قرض لینا پڑتا ہے۔ دو چار جانور جو اس کی [illegible] مہاجن نے لگان [illegible]۔ قرض کی ڈگری حاصل کر لی ہے۔ ایک دو بچھڑی اور ایک [illegible] جس کی عمر اس بات کی متقاضی ہے [illegible] زندگی [illegible] تکالیف کی [illegible] ایسا ہی [illegible] ٹوٹنے لگا ہے ۔۔۔ چلتے ساحل کے دھندلے [illegible] خیال [illegible] ایک وقت کی [illegible]۔ [illegible] خواہشات [illegible]۔ مضطرب کو اور زیادہ بیتاب کرتے ہیں۔ [illegible] زمین نکال لیتا ہے۔ مہاجن نے جھونپڑی نیلام کرا دی [illegible]۔ تلاش معاش کی فکر میں اپنے بازوؤں کی طاقت پر بھروسہ کرتے ہوئے شہر کا رخ کرتا ہے مزدوری مل جاتی ہے [illegible] لیکن شہر میں اس کی طرح سیکڑوں آوارہ پھرتے ہیں جنھیں رات کو سونے کے لیے زمین تک نہیں ملتی۔ اللہ رے انسان کے لیے مرنے کے بعد قبر کے لیے تو دو گز زمین مل جاتی ہے لیکن زندگی میں اسے بیٹھنے کو [illegible]۔ بال بچے والے اسے غنڈہ سمجھ کر کام پر نہیں لگاتے۔ دوسرے تیسرے چار چھ پیسے مزدوری سے مل جاتے ہیں وہ اسی سے [illegible] پیٹ پال لیتا ہے۔ رات میں جاڑے کی شدت سے بچنے کے لیے سبزی منڈی کے سائبان میں آگ جلا کر تاپتا ہے [illegible]۔ پولیس کی نظریں اس پر پڑ چکی ہیں۔ قریب کی دوکان میں نقب لگتی ہے۔ بیچارہ جسے آج کئی دن سے کام نہیں ملا۔ جو محنت کا پیسہ کھاتا رہا تھا اس وقت پیٹ پر پتھر باندھے ایک کونے میں لاغر پڑا ہے۔ [illegible] دے کر ایک اس کے بازو ہی اس کے حامی تھے سو آج وہ بھی جواب دے گئے۔ وہ ہر چیز گوارا کر سکتا تھا لیکن خودداری پر حرف غلط۔ بیجا الزام۔ بدنامی اس کی برداشت سے باہر تھی۔ کیا وہ پولیس کے ہاتھوں ذلت کی بے گناہ موت مرے یا کنوئیں میں گر کر جان دے دے؟

اس کی آنکھوں میں ایک روشنی سی پیدا ہوتی ہے وہ لڑکھڑاتا اٹھتا ہے سہارا لیتے ہوئے کنوئیں کی جگت تک جاتا ہے۔۔

کنوئیں کا پانی کچھ دیر بے چین رہ کر پھر برابر ہو جاتا ہے۔۔۔ آواز کچھ دیر کے لیے گونج کر خاموش ہو جاتی ہے۔۔۔

کیا یہ خودکشی ہے؟ سڑک کے کنارے ایک اپاہج گرد و غبار میں اٹی بیٹھی ہے۔ اس کی نگاہیں ہر راہ گیر پر گڑ جاتی ہیں۔ وہ ان سے خدا کی راہ پر بھیک مانگتی ہے۔ وہ گڑگڑاتی ہے۔ اپنے دودھ پیتے بچے کا جسے وہ سینے سے چمٹائے ہے۔ واسطہ دیتی ہے

اضطراب

اس کے لاغر جسم میں صرف چند ہڈیاں اور کھال باقی رہ گئی ہیں چیتھڑوں سے زیادہ خاک راہ اس کی ستر پوشی کرتی ہے خوش پوشاک انسان اس سے نگاہ بچا کر نکلتے ہیں۔ سواری پر چلنے والے اس غریب کو ایک شہری لعنت تصور کرتے ہیں۔ کچھ راہ چلتے دور سے پیسہ اس کی طرف پھینک دیتے ہیں۔ بھکارن پیسہ اٹھا لیتی ہے اور ہزاروں دعائیں دیتی ہے۔ شام تک جو دو چار پیسے اُسے ملتے ہیں وہ کسی خونچہ والے کو دے کر اس سے وہ چیز لیتی ہے جو وزن میں سب سے زیادہ ہو۔ گرمیوں میں دھوپ کی شدت سے بچنے کے لیے وہ ایک درخت کی سوکھی ٹہنی زمین پر گاڑ لیتی ہے جس پر ایک پھٹا ہوا کپڑا سائبان کا کام دیتا ہے اور جس کا سایہ صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ وہ بچہ کو بچا سکے۔ اُسے اپنی فکر نہیں ہے۔ وہ اس بچے کے لیے یہ سب کرتی ہے۔ اس کی امید اس کی آشا صرف یہ بچہ ہے۔

بچہ بیمار پڑا۔ ماں اس قابل نہیں کہ اُسے اسپتال پہونچائے لاچار ہر شخص سے التجا کرتی ہے ان کے سامنے گڑگڑاتی ہے لیکن انسانیت میں اتنا رحم کہاں امیر امیر دن کے ہمدرد بنتے ہیں۔ غریب اپنی انفرادیت جدا کئے ہوئے ہیں اُن میں کوئی منظم جماعت نہیں جو آڑے وقتوں ان کے کام آئے۔ راہ چلتے سفید پوش ایک میلے کچیلے بچہ کو کس طرح چھو سکتے تھے؟۔

کچھ دنوں سے وہ خاموش ہے اس کی گود خالی ہے اُس نے پیسہ مانگنا بھی بند کر دیا ہے۔ وہ تمام دن خاموش پڑی رہتی ہے۔ وہ کوڑا جسے وہ پہلے ہاتھ سے اکثر ذرا پرے ہٹا دیتی تھی اب اس کے چہرے اور بدن سے بالکل قریب جمع ہو رہا ہے اگر کبھی کوئی اس کی طرف پیسہ پھینک بھی دیتا ہے تو وہ نہیں اٹھاتی۔ اس کی ایک امید تھی سو جاتی رہی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اسکا ننھا بچہ بڑا ہو کر ضعیفی میں اس کی لاٹھی پکڑے گا ...... سہارا ٹوٹ گیا اب اُسے کسی سوت مرتا ہے وہ جانتی ہے کہ ایک دن اس کی زبان بھی لکنت کرنے لگے گی تب وہ بھوکوں مرے گی پھر کیوں نہ وہ جلدی ہی اپنے ننھے بچے سے جا ملے۔ اُس نے اپنے آپ کو موت کے آغوش میں دیدیا...

وہ بھوکوں مرگئی۔

کیا اُس نے خودکشی کی؟

ایک نوجوان بیوہ جس نے کبھی اپنے سوامی کی شکل نہیں دیکھی جس کا سہاگ صرف ایک رات کا تھا۔ پہلے دن سہاگن تھی سب اسکو شگون نیک سمجھتے تھے۔ کنواری لڑکیاں اُسکے گرد گھیرا باندھے تھیں سب ہی اس کا گھونگھٹ اٹھا کر شکل دیکھنے کے لیے بیتاب تھیں دوسرے دن اس کی چوڑیاں ٹھنڈی کر دی گئیں۔ سرخ لباس اُتار دیا گیا سسرال والے اُسے ایک منٹ اپنی پناہ میں رکھنے کے روادار نہ رہے وہ الٹے پاؤں میکے واپس کر دی گئی۔ ماں باپ نے کچھ دنوں اُسے بوجھ سمجھ کر رکھا گھر کا تمام کام پیسنا پانی بھرنا۔ جھاڑو دینا اُس کے سپرد کر دیا گیا۔ اسی مکان میں وہ ضد کیا کرتی تھی اب اسی چھت کے نیچے نوکرانی کا کام کرتی ہے۔

جوان بیوہ ---- سماج ---- بدنامی ---

وہ پانی بھرنے جاتی محلہ والے اُسے کنکھیوں سے دیکھتے۔ راہ چلتے آوازے کستے۔ دو ایک بدنامی دامن کبھی گگری سے ٹکرا جاتے۔ لوگوں کی اس پر انگلیاں اُٹھنے لگیں۔ ماں باپ نے عزت بچانے کے لیے غریب کو دوسرا آشرم بھیج دیا۔

وہ کچھ دنوں آرام سے رہی تمام دن کام کرتی رات کو جو کچھ مل جاتا کھا کر کوٹھری میں پڑ رہتی۔ وہاں مذہب کے پیشواؤں کی نظر اس پر پڑی۔ سرِ بازار جو بیوہ کی امانت کا بیڑا اٹھاتے ہیں آشرم کی جان دیواروں میں انھیں بھی نظر آنے لگے شرم نہیں آتی بیچاری کو عصمت بچانے کے لالے پڑ گئے۔ انکار پر اُسے مشکل کام دیا جانے لگا اس پر سختی کی جانے لگی نت نئے مظالم ٹوٹتے اور وہ خاموش رہتی۔ اس نے ہم قفس سے فریاد چاہی وہ اس نادانی پر ہنس دیں۔ اُن کا اپنا یہ دھچکا ہو چکا تھا وہ ہر ایک کو ویسا ہی بنانا چاہتی تھیں۔

سورج ڈوب رہا تھا افق پر لالی پھیلی ہوئی تھی آشرم کے پچھلے حصہ میں ایک نوجوان عورت ساکت پڑی تھی سفید ساڑی خون سے لال رنگ گئی تھی شاید کہ آج پھر شب عروسی کا انتظار تھا۔

کیا یہ خودکشی تھی؟

دنیا!

(حضرت ماہر القادری حیدرآباد دکن)

مورکھ اور بٹ مار ہے دُنیا ‏ ‏ ‏ جھوٹوں کا دربار ہے دنیا

ہار کو دنیا جیت کہے ہے ‏ ‏ ‏ جواری کی سی ہار ہے دنیا

کون کسی کا غم کھاتا ہے ‏ ‏ ‏ کہنے کو غمخوار ہے دنیا

وقت پڑے تو کام نہ آئے ‏ ‏ ‏ لکڑی کی تلوار ہے دنیا

پیتل، سونا بن جاتی ہے ‏ ‏ ‏ دھوکے کا بیوپار ہے دنیا

امیدوں کی عمر ہی کتنی! ‏ ‏ ‏ دو دن کی پھلوار ہے دنیا

دل میں کپٹ اور میٹھی باتیں ‏ ‏ ‏ کتنی دنیا دار ہے دنیا

تو دنیا کو سمجھا کیا ہے!

بابا! کس کی یار ہے دنیا

ماں جایا

محترمہ شفیق بانو صاحبہ

نیم کے پیڑ میں جھولا پڑا ہے اور برسات کی ٹھنڈی ہوائیں روح میں تازگی پیدا کر رہی ہیں۔ محمودہ اور اُس کی سہیلی صغریٰ جھولا جھول رہی ہیں۔ دفعتاً محمودہ کو خیال آگیا کہ وہ میکے کی سرزمین میں نہیں بلکہ سسرال میں ہے۔ فوراً خیالات نے پلٹا کھایا نہ جانے کیا کیا باتیں یاد آنے لگیں۔ دل گھبرانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے اپنا خیال بڑے اُس بھائی کی طرف دوڑایا جس کو اُس نے بڑی محبت سے بچپن سے پالا تھا اور تو جیسا جیسا اُس نے ہی کا مرتا تک بھلا دیا تھا۔

"لیکن میرا چھوٹا بھیا تو مجھے کبھی نہ بھول سکے گا" اس خیال سے فوراً اُس نے گیت کا رخ بدل دیا۔ لہرا لہرا کر ساون کا یہ گیت گانے لگی۔

نیم کی نبولی پکی ساون بھی کبھی آوے گا
جیو سے میری ماں کا جایا ڈولی بھیج بلاوے گا

آنکھوں سے رنج اور خوشی کے ملے جلے آنسو گر پڑے۔ صغریٰ نے کہا "ائیں محمودہ تم بالکل پگلی ہو ہنستے ہنستے رو کیوں پڑیں؟"

"نہیں تو ——— کہاں؟ تمہیں تو خواہ مخواہ کا وہم ہو گیا ہے جب دیکھو تب یہی پوچھتی رہتی ہو۔ یوں ہی میری آنکھوں سے کبھی کبھی پانی آنے لگتا ہے۔ میری آنکھیں کچھ کمزور ہیں۔"

"محمودہ جھوٹ اور پھر مجھ سے ——— سچ بتاؤ ——— تمہیں میری قسم کیا بات ہے؟"

"تم تو سر ہو جاتی ہو۔ کوئی بات ہو تو بتاؤں۔ یوں ہی دل گھبرا رہا ہے۔ نہ جانے کیوں ——— بھابی اور بھیا یاد آ رہے ہیں۔ بھیا چھوٹا بھیا تو بہت ہی یاد آ رہا ہے۔"

"تو یہ کون سی بڑی بات ہے تم گھر دو ایک [illegible]"

"چھوٹے بھیا کو تو میں نے جا کر خط لکھا پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہی کہ جاتو ہیں سے اور وہاں جانے کی یہ بات ہے کہ میں خود سے بغیر بلائے نہیں جاتی جب سب جائیں گے تو جاؤں گی ایسے تو سسرال میں بات بگڑی ہو گی۔"

کچھ روز بعد محمودہ کے میکے سے بلاوا آیا اور وہ چلی گئی۔ بہت آؤ بھگت رہی میز پر سب نے مل کر کھانا کھایا۔ بیچ بیچ میں بھابی کہتی گئیں "چھوٹے بھیا دیکھنا یہ قورمہ کی پلیٹ محمودہ کے سامنے رکھو اور یہ حلوہ سکی پرچ بھی۔ اور ہاں بھول گئی یہ سیب کی مٹھائی بھی مدد ——— تو بہن محمودہ! یہ تمہارا گھر ہے تکلف کیا؟ چپل بھی کھاؤ ——— تھوڑا اور کھاؤ نا ——— غرض سب کھلاتے رہے اور محمودہ "بس بس" کرتی رہی۔

جتنے دن بھی محمودہ میکہ میں رہی سب جان چھڑکتے رہے۔ خاص کر چھوٹے بھیا تو ہر وقت بس گلے میں باہیں ڈالے "میری محمودہ میری بہن۔ میری پیاری اچھی" کہا ہی کرتے تھے۔ اس کے بعد محمودہ سسرال واپس گئی لیکن ہر مہینہ چھوٹے بھیا کو طرح طرح کی چیزیں پارسل کرتی رہی ——— ماں کا غم بھیا کے خیال نے دل سے مٹا دیا۔

ایک زمانہ تک محمودہ پھولوں کی طرح رہی۔ انقلاب نے کروٹ لی اور محمودہ کے سر کا "تاج" لٹ گیا یعنی بیوگی نے اپنا غمگین آنچل سر پر ڈالا۔ شوہر کے اچانک مرنے سے اس کے دماغ پر بہت برا اثر پڑا۔ سسرال والوں نے دنیا میں جو کرتے ہیں وہی کیا یعنی اس کے سایہ کو بھی منحوس سمجھنے لگے۔ اس کا وجود منحوس خیال کیا جانے لگا۔ اس کی اگلی پچھلی باتوں کا ذرا ذرا سی غلطیوں کا بدلہ اس سے لینے لگے۔ ایسے موقع پر محمودہ کو پھر چھوٹے بھیا کی یاد آئی اور میکہ پہونچی۔ چھوٹے بھیا کی شادی ہو چکی تھی گود میں ہنستا کھیلتا ایک بچہ

بھی تھا۔ سارا گھر محمودہ کے ناخواندہ مہمان بن کر آنے سے کچھ عجیب سا ہوگیا۔ محمودہ تو یہ دیکھ کر چھوٹے بھیا کے گھر چلی گئی۔ یہ بھی کچھ عجیب سے ہوگئے۔ روئے تو سب لیکن یہی کہہ کر "ہائے اب کیا ہوگا ـــــ کیسے زندگی گزرے گی ـ کیونکر گزارہ ہوگا" لیکن کسی نے نہیں کہا کہ محمودہ کا دل کس طرح ہاتھوں میں رکھنا چاہیے۔ ایک تو صدمہ اوپر سے یہ سلوک۔ محمودہ کا دل مایوس ہوگیا اور وہ شام کو نڈھال ہوکر پڑ گئی۔ اس کا چہرہ زرد ہوگیا ـــــ چھوٹے بھیا کی ساس بھی بھیا ہی کے پاس رہتی تھیں اور بیٹی کا گھر گویا اُن کا ٹھکانہ تھا انھیں محمودہ کا ہمیشہ کے لیے یہاں آ جانا بہت کھلا۔ اول پہلے دن تو چپ رہیں پھر کچھ کہنے سننے کا موقع تلاش کرتی رہیں۔ ایک دن بیٹی سے الگ داماد سے باتیں کرتی ہوئی بولیں "دیکھو بیٹا ایک بات کہوں، تمھاری بہن کی حالت اچھی نہیں۔ خود بخود بیٹھے بیٹھے بڑبڑایا کرتی ہیں اگر نہیں کھاتیں تو سارا سارا دن نہیں کھاتیں اور جب کھانے بیٹھ جاتی ہیں تو پھر کھاتی ہی چلی جاتی ہیں۔ بچے والا گھر ہے تم کسی حکیم ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ تو دیوانوں کا سا عالم ہے اللہ نہ کرے زیادہ ہوگیا تو سارے گھر کا ناک میں دم ہو جائے گا تم تو جانتے ہی ہو تم سے کی عادت کو۔ کتنی ذہین ہے۔ تمھارے خوف سے ماں سے بھول تک نہیں کرتی لیکن میری گود میں رہ گئی ہے دن بدن پیلی ہوتی جارہی ہے۔ مجھے تو یہ غم کھائے جا رہا ہے۔ پھول سا بچہ دودھ بڑھا کر۔ ہائے وہ تو شکر ہے گیا فکر کے مارے۔ تمھیں اللہ بچائے کہ ساتھ رہنا سہنا ایک گھر میں تو بہتر نہیں ہوسکتا ـــــ بس آگے کیا ہوگا " یہ کہہ کر چھوٹے بھیا تو بس ختم ہوگئے۔ بیوی کی مظلومیت۔ بچے کی ممتا کا جوش پھر لینے لگا۔ ساس کی بات دل میں پھانس بن کر رہ گئی اور ایسے قائل ہوئے کہ بولے "ہاں بی جان میری تو خود فکر کے مارے جان جسم میں پڑی رہتی ہے اور سوچتا رہتا ہوں کہ کیا کروں؟ دیکھیے میرے ساتھ سب نے دھوکا کیا مجھ بھی تو سب بھی مزے میں رہیں چھوٹوں کو بیاں سے چھوٹتے ہی صاف انکار کردیا کہ یہ گھر ہے سرائے نہیں ہمیں اپنا ہی گزارہ کرنا مشکل ہے۔ بڑے بھیا نے بھی اول دن سے برتن الگ کر دیئے تھے اور ساتھ کھانے پینے کو منع کردیا۔ بیوی اور بچوں سے بھی منع کردیا۔ ایک میں ہی فالتو تھا نظر آیا جو میری جان کو کبھی ختم نہ ہونے والی مصیبت لگادی۔ دنیا میں خود غرضی کا دور دورہ ہے سوائے مطلب کے کوئی بات نہیں کرتا میری تنخواہ بھی تو ایک سو بیس ہی روپیہ ہے"

دادی تو بھڑکا کر ساس ویسے چپکا چپکا کر نشی کی طرح اس میں ہاں ملاتی۔ بی اور بیوی بھی دل ہی دل میں خوش ہوتی رہی
اور سوا پیسہ کی نیاز، دبا دبا دل میں بولی۔

شام کا وقت تھا چھوٹے بھیا دفتر سے آئے بچے کے لیے پھل اور مٹھائی لائے تھے لاکر پلنگ پر ڈال دیے۔ محمودہ کے فرشتوں کو بھی ان کا خیال نہ تھا وہ بیچاری تو دن بھر بچے کے کپڑے دھونے میں لگی رہتی یا گھر کی جھاڑو دینے میں۔ برتن دھونے میں۔ اور دوپہر کو کپڑے سینے میں جو کام یہاں بیٹیاں دے دیتیں۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر یہ پھل اٹھا پلیٹ میں رکھ دیے بس ان میں پھوٹ لگ گئی یا سانپ سونگھ گیا۔ ساس نے بیٹی اور بچہ کو نہ کھانے دیے اور داماد سے بھی منع کر دیا چکنی چپڑی باتیں بنا کر۔ محمودہ کے زخمی دل پر اس طرز عمل کا بڑا گہرا اثر پڑا اور وہ ایک کونے میں جا کر رونے لگی۔ سسکیوں اور آہوں کی آواز نے چھوٹے بھیا کو متوجہ کیا اور وہ چراغ پا ہوکر پہونچ گئے۔ بھرنے ہوئے تو تھے ہی ایک ہی سانس میں ہزاروں باتیں سنا ڈالیں۔

"دیکھو بی! تم اگر میری بہن نہ ہوتیں تو تمھاری اس مکاری پر سڑک پر کھڑا کر دیتا آخر بات ہی کیا ہوئی! صبح رونا۔ شام رونا۔ رات کو رونا جب دیکھو نحوست پھیلانا۔ میں یہ بالکل پسند نہیں کرتا۔ میری زندگی تو مصیبت بن گئی دن بھر دفتر میں مروں اور شام کو تمھاری شکل دیکھ کر خون کھولے۔ آخر کیا میں ہی رہ گیا ہوں اور بھی تو بھائی ہیں۔ دشمن تو نہیں۔ ان پر بھی تو تمھارا رکھنا اور خرچ اٹھانا فرض ہے۔ میں ہی اکیلا کہاں تک جان کھپاؤں۔ ٹھیک سے آدمی بن کر رہنا ہے تو رہو نہیں تو چلتی پھرتی نظر آؤ۔ میں تو تمھارے اس مذاق سے عاجز آگیا"

محمودہ چھوٹے بھیا کے منہ سے ایسی باتیں سن کر سکتہ میں آگئی۔ روتے ہوئے بولی۔

"بھیا تم بھی مجھ بدنصیب کو دھتکارنے لگے یہ باتیں اور تم؟ آخر میرا قصور کیا؟ میں تو تم سے کچھ بھی شکایت نہیں کرتی نہ کچھ کہتی ہوں"

"کھو گئی گیا؟ سارا گھر تو تمہاری خدمت میں لگا رہتا ہے اوپر سے تمہارے نخرے —— خیر میں زیادہ بات بڑھانا نہیں چاہتا دنیا میں بہت سی عورتیں بیوہ ہوتی ہیں تمہاری طرح پاگل پن نہیں دکھلاتیں۔"

"بھیا میرے دل کا دکھ تو سمجھو۔ تم نے بھی ہمدردی چھوڑ دی تو کیا ہوگا۔ میں نے تو تمہیں اولاد کی طرح بچپن سے رکھا اور سمجھا۔ جو بھی خدمت بن پڑی کرتی رہی۔ آج میرے اوپر وقت پڑا تو تم منہ پھیرنے لگے۔ بھاوج بھی اُلٹی سیدھی ہر وقت سناتی ہیں اور تمہاری ساس بھی۔ ظاہر ہے کہ میں بہن ہوں میرا بھی کچھ حق ہے۔"

"بس برائی کرنی شروع کر دی۔ میری بیوی جیسی ہے میں خوب جانتا ہوں وہ تمہیں آدھی بات بھی نہیں کہتی اس قدر مسکین ہے اور کم سخن کہ میں حیران ہوں۔ بچہ کو رُلا کر سارا کام کرتی رہتی ہے۔ رہ گئی ساس تو وہ بھی میری ماں سے بڑھ کر شفیق ہیں اُن سے بڑھ کر دنیا میں کوئی ہمدردی کر ہی نہیں سکتا۔ چاند پر خاک ڈالنے سے نہیں پڑتی میں اپنی بیوی اور ساس کی برائی نہیں سن سکتا۔"

محمودہ روتی رہی اور ایسی دردناک آہوں کے ساتھ کہ کلیجہ منہ کو آتا لیکن بھیا کا دل ٹس سے مس نہ ہوا۔ غصہ سے آگے بڑھے اور ہاتھ پکڑ کر کہا "اس کان سنو چاہے اُس کان یہ مکاری میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میرے گھر سے اپنا بوریا بستر لے جاؤ اور دوسرے بھائیوں کا بھی کچھ دن مزہ چکھو وہ لوگ شاید تمہیں پھولوں کی طرح رکھیں۔"

یہ جملہ طنز سے کہا اور روتی ہوئی محمودہ کو گھسیٹتے ہوئے دروازہ تک لا کر چھوڑ دیا اور دھکا دے کر دروازہ بند کر لیا۔ ساس اور بیوی یہ منظر دیکھتی رہیں اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتی رہیں کہ چلو جھگڑا ختم ہوا یا اُبھر آنے کا غرچہ کم ہو گیا۔ ساس کٹنی کی طرح اُٹھی اور کہا۔

"اے بیٹا ایسا غصہ نہیں کرتے تم تو مختار ہو اور سمجھدار یوں تمہیں کرنا لازم نہیں تھا۔ باہر سب سے جا کر وہ میرا اور بچی کا بھی نام بدنام کرے گی اپنے کرتوت کچھ نہ بتائے گی۔"

"چھوٹے بھیا بات ٹالنے کی غرض سے بولے "اونھ اجی آپ رہنے دیجیے میں اپنے معاملات کو خوب سمجھتا ہوں۔ اپنی اچھی خاصی زندگی کو آخر کیوں محمودہ کو رکھ کر عذاب بنا لوں۔ مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ باز آیا ایسی ہمدردی سے۔"

رات کے دس گیارہ کا عمل۔ بیکس مصیبت زدہ محمودہ آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی ہر قدم پر ٹھوکر کھا کر گرتی تھی اور کہتی تھی۔

"اے بھیا تم نے بھی مجھے مکار سمجھا۔ مجھے نہ سمجھا۔ بدنصیب نہ جانا۔ اُسے وہ دن یاد آئے جب جھولے پر بھی انہیں کمبخت بھائیوں کی یاد دل کو مسوستی تھی۔ ساون کا گیت بھیا کی یاد میں گاتی تھی۔

"جیوے میری ماں کا جایا ڈولی بھیج بلاوے گا"

آج رکھنے اور بلانے کے بدلے گھر سے نکالا تھا۔ محمودہ کو یہ بات بھی یاد آئی کہ اپنے اچھے حال میں شوہر سے چھپا چھپا کر کتنی بار چھوٹے بھیا کے اچھے اچھے کپڑے بنائے ———— بچے کو سی کر بھیجے اور جب ضرورت پڑی دو تین سو روپیہ چپکے سے دے دیا۔ آج اس کا یہ بدلا تھا۔ انہیں خیالات میں آنسو بہاتی چلی جا رہی تھی۔ رات کا وقت تھا۔ راستہ سے ناواقف۔ کبھی کبھی بجلی چمک کر راستہ بتا دیتی تھی۔ آج بھی برسات کا سماں تھا لیکن نہ وہ جھولا تھا نہ وہ جذبات تھے!! آنکھوں سے آج بھی آنسو نکل رہے تھے۔ لیکن اُن سے اس کی جھلک غائب ہو چکی تھی یاس کا رنگ غالب آ چکا تھا یکدفعتاً اُسے عہد گذشتہ کی وہ گھڑی یاد آئی اور وہ گنگنانے لگی۔

"جیوے میری ماں کا جایا ڈولی بھیج بلاوے گا"

لیکن آج اس گانے سے دل پر برچھی سی لگی۔ ایک دفعہ کسی پتھر سے ٹھوکر کھا کر گری اور گر کر جسم لہولہان ہو گیا۔ سر سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا۔ آنکھیں غشی اور موت کی کشمکش سلجھا رہی تھیں!!

زبان لڑکھڑا چکی تھی لیکن درد بھرے الفاظ فضا میں تاریک برسات کی رات میں گونج رہے تھے۔

"جیوے میری ماں کا جایا ڈولی بھیج بلاوے گا"

"ایک خط کا جواب"

جناب مسعود اختر۔ جمالؔ صاحب

سمجھتی ہو کیا تم؟ نہ یاد آؤں گا میں — تمہارا ہی احساس بن جاؤں گا میں
کبھی جب تمہیں مضطرب پاؤں گا میں — سکوں بن کے دل میں اُتر آؤں گا میں
ابھی تک محبت فسانہ ہے لیکن، — اسے اک حقیقت بنا جاؤں گا میں
یہ ممکن ہے مجھکو زمانہ بھلا دے — مگر تم کو ہر لحظہ یاد آؤں گا میں
سنو گی تم اکثر مرے دل کی دھڑکن — فضاؤں میں یوں جذب ہو جاؤں گا میں
سکون بخش۔ یہ کیف راتوں میں اکثر — تمہیں یاد آؤں گا۔ تڑپاؤں گا میں
تمہارے تخیل میں رہ کر ہمیشہ — جہاں جاؤ گی تم۔ وہاں جاؤں گا میں
کبھی مجھ سے رنگیں تبسم کی دنیا — کبھی آنسوؤں میں نظر آؤں گا میں
کبھی گیت غم کے سناؤں گا تم کو — خوشی کے ترانے کبھی گاؤں گا میں
کبھی چاندنی بن کے آؤں گا دل میں — کبھی موج بنکر گزر جاؤں گا میں
کبھی رنگ و بو کی حسیں وادیوں میں — تمہیں حسن بن کر نظر آؤں گا میں
جو گھبراؤ گی تم ہجوم طرب میں — تصور میں یاد آکے بہلاؤں گا میں
ہواؤں کی خاموش سرگوشیوں میں — تمہیں رازِ دل آکے سمجھاؤں گا میں

اضطراب

نگاہوں میں چھا جائے گا کیف رنگیں
وہ مے آبشاروں سے چھلکاؤں گا میں

ڈبونے سے میرے کمی کچھ نہ ہو گی
محبت کی دنیا بسا جاؤں گا میں

چراغِ نفس بجھ رہا ہے تو کیا غم
جمالِ نظر بن کے چھا جاؤں گا میں

اب ایڈریٹ کیجیے

حجاب

محترمہ حجاب امتیاز علی کی زیرادارت شائع ہونے والا مصور ماہنامہ جون کے آخری ہفتہ میں ہندوستان کے بلند پایہ اہلِ قلم حضرات کے مضامین کو اپنے دامن میں لیے ہوئے آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔

سالانہ چندہ صرف ۵ روپیہ پرچہ شائع ہونے کے فوراً بعد نمونہ کے لیے ۲ کے ٹکٹ ارسال کیجیے۔

المشتہر

مینیجر ماہنامہ "حجاب" گلشن محل۔ لیڈی جمشید جی روڈ ماہم بمبئی نمبر ۱۶

تندرستی بڑی نعمت ہے
تندرستی ہی ترقی ہے
تندرستی کے لیے ورزش ضروری ہے
کھیل ایک اچھی ورزش ہے
سب تندرست رہ سکتے ہیں

ہر قسم کا کھیل کا سامان سستا اور عمدہ

ایم۔ اے اسپورٹس

امین آباد پارک لکھنؤ

سے خریدیے

ادب لطیف :-

بھول

تنویر فاطمہ

تم سے بھول ہوئی ——— میں جانتی ہوں
——— زندگی بھی تو ایک بھول ہے ——— دنیا ——— محبت ——— وعدہ ——— وفا ——— اور نہ جانے کیا کیا ———
یہ سب بھول ہی ہیں نا ——— ؟

دنیا میں انسان خدا کی بھول ہے ——— دل میں محبت انسان کی بھول ——— تم جو چاہو کہہ لو ——— لیکن میں تو اسے بھول ہی کہوں گی ——— تم نے محبت کی ——— جب تم پہ بھی تھے ——— تمہارے تصورات پر پریم کا آنچل تھا ——— اس وقت ——— اس وقت تو تم اسے حقیقت جان رہے تھے ——— محبت کے سہانے سپنے تھے۔ تم نے بارہا محبت کے ابدی ہونے کا اقرار کیا تھا۔ تم سے بھی محبت کا اصرار ہوتا تھا۔

اور آج ———

آج جب میں محبت کی صرف حامی ہی نہیں بلکہ پجارن ہوں ——— جب مجھے محبت کی تلاش ہے۔ جب تم نے کھلے ہوئے پھولوں کو روند کر پھینک دیا ——— آج جب مجھے تمہارے بغیر یہ دنیا ——— ساری دنیا سونی معلوم ہوتی ہے ——— میں جانتی ہوں کہ تمہارے بغیر میرا رہنا دشوار ہے ——— میں تم بن اکیلی ہوں ———

تب ———

تب تم کہہ رہے ہو کہ تم سے بھول ہوئی ———

محبت بھول ہے ——— آج تم اسے بھول سمجھ رہے ہو ——— سہانے سپنے سے تعبیر کرتے ہو۔ کل میں اسے بھول سمجھی تھی
کیا محبت سچ مچ بھول ہے ——— ؟

ہاں

شفیق بانو

تمہیں تعجب ہے ——— کیوں؟ ——— انسان ہوں پتھر تو نہیں ——— پیاسے کو اگر پانی پیاس کے بعد ملے تو بیکار ہی ہوگا نا ——— ؟

ناکامی ——— صبر اور ضبط حد سے گذر جائے ——— زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو ——— نہ دن کا ——— نہ رات کا ——— دل میں احساس ہی احساس باقی رہ گیا ہو تو آخر پھر خاموش کیسے رہوں۔

دیوانہ نے پتھر مارا ——— سب نے کہہ دیا۔ دیوانہ ہے ——— یہ نہ سوچا۔ دیوانہ نے کیوں ایسا کیا ——— ؟ وہ بکتا رہا۔ کسی نے نہ سنا ——— کسی نے نہ سمجھا ———
اُسے دیوانہ بنایا کس نے ——— ؟ یہ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ——— اس کے دل۔ دماغ کی بربادی کا اثر لینے والا کوئی نہیں ——— ہنستے سب ہیں۔

میں جب چیختی پکارتی ہوں تو مجھے بھی تم پاگل سمجھتی ہو ——— میرے زخموں کو نہیں دیکھیں کہ کتنے گہرے ہو چکے ——— !!

ہاں ——— تو تم مجھے دیوانہ سمجھتی ہو ——— دیوانہ کو کس نے سمجھا ہے ——— ؟

لیکن میں ———

میں دنیا کو سمجھ کر ہی دیوانی ہوئی ہوں ——— اور آج میرا سمجھنے والا کوئی نہیں ——— !!!

آغاز خیال کا مطالعہ کیجیے! مختصر افسانہ — مصنفہ نسیم سندیلوی

ادب کثیف۔

از حاجی لق لق

آؤ — پریتم آؤ!
بجلی کی ٹھنڈی، روشنی۔
پنکھے کی سوہوا۔
نلکے کا صاف و شفاف پانی۔
گملوں کے خوش رنگ پھول۔
دیواروں پر سبز پلستر۔
ہر طرف سبزہ ہی سبزہ۔
ایسے میں بھی نہ آؤ — تو لعنت ہے۔

آؤ — پریتم آؤ!
جنگ یورپ کی باتیں۔
میں تمھیں پریم چند کا افسانہ سناؤں۔
اور تم کیرم کھیلو۔
رازِ محبت۔
سازِ ہارمونیم۔
دنیا سے دور — نشاط انگیز ہیں۔
آتے ہو یا میں گنڈیریاں چوس لوں۔

آؤ — پریتم آؤ!
ریڈیو کی نغمہ آفریں فضا آفریاں۔
ملٹن کی بھینی بھینی خوشبو۔
خوابوں کی دنیا۔
برمائے سگار۔
نیا فرنیچر۔
سول اینڈ ملٹری گزٹ۔
ایسے میں بھی نہ آؤ — تو جہنم میں جاؤ۔

آؤ — پریتم آؤ۔
ٹیر گیس سنے کے آؤ۔
تاکہ میں آنسو بہاؤں۔
اور تم میرا فوٹو کھینچ لو۔
تمھارا انتظار اخبار سے بھی زیادہ ہے۔
تمھاری طلب سگرٹ سے بھی بڑھ کر ہے۔
اس لیے اب آ ہی جاؤ۔

"چہلم فسواں"

دوسری شادی

کتنا آپ کی سخت غلطی ہے کیونکہ آپ کی شریک حیات تندرست ہوسکتی ہیں اور وہ بھی صرف دو روپیہ سات آنہ (۲/۷) میں۔ آپ نہیں جانتے کہ انھیں ایک مہلک بیماری ہے جس کی وجہ سے وہ قبل از وقت بوڑھی ہوتی جارہی ہیں۔ سال کے سر کا درد، پنڈلیوں کی دکھن، بے رحمی نیندی، اختلاج قلب اور ضعف معدہ بتا رہا ہے کہ وہ بیمار ہیں لیکن دوا پیسے سے کہتے ہوئے شرماتی ہے۔ انھیں شانتی کے استعمال کی ضرورت ہے۔ شانتی کا چند روزہ استعمال انھیں از سر نو جوان بنا سکتا ہے۔ شانتی وہ دوا ہے جو خاص ہندوستانی جڑی بوٹیوں سے تیار کی جاتی ہے۔ اس کی سچائی کا دنیا میں شہرہ ہے۔ اس نے ہزاروں زندگیوں کو موت کے منہ سے بچالیا ہے۔ قیمت دو روپیہ محصول ڈاک علاوہ کل دو روپیہ سات آنہ۔

ملنے کا پتہ:- منیجر آرام گھر دریا گنج - دہلی -

مرتب خاں اضطر کیفی

بے خبر

جناب طارق صاحب

(۱)

ان کا بچپن [illegible] گاؤں [illegible] کے لیے شہر سے دور گاؤں کے لوگوں کی کسی بستی میں رہنا کیا کم عجیب وہ جو کہ مکان
بوسیدہ اور [illegible] کے رستے [illegible] اور ان جہالت کی یادگار [illegible] کا نمونہ ۔ جہاں نہ ہوا کا گزر نہ روشنی صفائی کا اہتمام۔
شاید [illegible] سے [illegible] آہوگ یہ وسیع اور شاداب باغ اور چکور کے لیے دلکش دوست دنیا کتنی پریشان کن
ہوسکتی [illegible] ہی [illegible] کی آبادی ۔ چنانچہ [illegible] آئی سی ایس کا دماغی توازن صحیح نہ رہا۔
جب [illegible] اور [illegible] کے اندر [illegible] جھونپڑوں کے درمیان ایک سنگلاخ کوٹھی مع پائیں باغ تیار نہ ہوگئی۔

[illegible] صاحب [illegible] کے بعد مجبور تھے [illegible] مقدس سرزمین کو آباد کریں جس کو ان کی "زادبوم" ہونے کا فخر حاصل تھا۔ نہ
صرف یہ بلکہ جہاں کے وہ [illegible] اتا اور راجہ تھے ۔ ایسے ان داتا جنہوں نے کبھی [illegible] کو جیتے دنیا تو کیا اپنے "خدا خانہ" میں داخل ہونے کی
اجازت بھی نہ دی تھی۔ ایسے راجہ جنہوں نے کبھی [illegible] فریادی کی فریاد [illegible] فریاد پر پابندیاں عائد کر دی تھیں۔

بہر حال ان داتا آئے اور بڑی شان و شکوہ سے ساتھ آئے موٹر گھوڑوں ۔ خیموں ۔ ڈیروں ۔ بندوقوں اور چپراسیوں
کے ساتھ ۔ غرور سے سر اونچا کئے ہوئے ۔ حقارت سے پھوس پتاور کے جھونپڑوں کو دیکھتے ہوئے نفرت سے ہر سلام کرنے والے کی طرف
سے منہ پھیرتے ہوئے۔

مگر اپنا مکان دیکھ کر تو ان جذبات میں ناقابل برداشت اضافہ ہوگیا ۔ بے چینی بڑھ گئی اور اتنی کہ حواس باختہ ہوگئے غیظ و
غضب غالب ہوگیا ۔ وہ غصہ کے اندر اندر شاید ہی کوئی ملازم بچا ہو جس پر گالیاں نہ پڑی ہوں اور کوئی گھر والا ایسا ہو جو معمولی
ڈانٹ ڈپٹ سے بچ گیا ہو۔

گاؤں کا معاملہ تھا ورنہ شاید ایک منٹ بھی وہ اس مکان میں نہ ٹھہرتے ۔ کوئی کوٹھی کرائے پر لے لیتے یا عالیشان
عمارت ۔ مجبوراً سامان کوٹھڑیوں میں بھر دیا گیا ۔ اور بڑے ہال میں تکیہ لگا کر راجہ جی بیٹھ گئے ۔ پجاری آتے تھے اور دور ہی سے اپنے
خدا کی زیارت کر جاتے تھے کیونکہ اتنی مجال کب تھی کہ دہلیز چھوتے۔

اسی طرح آٹھ دن گذر گئے ۔ اب ان داتا کو تعمیر کی ضرورت نے ضرورت سے زیادہ بے چین کر دیا ۔ راج معمار ۔ مزدور اپنی
خدائی میں تھے لیکن ایک عالیشان کوٹھی کے لئے وسیع زمین کا مسئلہ سب سے زیادہ پریشان کن تھا ۔ گاؤں کے بیچ میں مکان اور مکان
کے چاروں طرف گھنی آبادی زمین بڑھائی جائے تو کدھر اور کیونکر ؟ یہی فکر تھی جس میں گاؤں کا مالک ڈوبا رہتا تھا ۔ ایک دن
سوچتے سوچتے وہ چونک پڑے بہت آسان ترکیب ان کے ذہن میں آگئی تھی۔

کیوں نہ پڑوسی کسانوں کے مکان خالی کرا لئے جائیں ۔ اور اس طرح شاندار کوٹھی کے لئے پائیں باغ کا انتظام بھی ہو جائے
لیکن ! یہاں وہ کچھ جھجکے کیونکہ جیسوں ایسے مقدموں کا فیصلہ خود انہوں نے کاشتکاروں کے حق میں کیا تھا جنمیں زمیندار کاشتکار
کی آراضی پر زبردستی قابض ہونا چاہتے تھے ۔ پھر ۔ وہ پھر سوچنے لگے "کیوں نہ اپنے اثر سے کام لیا جائے" ، اب چھتری خون
رگوں میں جوش مارنے لگا ۔ تالاب کنارے کی زمین کیا بری ہے کسان اپنے گھر وہاں بنا لیں ۔ ۔ ۔ بلکہ گھر کیا تھا ۔ ۔ ۔ میں تکلیف

الماکی۔ ان جانوروں کی خاطر... بذات چار چوہڑے اور پاسی...... اں پہلے سیدھی طرح کہا جائے اور نہ مانیں تو؟...... تو.... طاقت سے منوائے جائیں...... بالکل ٹھیک" اور انہیں نیند کے جھونکے آنے لگے۔ تکیہ سرہانے رکھا اور سو گئے اس طرح کہ شیطان اطمینان کی شکل میں انکے پیر دبا رہا تھا۔

---

(۲)

"ہاں تو بات یہ ہے کہ ہمیں اپنی کوٹھی بنوانا ہے اور یہاں زمین ہے کم تو تم لوگ سب آس پاس والے اپنی اپنی بکھری ہمیں دیدو" ٹھاکر صاحب نے حاکمانہ انداز میں ہمیں پر زور دیتے ہوئے کہا اور جواب کا انتظار کرنے لگے

مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ وہ جو اپنے مالک کے بلانے پر بڑی خوشی خوشی درشن کرنے اور پاؤں چھونے آئے تھے سب ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے جیسے پوچھتے تھے" دیکھا خوشی کا انجام؟"

"ہاں کیا کہتے ہو" ٹھاکر صاحب نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پھر کہا "سوچ وچار کا ہے کا" گویا یہ ایک بالکل معمولی مطالبہ تھا۔ اور تھا بھی انکے نزدیک ایسا ہی۔ ان کی بڑی بڑی خوفناک آنکھیں صاف کہہ رہی تھیں "دو یا نہ دو گھر ہو گا ہی" بوڑھے جینگر نے ایک دفعہ مڑ کر مجمع پر نگاہ ڈالی یہ دیکھنے کے لئے کہ کون جواب دیتا ہے۔ مگر سب خاموش تھے اور کسی جواب دینے والے کے منتظر۔ ایک نوجوان نے جینگر کی دھوتی کھینچتے ہوئے کہا "چاچا جو تم کہو"

اس نے پھر مشورہ کے طور پر ایک نگاہ ڈالی سب آنکھوں آنکھوں میں یہی فقرہ دہرا رہے تھے۔

"دو یا نہ دو گھر ہو گا ہی"

تاہم جینگر اتنی جلد ایسی ناقابل برداشت قربانی کی تائید میں نہ تھا۔ اس نے چپکے سے قریب والے کے کان میں کہا "پھر سوچ لو"

اور پھر سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ کسی نے مدھم آواز میں کہا "دو یا نہ دو گھر ہو گا ہی" اور کھلی ہوئی آنکھوں نے خاص قسم کی حرکت سے اسکی تائید کی۔

لیکن اس فقرے پر بھن سے نہ رہا گیا جو ایک قومی جماعت کا ممبر اور رضا کار تھا۔ اس نے اکثر نیتاؤں کو یہ کہتے سنا تھا کہ ایکا کٹھن سے کٹھن بپتا کا سامنا کر سکتا ہے۔ اپنے چپکے سے کہا "ہم سب ایکا کر لیں" کیونکہ یہ بھی کوئی معمولی ظلم نہ تھا۔ "چپ" نہیں تو پچھتاؤ گے" کچھ بوڑھوں نے اشاروں اشاروں میں اسکو سمجھایا مگر ساتھ ہی بعض نظریں اسے حمایت کرتی ہوئی معلوم ہوئیں اور وہ اور جری ہو گیا۔

"کاہے کو چپ رہوں" اس نے قدرے بلند آواز میں کہا "ہم ایسے ہی سکتے ہیں"

"ابے چپ رہ یار" فتوے نے اسکا ہاتھ دباتے ہوئے کہا "کاہے کو چاند منڈوائے گا"...

لیکن ابھی اس کا فقرہ پورا نہ ہوا تھا کہ زمیندار کی ہونکتی ہوئی آواز سے سب چونک پڑے کیونکہ اس نے بھن کا آخری فقرہ سن لیا تھا "کیا کر سکتے ہو" اسنے طنز آمیز لہجہ میں کہا اور ایک بھیانک قہقہہ لگایا "سیدھی طرح دیدو تو اوہ گاؤں خالی کر کے دو تو زمین دینا ضرور پڑے گی...... ہم اپنی زمین ہوتے کسی کے بنے تھوڑا ہی جائینگے"

"مگر مالک پھر ہم لوگ کہاں جائیں" جینگر نے درد بھری آواز میں کہا۔

"پرلوک" بھن نے جلکر طعن کے طور پر ذرا اونچی آواز میں فقرہ کسا۔ کیونکہ ایکا جیسی نعمت سے ان لوگوں نے انکار کر دیا تھا۔

ٹھاکر صاحب ایسے جملوں کے عادی کہاں تک چپ رہتے "بھڑک اٹھے" تیری یہ مجال چمار کی"...... اور انہوں نے گالیوں کا ایک انبار لگا دیا۔

سُبھن نے اکثر سنا تھا کہ گالیاں دینا جرم ہے۔ اور قانون گالی دینے والے کو سخت سزا دیتا ہے۔ اُسکے پاس اسکی ایک نظیر بھی موجود تھی۔ قریب ہی کے موضع کے زمیندار نے جب اسکے ان داتا کے ضلعدار کو برا بھلا کہا تھا تو تین مہینہ کے لئے سرکاری مکان جانا پڑا تھا۔ بلکہ اس مقدمہ میں خود اسکے باپ نے بھی شہادت دی تھی۔ اُس نے سوچا۔ ٹھاکر صاحب کے مقابلہ میں قانون میری طرف ہے اور گواہیاں موجود۔۔۔۔ میں کاہے کو دبوں۔" اور اس خیال نے اسکی ہمت بڑھائی۔ "بس ٹھاکر جی ! اب گالی نہ ۔۔"

ایک ادنیٰ کسان کی طاقت تھی جو ان داتا کی برق غضب کو گرنے سے روکتی۔ کیا دیکھ رہا ہے ۔ نے تو اسکی خبر" انہوں نے غصہ سے کانپتے ہوئے سپاہی کو حکم دیا۔

سُبھن لیٹے لیٹا دل پر بھولا ہوا تھا دبتا تو کیوں اور ڈرتا تو کس لئے "کون مائی کا لال مارتا ہے دیکھیں تو منہ" یہ کہتا ہوا وہ مقابلہ کے لئے اٹھنے کو تھا کہ پیٹھ پر ایک لاٹھی پڑی۔

اُس نے پھر سر اٹھانا چاہا کہ دوسری شانہ پر پڑی۔ پھر متواتر تیسری۔ چوتھی اور پانچویں یہانتک کہ خون فوارہ کی طرح سر سے اچھلنے لگا۔ اور وہ بیہوش ہو گیا۔

بھیکو سے ضبط نہ ہو سکا جلدی سے اندھیر نگری کے راجہ کے پیر پکڑ لئے "اب جانے دو سرکار مرجائیگا بچارہ (مضبطہائی کرو (معافی)۔۔۔۔ ہم سب تمہاری اچھا کرنے پر تیار رہیں"

"اچھا پھر جاؤ" سرکار نے رحم کھاتے ہوئے فرمایا" ڈال آؤ اسے باہر" جلادی حکم صادر ہوا۔ اور آزاد خیال کسان کی زندہ لاش توڑا باہر پھینکدی گئی۔

گاؤں کا راجہ بپھرے ہوئے شیر کیطرح تھوڑی دیر ٹہلا کیا۔ جب دماغ میں حواسوں نے ذرا گذر پایا تو پھر دہ باقیوں کیطرف متوجہ ہوا۔ اب اس نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ تم اپنا مکان دوگے یا نہیں بلکہ کسی اہم مقدمہ کے فیصلہ کی طرح ان کے سر چھپانے کے جھونپڑوں کا فیصلہ بھی سنا دیا "کلو کو بیس۔ نتھو کو اٹھارہ۔ جھینگر کو بائیس۔ گھمی کو پندرہ۔ فتو کو دس روپیہ دو۔ میرا مکان بنانے کو دیئے جائینگے۔۔۔۔ آج ہی سے اپنی اپنی جھوپڑیاں چھوڑنے کا بندوبست کرو۔۔۔ کیا کہتے ہو؟" اس نے گرجتے ہوئے پوچھا۔ "جو حکم مالک کا" جھینگر نے سُبھن کے انجام سے لرز کر جواب دیا اور سب نے اسکی تائید کی۔" اچھا جاؤ" ٹھاکر صاحب نے جواب سے مطمئن ہو کر اسطرح حکم دیا گویا عدالت برخواست کر رہے ہیں۔ اور یہ حکم سنتے ہی سب وہاں سے باہر آگئے۔

غریب سُبھن دنیا و مافیہا سے بے خبر راستہ میں پڑا تھا۔ خون نکل کر بہا اور بہہ کر جم گیا تھا۔ پیٹھ کی کھال کئی جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ زخموں پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ دانت بالکل بھینچے اور باہر نکلے ہوئے تھے مگر جانے والوں میں سے کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ اٹھا کر اسکے گھر پہنچا تا تو کیا ایک نظر دیکھ ہی لیتا۔

جب ٹھاکر صاحب ذرا حواسوں میں آئے تو کسی خاص جذبہ کے ماتحت۔۔۔۔۔ شاید قانونی دفعہ کے خیال سے خود ہی زخمی کو اٹھا لیجانے کا حکم دیا۔ پاس پڑوس والے ڈرتے ڈرتے آگے اور آدھ مرے سُبھن کو چارپائی پر ڈال کر اسکے گھر لے گئے۔ اس کی عورت پہلے ہی بیچین تھی دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شاید وہ سپاہیوں کو گالی کوسنے بھی دیتی کہ جھینگر نے منع کر دیا" چپ رہ۔۔۔۔ ہم نے پہلے ہی اسے منا (منع) کیا تھا۔۔۔۔ نہیں مانا آکھر (آخر) سجا پائی (سزا پائی) اب جلدی سے بیدجی کو بلا کر دکھا"

اور مریض گاؤں کے بڑے بید کے سپرد کر دیا گیا بید نے کچھ مرہم۔ کچھ بوٹیاں کچھ عرق استعمال کرائے۔ جب کہیں دوسرے دن ہوش آیا۔ وہ بھی ایسا کہ نہ آنے کے برابر۔ جب آنکھیں کھولتا روتا اور مسلسل روتا یہانتک کہ پھر بیہوش ہو جاتا۔ پھر لگے پولیس اور عدالت کے منظر دکھائی دینے اور وہ اپنے ردیاؤ منصف سے ٹھاکر صاحب کے مقابلہ میں انصاف ۳۷

طلب کرتا۔ یہاں تک کہ ایک بیساختہ قہقہہ ثابت کردیتا کہ وہ انصاف حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

اسی حالت میں ایک مہینہ گذر گیا۔ سکھرکی لٹیا تھالی تک بک گئی۔ اگر ٹھاکر صاحب کی طرف سے چاندی کے دس چمکدار سکے معاملہ ختم کردینے کی شرط پر اس کی بیوی کو نہ دے دئے جاتے۔ تو شاید موت کی بھیانک تاریکی کب کی اُسے اپنے دامن میں سلا چکی ہوتی۔ بہر طور وہ اب بھی زندہ تھا اور رو بصحت۔ البتہ صحت کے ساتھ ایک دوسری بیماری ضرور ترقی کر رہی تھی یعنی ضد اور چڑچڑاپن۔

ایک دن جب وہ تیل اور مرچ پڑی ترکاری کھانے کی ضد کر رہا تھا۔ راجہ صاحب کا سپاہی آگیا اور پھر مکان کا مطالبہ کیا کیونکہ ٹھاکر صاحب کی کوٹھی بغیر اسکا مکان ملائے ہوئے بن نہ سکتی تھی۔

"ہاں ہاں..... دی بکھری میں نے...... مجھے اچھا ہونے دو پھر ادالت (عدالت) بکھری دلائیگی" اُس نے تیقن آمیز لہجہ میں جواب دیا۔ اور حقیقتاً اسکا ارادہ تھا کہ اچھا ہوتے ہی پولیس اور عدالت سے انصاف طلب کریگا۔

یہ بات سن کر عورت کانپ گئی اس نے ڈانٹتے ہوئے کہا "کاہے بکتے ہو.... پھر وہی گت بنواؤگے کیا؟"

"چپ رہ ...... تو کیا جانے...... اب بولی تو ایسی لاٹھی مارونگا کہ گو (مغز) بہہ جائیگا۔" "بکھیر تمہاری بکھری (خیر تمہاری خوشی)" یہ کہکر وہ بھی چپ ہوگئی۔ سبھن نے سپاہی اور پاس پڑوس والوں کو بے نقط سنانی شروع کر دی۔

عورت سپاہی کے پیروں پر گر پڑی "تم ان کی بات کا برا نہ مانو...... میں دونگی بکھری تمہیں بس جرا (ذرا) یہ اچھے ہوجائیں..... انکا ماگہ (دماغ) ٹھیک نہیں بیدجی کہتے ہیں آدھے پاگل ہیں.... آدھے"۔ اس نے روتے ہوئے التجا کی۔

"پاگل بتاتی ہے مجھے..... سسری"..... اور یہ کہتے ہوئے چارپائی کے پاس سے پتھر کا بانٹ اٹھاکر غریب عورت کے کھینچ مارا۔ وہ اتفاق سے پیٹھ پر پڑا ورنہ مفلسی میں آٹا گیلا ہونے میں کسر ہی کیا رہ گئی تھی۔ خود تو بے دست و پا پڑا ہی تھا۔ اس کا سہارا بھی نہ رہتا جو دوسروں کا آٹا پیس کر کے جیسے تیسے علاج معالجہ کر رہی تھی۔

۳۸ وہ پھر سپاہی پر بڑبڑانے لگا "جا یہاں سے۔ بڑا آیا ٹھاکر کا بھیر بکر (سفیر بکر) نہیں تو...... نہیں تو....؟" یہ کہکر اس نے دوسرا بانٹ اٹھانا چاہا۔

اگرچہ اسی ہاتھ نہ پکڑ لیتا تو بغیر چوٹ کھائے نہ بچتا۔ بیمار سمجھکر یا کسی اور خیال سے کوئی سزا تو نہ دی البتہ غصہ میں اٹھکر چلا گیا اس یقین کے ساتھ کہ سبھن کی ہانڈی سے سیدھی انگلیوں گھی نہ نکلے گا۔

سبھن روز بروز اچھا ہوتا گیا یہاں تک کہ پہلی بارش کے بعد اس نے اپنے کھیتوں کو جوتنا بونا شروع کیا۔ ہل چلاتے وقت وہ ہمیشہ یہی سوچا کرتا تھا کہ فصل کاٹتے ہی میں ٹھاکر صاحب پر مقدمہ دائر کر دونگا۔

ایک دو دوستوں نے اُسے منع بھی کیا کہ اگر گاؤں میں رہنا ہے تو ٹھاکر صاحب کو ان داتا جانو اپنی مٹی خراب کرنے سے کیا فائدہ۔ مگر ایک اٹل نہیں، تھی جسکے سوا سمجھانے والوں نے کبھی کوئی دوسرا جواب نہ پایا۔

دو مہینہ اور گذر گئے اور فصل تیاری کے قریب پہنچگئی۔ وہ جب کھیت پر جاتا تو خوشی سے پھولے نہ سماتا اسلئے نہیں کہ اب کھانے کو روٹی کی آسانی ہو جائیگی بلکہ اس لئے کہ اسے بیچکر وہ اپنی انصاف کی بھوک بجھائیگا۔

ایک دن جب وہ اپنے مکا کے کھیت پر بیٹھا کالیداس کا ایک گیت گانے میں مگن تھا پولیس کی ایک جماعت نے اسکو گھیر لیا ہتھکڑیاں کھنکیں اور آنکھ جھپکتے ہی اسکے ہاتھوں میں پڑگئیں"....

"اکھر میری کھتا" (آخر میری خطا) اس نے ایک کانسٹبل سے معصومانہ انداز میں پوچھا "خطا"، تھانیدار نے دانت پیستے ہوئے۔ جواب دیا" ڈاکو...... چور.... بدمعاش..... خطا جیل میں معلوم ہوگی"۔

لیکن ان کی باتوں سے اسکو معلوم ہوا کہ ناجائز اسلحہ رکھنے کے الزام میں اسکی گرفتاری ہوئی ہے۔

گاؤں گاؤں خبر ہوگئی کہ سبھن کے گھر سے پستول برآمد ہوا ہے مگر یہ کوئی نہ جانتا تھا کہ کیسے؟

پولیس نے اسی دن اس کا چالان کر دیا اور عدالت میں مقدمہ چلنے لگا۔ بیانات ہوئے شہادتیں گزریں ان کی بہنیں بہو چاچا اور کاکا کہا کرتا تھا۔ ان کی تن کی بدستی پر اسے پورا بھروسہ اور کامل اعتماد تھا۔
لیکن یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود نا کچھ بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ انصاف ہوتا ہے یا نہیں۔ اور اس وقت تک اس یقین نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا جب تک اس کے کانوں نے حکم سزا اور آنکھوں نے جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری نہ دیکھ لی۔

---

(۳)

ٹھاکر صاحب کے مکان کی زینہ نیاں سیڑھیاں کھٹکنے لگیں۔ گھروں کی جگہ میدان اور میدان کی جگہ اینٹ کے چٹوں اور گارے چونے کا ڈھیر تھا۔ جا بجا عمارتی مسالہ کے لیے گڑھے کھدے ہوئے تھے اور دوڑ کر آنے والے لاتعداد مزدور نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے آ جا رہے تھے۔
معصوم لڑکے بھی کی بیوی بھی ٹھاکر صاحب کی اقبالمندی کی نذر ہو چکی تھی۔ اس کی عورت روتی کلپتی بچوں کو لے کر اپنے میکے چلی گئی تھی کیونکہ سمبن کے بعد نباہ کون جس کے سہارے اُدھر پور میں رہتی۔ اور اگر کوئی رکھتا بھی تو کیسے کھتا تو خود بھی گھر سے بے گھر ہوتا۔ ہر کچھ دار نے اس کے سر پر ہاتھ رکھنے سے انکار کر دیا۔ مختصر یہ کہ وہ وطن سے بے وطن کیمیت بات کی ماں سے جھکارن ہو گئی۔ اور قریب کے گاؤں میں بھائی کے ہاں روز کی گزران پر گذر بسر کرنے لگی۔
اُدھر ٹھاکر صاحب خوشی اور لا انتہا خوشی کے اتھاہ سمندر میں ہر وقت غوطے کھایا کرتے تھے۔ ان کا دل مسرت سے لبریز اور دماغ افراط سے معمور رہتا کیونکہ دوستوں کی آمد و رفت سے بہت پہلے ان کا قصر تیار ہوا جا رہا تھا۔
تعمیر شروع ہوئے دو ماہ گذر چکے تھے۔ راج معمار ضرورت سے زیادہ مزدور بے حساب تھے۔ ایک مہینہ کے اندر اندر کام ختم ہو جانے کی پوری امید تھی۔ بلکہ اس سے بھی کچھ پہلے کیونکہ دیکھ بھال نگرانی راجہ صاحب بنفسِ نفیس کرتے تھے۔ بڑی سختی اور کڑائی۔ مثلاً سب مزدور ایک ساتھ بیٹھ کر نہیں پی سکتے ایک ایک اور الگ الگ۔ دوپہر کی چھٹی دو گھنٹہ کے بجائے ایک گھنٹہ کر دی گئی تھی۔ اکثر جب کوئی ڈاٹ وغیرہ نامکمل رہ جاتی تو سات آٹھ بجے رات تک گیس کی روشنی میں کام ہوا کرتا۔ اور عدم تعمیل کی صورت میں سزا۔ وہی لاتوں تھپڑوں اور گھونسوں کی سزا ملتی۔ ۳۰
پچھلے بیس بیس سال کی باتیں کل کی باتیں معلوم ہوتی ہیں آئندہ ایک ماہ گزرتے کیا دیر لگتی چٹکی بجاتے گزر گیا اور اپنے بعد گرد و نواح کے گاؤں میں سنہری گنبدوں اور بڑی بڑی محرابوں والی ایک تاریخی یادگار چھوڑ گیا جو مستقبل قریب میں "راج محل" کہلانے والا تھا اور جس کے تذکرہ کے ساتھ مرحوم سمبن کا واقعہ دبی دبی زبان میں ضرور دہرایا جاتا تھا۔
جب کوٹھی تعمیر ہو گئی تو راج ماتا کی رائے ہوئی کہ نئے مکان میں منتقل ہونے سے قبل کتھا ہونی ضروری ہے تاکہ بھوت پریتوں کا جھگڑا نہ رہے۔
"ننھے ننھے بچے آگئے ہیں۔۔۔ موئے چار باسیوں کے گھر نہ جانے کون بھوت بلا رہتی ہو کتھا ضرور کر دو" ٹھکرائن نے رائے پیش کی۔
"ہاں اچھا ہے" راجہ نے جواب دیا "ساتھ ہی ضلع کے حکام۔۔ پولیس اور معززوں کی دعوت بھی کر دیں۔ ایک پنتھ دو کاج ہو جائیں گے سب سے میل ملاقات بھی بڑھ جائے گی اور فرض بھی ادا ہو جائے گا"۔
دن تاریخ طے ہوا پھر ٹھاکر اور راجہ کے لوازمات پر تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ سجاوٹ بناوٹ اہتمام و انتظام پر بحث ہوئی اور جملہ معاملات طے ہو گئے۔
تیسرے چوتھے دن دعوتی رقعے بھی رئیسوں خان بہادروں، اور حاکموں کے منتظر و منصور ہاتھوں میں پہونچ گئے۔
برسات کے ایک مبارک دن دعوت نے عملی صورت اختیار کر لی۔ گیس لیمپوں جھاڑوں اور فانوسوں سے محل بقعۂ نور بنا دیا گیا اور ہال کوہ طور۔

عالیشان پھاٹکوں اور راستوں کی دو رویہ سبز کی قناتوں سے گاؤں دلہن کی طرح آراستہ کر دیا گیا۔ صحن میں ۸ بجے کے بعد صد ہا میزیں لگا دی گئیں جن کے آس پاس خانساماں اور بہرے سفید سفید پوشاکیں پہنے ادھر سے ادھر گھومتے پھرتے تھے۔ پہلے کتھا ہوئی اور جب وہ ختم ہو گئی تو کھانا شروع ہوا اور وہ بھی ۸ بجے رات کو بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔ لوگ ٹھاکر صاحب کو مبارکباد دے دے کر رخصت ہونے لگے۔

قابلِ دید بات یہ تھی کہ راجہ صاحب کی شان جبروت آج کہیں نام کو بھی نظر نہ آتی تھی بلکہ اس کی جگہ کچھ انکسار کچھ فروتنی نے لے لی تھی جس سے بتے ہنس کر اور مسکرا کر ملکی حکام سے کچھ دب کر ملتے رہے۔

یہ موثر دلگداز منظر غرض ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے پھیلا ہوا سامان سمٹ سمٹ کر اپنی اپنی جگہ پہنچ گیا۔ دو گھنٹہ کے بعد گھر کے اندر ٹھاکر صاحب ان کے بیوی بچے اور نوکر چاکر تھے اور باہر برادر راس کی ہیں ہیں پھوار۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا عجیب کیف و سرور پیدا کر رہی تھی۔ سب سو گئے۔

اب بادل بڑھنے لگے اور چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ بادل بری طرح گرجنے لگا۔ گویا کوئی افسانوی دیو تھا جو بجلی کی چمکاتی ہوئی جوالا لیے مظلوموں کی حمایت میں ظالموں سے جنگ کرنے آ پہونچا تھا۔ بجلی کی کڑک بھی بڑھ گئی اور اتنی بڑھ گئی کہ بچے چونک چونک پڑتے تھے جن گھروں میں چراغ نہ تھا ان میں ابس ابس۔ وحشی سی صورت دیکھ کر بچوں کو کلیجے سے چمٹا لیتیں۔

ذرا دیر میں ہوائیں بھی تیز و تند ہو گئیں اتنی کہ چھپر اڑنے اور دانت بجنے لگے۔ پھر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

لیکن ٹھاکر صاحب اور ان کے متعلقین دن بھر کے تھکے ہارے پریشان اس تمام آفت سے بے خبر بلند چھتوں کے نیچے میٹھی نیند سو رہے تھے۔

ٹھیک ۲ بجے بجلی کی کڑک یا شاید کسی اور وجہ سے رلج اما کی آنکھ کھل گئی انھوں نے ٹھاکر صاحب کو جگایا۔

"میں نے ایک سپنا دیکھا ہے،" انھوں نے ٹھاکر صاحب کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔

"جانے بھی دو۔۔۔ صبح کہنا" ٹھاکر صاحب نے اوں اوں کرتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں نہیں سنو تو" ٹھکرائن نے اصرار کیا۔ وہ کچھ خوفزدہ سی تھیں "میں نے دیکھا کہ باہر دالان میں تم کھڑے ہو اور تمہارے پاس ایک میلا کچیلا دیہاتی جس کے سر سے خون بہہ رہا ہے اور ہزاروں کھیاں منہ پر بھنبھنا رہی ہیں۔ ہاتھ پیر اور منہ بھی زخمی ہے۔۔۔ اور۔۔۔ اور شاید تم ہی نے اس کو مارا ہے۔"

"اونہہ سب خیال ہے۔۔۔ ہماری بھی ان باتوں کو کہیں اس کا خیال آ گیا ہو گا۔۔۔ وہی بھمن کا" ٹھاکر صاحب نے ٹالتے ہوئے جواب دیا۔

"ابھی اور بھی ہے"۔ راج ماتا نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے کہا "تم اس حالت میں بھی اس پر خفا ہو رہے ہو کہ ایک دم سے وہ گر گیا اور شاید مر گیا" یہ کہتے ہوئے انھیں خوف سے جھرجھری سی آ گئی۔

پھر میں نے دوبارہ دیکھا کہ تم برآمدہ میں کرسی میز ڈالے بیٹھے ہوئے کسی خوشی کے رقعے لکھ رہے ہو۔ پانی برس رہا ہے اور بجلی چمک رہی ہے۔ کہ یک ایک تڑاقا ہوا اور بجلی برآمدہ پر گری۔ برآمدہ کرسی میز اور تمہیں۔۔۔ "نہ کرو ستم" یہ کہتے ہوئے وحشت سے وہ خاموش ہو گئیں۔

"یہ سب تمہارا وہم ہے۔۔۔ بھمن پر میں نے ظلم ہی کون سا کیا ہے جو ایشور کو ناگوار ہو۔۔۔ اپنی کوٹھی کے لیے زمین ہی تو لی۔ بہرا کیا کیا۔۔۔ بے ایمان کو سمجھایا معاوضہ دیا نا تب میں نے زمینداری والی چال کھیلی۔۔۔ اب جیل بھگت رہا ہے کمبخت۔"

یہ فقرہ ابھی پورا نہ ہوا تھا کہ بجلی تڑپی بڑی بھینی سی کے ساتھ مظلوم کا بدلہ لینے کے لیے تڑپی اور روت بن کر اسی لمحہ قصر پر گری اور قصر بے خبر ٹھاکر پر اس طرح کہ سدرج کے ساتھ ساتھ وہ بھی جلا کر خاکستر کر دیا۔

راج محل ابھی "راج محل" کے نام سے مشہور بھی نہ ہونے پایا تھا کہ تاریخی کھنڈر بن گیا۔

آغاز خیال کا مطالعہ کیجیے (مختصر افسانہ) مصنف نسیم سندیلوی۔

مجھکو بدنام نہ کر میرے خیال کے مالک

جناب سلیمہ صاحبہ صدیقی

میں پوچھتا ہوں تم بے وفا ہو یا میں۔ میں کر جانے والا۔ میرے وعدے جھوٹے۔ میری محبت جھوٹی۔ مطلبی — میں تمہاری نگاہ میں کیا کچھ نہیں۔ میری نگاہیں تیری ہی نگاہیں تو وہ دام فریب ہیں جن میں پھنسا ہوا ہوں۔ میرا ہر لفظ محبت کا تیر ہے۔ گرز ہر میں بجھا ہوا۔ میرا ہر پیمان سر پر لیتا ہوا دل کی دنیاؤں میں تلاطم پیدا کرتا ہے گرما دیتا ہے۔ میرا ہر نغمہ محبت کا ایک راگ ہے جو تمام کائنات کو زیر و زبر کرتا ہوا ایک وحشی طوفان کی طرح گزر جاتا ہے۔ یہ سب ٹھیک سہی۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ تم کیا ہو!

تم میرے دل کی دنیا برباد کر جانے والی فرشتہ۔ تم میرے دل کی گہرائیوں میں اتر کر فریب دینے والی ہو۔ تمہارے تیر ستم دل کے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں۔ محبت کی شراب کا لبریز جام بھر رہو۔ ہوتا ہے پھر بھی تمہاری دنیا میں کوئی تبدیلی نہیں ہونے پاتی ہے۔ وہی بھولی بھالی صورت والی معصومیت کی دیوی ہو۔

یہ نیم باز آنکھیں۔ یہ ابروئے خمدار۔ یہ غنچہ دہنی۔ یہ پھولوں سے بھی نازک رخسار۔ یہ صراحی دار گردن۔ یہ گوری کلائیاں۔ یہ کبک دری کی چال۔ پھر بھی معصوم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

تم جب پھولوں سے ٹہنیاں کرتی ہوئی شراب جوانی سے مخمور ہو کر خرام ناز فرماتی ہو تو ہزاروں دل پامال ہو جاتے ہیں۔ نازِ خشک میں جان پڑ جاتی ہے۔ خانقاہوں کی دنیا درہم برہم ہو جاتی ہے۔ شراب محبت کے دور چلنے لگتے ہیں۔ اے کہ تم اسی مخمور نیم باز آنکھوں سے بے چور بناتی۔ اٹھلاتی۔ بجاتی بجلیاں گراتی مسکراتی اور حشر برپا کرتی ہوئی گزر جاتی ہو۔

دست حنائی میں گلابی جام مخمور آنکھیں۔ ناز و ادا کرشمہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لب نازک میں ہلکی سی جنبش ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر شکایت کرتی ہو بد مست ہوں ۔ ۔ ۔ جہاں حسن کی تمام رنگینیاں یک جا ہوں بھلا کون انسان ہے جو بچ کر نکل جائے۔

حسن و عشق۔ محبت و نالۂ نیم شبی۔ اور شمع و پروانہ۔ جام بے خودی و مدہوشی۔ یہ کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح سے شمع حسن کی کشش ہر پروانہ کو گرویدہ کر کے جل مرنے کی ترغیب دیتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم ہی بتاؤ کہ بے وفا ہم ہیں یا تم۔

لطیفے

ایک بخیل آدمی نے نوکر سے ایک پیسہ کا دہی منگایا۔ جب وہ کھانے بیٹھا تو اس کا چہرہ دہی میں مکھی دیکھ کر غصہ سے سرخ ہو گیا۔ اس نے نوکر کو بلا کر مکھی دکھاتے ہوئے کہا۔

"کیوں جی تم دہی دیکھ کر نہیں لائے۔ اندھے ہو گئے ہو۔ اس میں مکھی کیسی؟" نوکر نے مودبانہ جواب دیا۔ "حضور نے ایک پیسہ کا تو دہی منگایا تھا۔ اس میں مکھی نہ نکلتی تو کیا ہاتھی گھوڑے نکلتے۔"

عذرا آفندی

دو دوست اختر اور جمال بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اختر نے پوچھا۔

"بھائی جمال تم نے فلسفہ میں کیا پڑھا ہے؟"

جمال: "میں ایک کو دو ثابت کر سکتا ہوں مثلاً اس انڈے ہی کو لو۔"

اختر: "وہ کیسے؟" جمال: "ایک انڈا اور ایک انڈے کی ماہیت۔"

اختر (انڈا منہ میں رکھتے ہوئے): "اچھا تو میں نے انڈا کھا لیا اب تم اسکی ماہیت کھاؤ۔"

مہر ضیا

ماں

از محترمہ سعیدہ وجاہت علی

افراد ڈرامہ

مادام کوشا ۔ الفنسو کی ماں
مادام کیری ۔ مادام کوشا کی دوست
نوبش ۔۔ الفنسو کی منگیتر

12 3803
21.3.95

پہلا منظر

وقت ۔ آٹھ بجے صبح ۔ مقام ۔ مادام کوشا کا بنگلہ

41 بوڑھی مادام کوشا اپنی سبز اونی چادر میں لپٹی صوفہ کی ایک گہری کرسی میں دھنسی بیٹھی ہے اور کروشیا بن رہی ہے ۔ بائیں جانب کرسی پر مادام کیری بیٹھی کچھ سوچ رہی ہے ۔

مادام کیری :۔ "فرانکو کی فوجیں بڑھتی ہی چلی آتی ہیں ۔ ہم لوگ روز بروز خطرہ سے قریب ہوتے جاتے ہیں ۔"

مادام کوشا :۔ "کیا اب ہم خطرہ میں ہیں؟ ہمارے ہزاروں اور لاکھوں نوجوان آئے دن آزادی اور جمہوریت کی بھینٹ چڑھتے چلے جاتے ہیں لیکن اب تک ہم سامراج کا سر نہیں کچل سکے ہیں ۔"

مادام کیری :۔ "مجھے معلوم ہوتا ہے کہ فرانکو کامیاب ہو جائے گا ۔"

مادام کوشا :۔ "اسپین کا گرم خون زیادہ دنوں تک غلامی نہیں برداشت کر سکتا ۔"

مادام کیری :۔ "مجھے تو اب اپنے شہر کی بھی خیر نہیں معلوم ہوتی سیلان کی وادی کے آگے پھر ہمارا ہی شہر پڑتا ہے ۔"

مادام کوشا :۔ "لیکن سیلان کی وادی میں ہمارے مزدوروں کا بہت مستحکم مورچہ ہے ۔ وہ پیچھے نہیں ہٹائے جا سکتے ۔"

مادام کیری :۔ "اور اگر وہ پیچھے ہٹ گئے ؟"

مادام کوشا :۔ "تو شہر کے باہر ہم اسپینی عورتوں کا مورچہ ہوگا ۔"

مادام کیری :۔ "ہا ہا !"

مادام کوشا :۔ "اور کیا ؟ کیا تاریخ میں یہ لکھا جائے گا کہ جس وقت فسطائی درندے اسپین کی مقدس سرزمین کو روند رہے تھے اور آزادی کے پرستاروں کے خون سے زمین کا چپہ چپہ سرخ تھا اسپین کی عورتیں گھروں میں چھپی ہوئی کروشیا بن رہی تھیں !"

مادام کیری :۔ "الفنسو کی کچھ خبر نہیں معلوم ہوئی ۔ خدا کرے اس کا بال بیکا نہ ہو ۔"

مادام کوشا: وہ آگے کو کہہ رہا تھا لیکن میں نے اُسے صاف صاف لکھ دیا کہ مجھ جیسی ماں سے زیادہ اس پر اسپین کی ماں کا فرض ہے"

مادام کیری: تم سنگدل ہو گئی ہو! مادام میری نوشی اسے بری طرح یاد کر رہی ہے"

مادام کوشا: آہ بکیا اس اپنے اکلوتے نوجوان بیٹے کو نہیں یاد کرتی! کیا وہ میرے مرحوم شوہر کی جیتی جاگتی تصویر نہیں! اپنا ہاتھ لاؤ مادام سینے پر رکھ کر دیکھو اس کی جدائی میں وہ کیسا دھڑک رہا ہے! لیکن اس وقت جب دنیا کی تاریخ کا ایک فیصلہ کن باب لکھا جا رہا ہے جب ہمارے تمہارے ایسے کروڑوں انسانوں کی قسمتوں کا فیصلہ کیا جا رہا ہے کیا ہم اپنی چھوٹی چھوٹی محبتوں اور خود غرضیوں کو بھی نہیں بھلا سکتے؟ میرا بیٹا مزدوروں کا سرخ جھنڈا تھامے ہوئے دنیا کے سارے مزدوروں کا سر اونچا کر رہا ہے۔ وہ اپنے خون سے اسپین کے نخل آزادی کو سینچ رہا ہے۔ میں ایک بہادر لڑکے کی مغرور ماں ہوں"

مادام کیری: تم مادام! ماں نہیں ہو سکتیں!"

(نوشی دوڑتی ہوئی آتی ہے اور ایک صوفہ پر گر کر سسکیاں بھرنے لگتی ہے)۔

نوشی: میرا دل ٹوٹ گیا!"

(مادام کوشا سنبھل کر بیٹھ جاتی ہے اور کاغذ کا پرزہ ہاتھ سے رکھ دیتی ہے مادام کیری نوشی کے پاس لپک جاتی ہے)۔

مادام کیری: کیا ہوا میری جان!"

مادام کوشا: ہو ہوا نوشی!"

نوشی: (دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیتی ہے) کیملو کی جنگ میں انتقال ہو گیا!"

مادام کیری: ہائے میرے خدا! (بیٹھ جاتی ہے)۔

مادام کوشا: میرا بچہ! (بیہوش ہو کر گر پڑتی ہے۔

دوسرا منظر

(سیلان کے مورچہ پر مزدوروں نے فرانکو کی فوج کو پیچھے دھکیل دیا۔ سارے شہر میں جشن منایا جا رہا ہے۔ ایک سڑک پر مزدوروں کی نوجوان جلوس نکل رہا ہے۔ آگے آگے سرخ جھنڈا ہے۔ دور دیہ تماش بین قطار در قطار کھڑے ہیں اور تالیاں پیٹ رہے ہیں۔ رومال ہلا رہے ہیں نعرے لگا رہے ہیں اور پھول برسا رہے ہیں۔

مادام کوشا ایک ہاتھ کے ایک کونے پر سیاہ لباس پہنے رومال ہلا رہی ہے۔ وفور جوش سے اسکے آنسو بہہ رہے ہیں)

مجمع نعرے لگاتا ہے۔

مزدور! زندہ باد!! جمہور اسپین! زندہ باد!! دنیائے مزدور ایک ہو جاؤ!! فاتح سیلان! مبارک ہو!

(نوشی اور مادام کیری دوڑی ہوئی مادام کوشا کے پاس آتی ہیں)

نوشی: خالہ جلدی چلو دوسری طرف سڑک پر شہیدوں کے جنازے نکل رہے ہیں"

مادام کوشا: مجھے یہ سرخ جھنڈا دیکھنے دو"

نوشی: کیا تم اپنے لڑکے کا جنازہ بھی نہ دیکھو گی"

مادام کوشا: میں اُسے اس سرخ جھنڈے میں دیکھ رہی ہوں"

نوشی اور مادام کیری جلبلاتی ہوئی بھاگتی ہیں۔ سرخ جھنڈا لہراتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ سارا مجمع چیخ پڑتا ہے۔

انقلاب زندہ باد!!

مادام کوشا لپک کر جھنڈے کو اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔

(پردہ)

خدا

(از حضرت نشتر سندیلوی)

میں اوس کا ہوں جو صحرا کو بھی دریائے رواں کردے ۔۔۔ فلک کو جو زمیں کردے، زمیں کو آسماں کردے

جو وہ چاہے بھرے گلشن کو تاراجِ خزاں کردے ۔۔۔ کرم کردے تو شاخِ خشک کو بھی گلفشاں کردے

جو وہ چاہے تو اہلِ کارواں کو گم نشاں کردے ۔۔۔ جو وہ چاہے تو بچھڑوں کو شریکِ کارواں کردے

جو وہ چاہے تو ہوں غفلت میں بھی آثارِ بیداری ۔۔۔ جو وہ چاہے تو بیداری کو بھی خوابِ گراں کردے

جو وہ چاہے تو برسے آتش سیال یخ ہو کر ۔۔۔ جو وہ چاہے تو آبِ سرد کو آتش فشاں کردے

جو وہ چاہے تو بخشے آبِ حیواں برباراں کو ۔۔۔ زمینِ شور کو چاہے چمن زارِ جناں کردے

جو وہ چاہے تو ناممکن کو ممکن کرکے دکھلادے ۔۔۔ جو وہ چاہے تو برگِ کاہ کو کوہِ گراں کردے

جو وہ چاہے فضا بدلے ہوا کے ایک جھونکے میں ۔۔۔ جو وہ چاہے تو پل میں منقلب رنگِ جہاں کردے

جو وہ چاہے بتادے رازِ قدرت ذرے ذرے کو ۔۔۔ جو وہ چاہے شجر کے پتے پتے کو زباں کردے

ہر اک ذرہ جہاں کا تابعِ فرمانِ قدرت ہے ۔۔۔ ارے غافل ترا ہر شکرِ مجبوری شکایت ہے

علم اکثریہ

فی الجملہ معلومات

کیا آپ جانتے ہیں؟

۱۔ ایک قوام متحدہ کب قائم ہوئی اور اس کا کیا کام ہے؟

یوم صلح نامہ دستخط کانفرنس (سان فرانسسکو) جنوری سنہ [illegible]ء کو لیگ قوام قائم ہوئی۔ اس کی غرض جیسا کہ اس کے قرارنامہ کی تمہید میں درج ہے بین الاقوامی آسودگی اور صلح کی ضمانت ہے۔

۲۔ سنگ رازتیاد (Rosetta Stone) کیا ہے؟

سنگ رازتیا [illegible] میں دریائے نیل کے کنارے کی ایک پرانی مسلمان بستی رازتیا میں دریافت کیا گیا۔ اس پتھر پر قدیم مصریوں کی [illegible] جس میں حروف کی جگہ تصویریں بنائی جاتی تھیں نقش کی ہوئی ہیں جو ہمیں پرانی مصری تہذیب کا پتہ دیتی ہیں۔

۳۔ دوران خون کیسے ہوتا ہے؟

خون قلب کے بائیں جانب سے شریانوں میں ہوتا ہوا تمام جسم کا دورہ کرتا ہے۔ یہ صاف خون ہوتا ہے۔ جسم میں دورہ کے بعد خون گندہ ہو جاتا ہے۔ خون کی رنگت نیلی ہو جاتی ہے جس کے بعد رگوں کے ذریعہ سے یہی خون دل کی داہنی جانب واپس آتا ہے یہاں سے خون پھیپھڑوں میں جاتا ہے۔ پھیپھڑوں سے صاف ہو کر خون دل کی بائیں جانب آتا ہے جہاں سے پھر اسی طرح دورہ شروع کرتا ہے۔ 44

۴۔ ہٹلر جرمن نہیں ہے۔

ہٹلر آسٹریا کے خاندان والڈویرٹیل (Waldviertel) سے ہے۔ ہٹلر کا باپ اسے نیاس ہٹلر (Hitler Alois) [illegible] اس کی تیسری بیوی کلارا پولزل (Klara Polzl) سے جو اس کی دور کی بہن بھی شادی کے چار سال بعد شہر براناؤ (Braunau) میں ۲۰ اپریل [illegible]ء میں اڈالف ہٹلر پیدا ہوا۔

۵۔ کینچوا کیا مفید کام کرتا ہے؟

کینچوا [illegible] ہونا زمین کی زرخیزی کے لیے نہایت ضروری ہے کیونکہ کینچوا زمین کی تہہ سے اچھی مٹی اوپر لاتا ہے جو ایک اچھے ہل چلانے کا کام دیتی ہے۔ (۲) کینچوے کے بنائے ہوئے سوراخوں سے پانی زمین کے اندر جذب ہوتا ہے جس سے کھیتی میں مدد ملتی ہے۔ اور جب اوپر کی سطح خشک ہو جاتی ہے اس وقت بھی زمین کے اندر نمی باقی رہتی ہے۔ (۳) کینچوے کی عادت ہوتی ہے کہ وہ پتیاں اور دوسری اسی قسم کی چیزیں زمین کے اندر جمع کرتا ہے جو بعد میں سڑ کر اچھی کھاد کا کام دیتی ہیں۔

۶۔ کبیر داس اور کبیر پنتھ کیا ہے؟

سنہ [illegible]ء کی ایک سہانی صبح کو تالاب کے کنارے نیرو نام ایک جولاہے نے ایک بچہ پڑا پایا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی نیرو نے اس بچہ کی اپنی اولاد کی طرح پرورش کی۔ رامانند کی مرضی کے خلاف وہ ان کے چیلے ہوئے اور بڑے ہو کر کبیر کہلائے بچپن میں انھوں نے ہندو اور مسلمان دونوں کو صدمہ پہونچایا۔ مسلمان ان سے اس لیے ناخوش ہوئے کہ انھوں نے خدا کے ہندی نام رکھے۔ ہندو تالاں تھے کہ اچھوت ہو کر انھوں نے جنیو پہنا۔ بنارس میں ان کا رہنا دشوار ہو گیا۔

سکندر لودھی نے فرمان شاہی سے انھیں بنارس چھوڑنے کا حکم دیا۔ انھوں نے گورکھپور کے ایک موضع میں رہ کر اپنے خیالات لوگوں میں مشہور کیے۔ کبیر نے ۱۵۱۸ء میں وفات پائی۔ ان کے انتقال کے کئی سو سال بعد ان کے شاگردوں نے ان کی یاد تازہ رکھنے کو اور حق کے سبق کو عام کرنے کے لیے بنارس میں ایک درگاہ قائم کی جس کو کبیر مٹھ کہتے ہیں۔ کبیر کے پیرو کبیر پنتھی کہلائے۔ کبیر بت پرستی سے متنفر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بتوں میں جان نہیں یہ ہمارے بنائے ہوئے پتھر کے کھلونے ہمیں نجات نہیں دلا سکتے۔ ان کی پوجا سے سکون نہیں لہٰذا ان کی پوجا بیکار ہے۔ پھر بھی کبیر ہندو تھے۔

- دن اور رات ہمیشہ برابر کیوں نہیں ہوتے؟ جب ہندوستان میں موسم سرما ہوتا ہے تو جنوبی افریقہ میں گرمی کیوں پڑتی ہے؟

زمین اپنے گردشی محور پر ساڑھے چھیاسٹھ ڈگری جھکی ہوئی ہے۔ زمین اپنے محور پر اور ساتھ ہی سورج کے گرد ایک بیضوی صورت میں گھومتی ہے۔ ۲۱ جون کو جب وہ سورج کے سامنے ذرا سی اٹھی ہوتی ہے تو ساڑھے تئیس ڈگری شمالی مقامات پر دوپہر کے وقت سورج بالکل سر پر ہوتا ہے۔ اسی طرح ۲۱ دسمبر کو جب دنیا ذرا سی سورج کی دوسری طرف جھکی ہوئی ہوتی ہے تو ساڑھے تئیس ڈگری جنوبی مقامات پر سورج سر پر ہوتا ہے۔ یعنی جب خط استوی کا شمالی حصہ سورج کی طرف جھکا ہوتا ہے تو وہاں موسم گرما ہوتا ہے۔ اور جب جنوبی حصہ سورج کی طرف مائل ہوتا ہے تو خط استوی کے جنوبی مقامات میں گرمی رہتی ہے۔ یہ دونوں باتیں ایک ساتھ نہیں ہو سکتیں یعنی بیک وقت خط استوی کے شمالی اور جنوبی دونوں حصے سورج کی طرف جھکے ہوئے نہیں ہو سکتے اس لیے جب خط استوی کے شمال میں گرمی ہوتی ہے تو جنوب میں سردی اور اسی طرح جب جنوبی مقامات پر گرمی کا موسم ہوتا ہے تو شمالی مقامات پر سردی کا۔ ۲۱ مارچ اور ۲۳ ستمبر کو آفتاب بالکل خط استوی کے سامنے ہوتا ہے جسے ہم نقطۂ اعتدال لیل و نہار کہتے ہیں۔ ان دو تاریخوں میں دن اور رات برابر ہوتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ دن بڑھنا اور رات گھٹنا شروع ہوتی ہے۔ ۲۱ دسمبر سے ۲۱ جون تک شمالی کرہ میں دن بڑھتا جاتا ہے اور رات چھوٹی ہوتی جاتی ہے اور جنوبی کرہ میں رات بڑھتی اور دن چھوٹا ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح جب شمالی کرہ میں دن بڑے ہوتے ہیں تو جنوبی کرہ میں راتیں بڑی۔

۴۵

- ترکی کا صدر۔ ولایت کا وزیر اعظم۔ ہندوستان کا وائسرائے روس کا ڈکٹیٹر اور امریکہ کا صدر کون ہے؟

عصمت انونو ترکی کے صدر ہیں۔ چرچل ولایت کے وزیر اعظم۔ لارڈ لنلتھگو ہندوستان کے وائسرائے، اسٹیلن روس کا ڈکٹیٹر اور امریکہ کے صدر روزویلٹ ہیں۔

اُردو ادب

کیا آپ کو معلوم ہے؟

- مثنوی گلزار نسیم۔ مثنوی زہر عشق۔ قصہ گل بکاؤلی۔ اخلاق ہندی۔ طوطا کہانی۔ سنگھاسن بتیسی اور علم الاخلاق کے مصنف کون ہیں؟

یوں تو بہت سے شاعروں نے مثنویاں لکھی ہیں لیکن دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم اور نواب مرزا شوق کی زہر عشق سب سے زیادہ ہر دلعزیز اور ممتاز ہیں۔ نہال چند لاہوری ۱۸۰۲ء میں فورٹ ولیم کالج میں تھے انھوں نے قصہ گل بکاؤلی اسی زمانہ میں ترتیب دیا۔ میر منشی بہادر علی حسینی نے ڈاکٹر جان گل کرائسٹ کی فرمائش پر اخلاق ہندی اردو میں ترجمہ کیا۔ طوطا کہانی حیدر بخش حیدری نے لکھی۔ سنگھاسن بتیسی میں کھیولال جی نے مدد دی ہے۔ بخشش کرامت حسین صاحب علم الاخلاق (اپنی نوعیت کی پہلی کتاب) کے مصنف ہیں۔

۲۔ اُردو نثر کی پہلی کتاب کون سی ہے؟

پہلے اُردو نثر کی پہلی کتاب کربل کتھا سمجھی جاتی تھی لیکن حال ہی میں ڈاکٹر عبدالحق نے سب رس معلوم کی ہے۔ فضلی کی وہ مجلس اُردو نثر کی پہلی کتاب ہے۔ سب رس کا سنہ تصنیف ۱۰۴۵ ہجری ہے۔ اس کے مصنف ملا وجہی عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر تھے۔ بادشاہ کی فرمائش پر یہ کتاب ترتیب دی گئی تو انھوں نے اس قصہ کو اپنے دماغ کی اختراع بتلایا ہے لیکن تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قصہ ۸۴۰ھ میں فتاحی نیشاپوری نے دستور عشاق میں حسن و دل کے نام سے ترتیب دیا ہے جو عہد عالمگیری میں زبان فارسی میں لکھی گئی۔ سب رس اور مثنوی کا قصہ بالکل ایک سا ہے کہیں کہیں معمولی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ قصہ بہت عجیب ہے زبان نہایت رنگین ہے۔

۳۔ دورِ متوسطین کے شعراء کون تھے اور اس زمانہ میں اُردو شاعری نے کہاں تک ترقی کی؟

ہم ایک دور کو دوسرے دور سے کسی ایک تاریخ سے جدا نہیں کر سکتے۔ زمانہ ایک زنجیر ہے اور وقت اس کی کڑیاں لیکن خواجہ میر درد (۱۱۳۳ ہجری تا ۱۱۹۹ ہجری) مرزا رفیع سودا (۱۱۲۵ تا ۱۱۹۵ھ) میر غلام حسین حسن اور میر تقی میر کے زمانہ کو دورِ متوسطین کے نام سے پکار سکتے ہیں۔ اس زمانہ میں اکثر شعراء دلی چھوڑ کر لکھنؤ آئے۔ دلی کی بربادی نے انھیں وطن چھوڑنے پر مجبور کیا۔ لکھنؤ اس وقت تک خوشحال تھا۔ درد نے سپہ گری چھوڑ کر شاعری شروع کی تھی اسی لیے زیادہ تر استعارات و تشبیہات عاشقانہ ہیں۔ عبارت صاف ہے ان کے کلام میں ہندی کے الفاظ نہیں ملتے۔ اور جگہ جگہ تصوف کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ کہیں کہیں سوز و گداز بھی موجود ہے۔ طبیعت میں بلا کا استغنا تھا۔ خودداری اور قناعت نے ہمیشہ ساتھ دیا۔ سب ہی دلی چھوڑ رہے تھے لیکن درد نے اس برے وقت میں بھی دلی میں ہی رہنا مناسب سمجھا۔ مرزا رفیع سودا ہجو کے ماہر تھے۔ ان کو اگر اردو کا خاقانی اور انوری کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ زبان پر فارسی کا عنصر غالب تھا۔ دلی سے فرخ آباد وہاں سے فیض آباد اور پھر دارالسلطنت کے بدلنے پر لکھنؤ آئے۔ جو الفاظ و محاورات مرزا سودا نے مروج کیے وہ زیادہ تر قبول کر لیے گئے سودا قصیدہ کے استاد تھے۔ ان کے کلام میں ایرال، والٹیر اور سوئفٹ (VEROLL, VOLTAIRE اور SWIFT) کا سا مزا ہے مگر (ADDISON) ایڈیسن کی سی متانت نہیں۔ الفاظ اور مضمون کی بندش مشکل ضرور ہے لیکن نہایت شیریں۔ ان کے کلام کا اثر ان کے زمانہ کے اور بعد کے شعراء پر بہت پڑا۔

میر حسن مثنوی کے استاد تھے جن میں مثنوی گلزار ارم اور مثنوی سحر البیان خاص قابل ذکر ہیں۔ میر حسن نے قصیدہ بھی کہے جن میں سے بیشتر ضائع ہو گئے انھوں نے سودا کی طرح ہجو سے کبھی اپنی زبان کو گندہ نہیں کیا۔ کلام میں عاشقانہ رنگ ہے۔ دلی کے مشہور خوشنویسوں میں تھے۔

میر تقی میر کو کون نہیں جانتا۔ اگر ان کو اردو کا ورڈس ورتھ (WORDSWORTH) کہا جائے تو غیر مناسب نہ ہوگا طبیعت آلام پسند تھی۔ زندگی ہی مصیبت میں گذری۔ اثر کیوں نہ ہوتا ؎

دل آماجگہ غم ناکی اور نفس ایک تیر خاکی

نہایت ہی ذکی الحس دل کے انسان تھے۔ زبان میں غضب کی چاشنی اور سلاست تھی۔ جو لفظ جو محاورہ زبان سے نکلا وہ زبان زد عام ہو گیا۔ اکثر مثنویاں بھی لکھیں۔ جن میں مثنوی خواب و خیال اور مثنوی جوش عشق قابل بیان ہیں۔ غزل میں ایک نیا رنگ ایک میٹھا درد ہوتا تھا ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

شاعر ہونے کے ساتھ ہی ستار بھی تھے۔ غمگین دلوں پر ان کی غزلیں نمک پاشی کا اثر رکھتی ہیں۔ میر کی دنیا درد و الم کی دنیا ہے۔ کلام نہایت پیارا بہتر الفاظ شیریں ہے ؎

میر ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے

دورِ متوسطین میں قصیدہ اور مثنوی نے کمال حاصل کیا۔ درد اور میر نے غزل گوئی میں بھی ایک نئی جان ڈالی لیکن دور کی ابتدا کا قصیدہ و مثنوی ہی ایسا ...

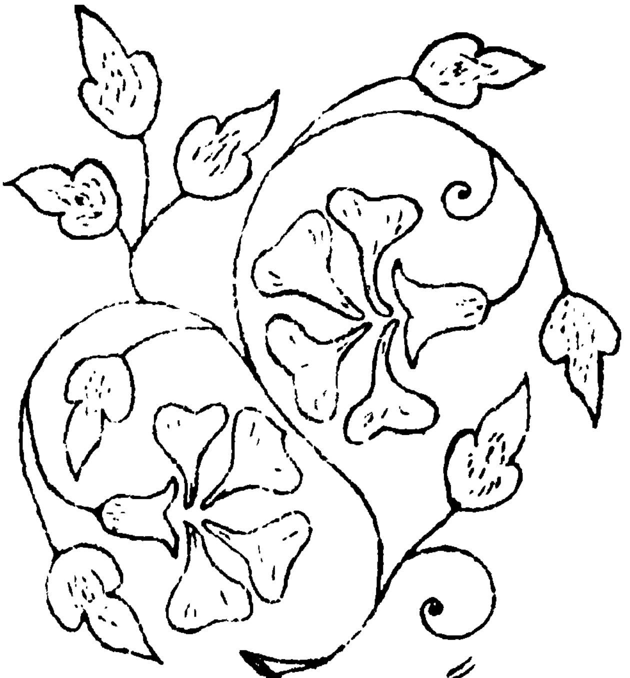

بیگم چودھری منظور احسن

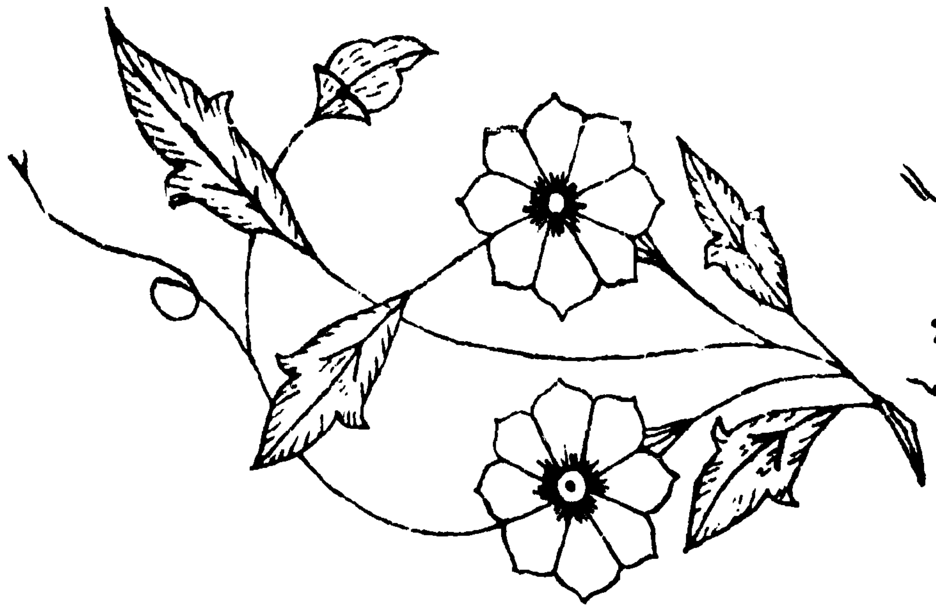

بیگم چودھری منظور احسن

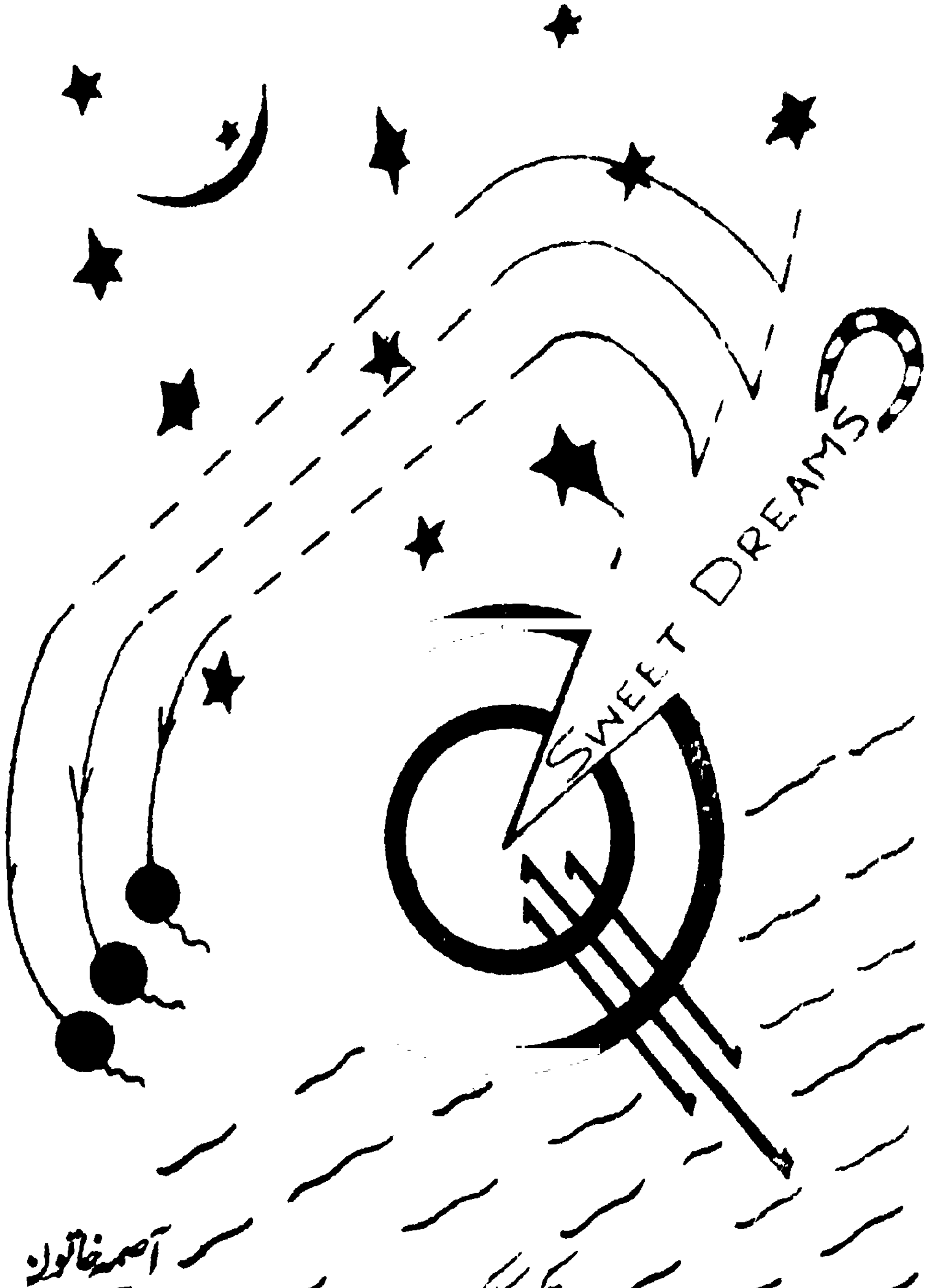

آصمہ خاتون

تکیہ کا کونہ

نیلے ریشم سے S. DREAMS لال ریشم سے سنہرے ریشم سے بنائیے

نسیم انہونوی بی۔ اے آنرس ایڈیٹر پرنٹر اینڈ پبلشر نے شاہی پریس میں چھپا کر دفتر اضطراب لکھنؤ سے شائع

جولائی سنہ ء

عورت کی مصیبت

بانجھ پن کا اصلی سبب حیض کی خرابیاں ہیں۔ ابلاپر کا استعمال تمام خرابیوں کو دور کرکے عورت کو اولاد کے قابل بناتا ہے۔ ۳۲ گولیاں صرف [illegible] محصول ڈاک ۸ علاوہ۔ نوٹ: حاملہ عورتوں کو ان گولیوں کا استعمال ہرگز نہ کرایا جائے۔ کیونکہ حمل ضائع ہونے کا اندیشہ ہے

اہلِ ہندوستانی شفاخانہ ۵۲ نئی دہلی آئی-اے ایل

گہری نیند کا لطف

سائنس کی حیرت انگیز ایجاد ویسٹن (WESTON) کسی سوتے یا جاگتے ہوئے کو سونگھا دیجئے وہ ایک گھنٹہ کے لئے گہری نیند سو جائیگا اور ہلانے اور جلانے سے بھی وہ نہ جاگے گا قیمت صرف دو روپیہ (عہ) محصول ڈاک آٹھ آنہ (۸) اگر ایک گھنٹہ سے پہلے جگانا ہو تو ریکشن (RACTION) سونگھا دیجئے قیمت صرف دو روپیہ (عہ) کم مقدار یا نمونہ مفت نہیں مل سکتا۔ گارنٹی کی جاتی ہے کہ ویسٹن یا ریکشن دل کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاتی

ایسٹرن آرٹس اکاڈیمی ۴۵ ڈی دہلی

ڈاک کے ردی ٹکٹ

آپ کیسے نا معقول ہیں جب تک آپکو یہ معلوم نہ ہو کہ ٹکٹ کس طرح اکٹھے کرنے چاہئیں اور ان سے کس طرح روپے کمائے جا سکتے ہیں اور معمولی قیمت والا ایک ایک ٹکٹ ہزاروں روپیہ میں کس صورت میں فروخت ہو سکتا ہے ان تمام معلومات کے لیے ہماری کتاب ردی ٹکٹوں میں دولت کا انبار رجسٹرڈ منگا کر پڑھئے۔ اس کتاب کی خوبیوں سے متاثر ہو کر لالہ دینو داس صاحب سپرنٹنڈنٹ اکاؤنٹس [illegible] مسٹر گوبند سنگھ صاحب سب رجسٹرار کلکٹری ضلع مین پوری۔ یو پی و دیگر متعدد اصحاب نے زبردست رائے کا اظہار کیا ہے۔ کتاب اردو ہندی۔ انگریزی تینوں زبانوں میں مل سکتی ہے قیمت صرف ایک روپیہ چار آنہ وی پی ایک روپیہ دس آنہ کا پڑیگا اس لئے منی آرڈر بھیجنے میں ۶ کا فائدہ ہے

جام کوثر آفس رجسٹرڈ دہلی ۲ آئی - ایل

دس ہزار روپیہ کی گھڑیاں مفت انعام

ہماری دوائی ہاکور رجسٹرڈ کے استعمال سے ہر جگہ کے بال بغیر تکلیف کے دور ہو جاتے ہیں جگہ ریشم کی طرح ملائم نرم اور خوبصورت ہو جاتی ہے قیمت فی شیشی [illegible] اس دوائی کو مشہور کرنے کیلئے ہر شیشی کے ہمراہ ایک عمدہ نفیس رسٹ واچ مفت بھیجی جاتی ہے۔ یہ گھڑی نہایت خوبصورت اور [illegible] اور خوبصورتی کی گارنٹی دس سال کی گارنٹی کا اقرار نامہ ہر گھڑی کے ساتھ بھیجا جاتا ہے ضروری نوٹ: مال نا پسند ہونے پر قیمت واپس کر دی جاتی ہے تین شیشی دوائی کے خریدار کو محصول ڈاک معاف اور تین عدد گھڑیاں مفت انعام۔ ایک یا دو شیشی کے خریدنے پر ڈاکخرچ ۱۱ر الگ دینا پڑیگا۔ ملنے کا پتہ۔ **ایسٹرن اکاڈیمی ۴۵ - آئی - ایل دہلی۔**

NATIONAL MUSLIM UNIVERSITY
کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
L. C. L. 1.

For Favour of Review & Exchange

ماہنامہ

اضطراب

لکھنؤ

دفتر
جاپلنگ آرٹ
نظیر آباد۔ لکھنؤ

چندہ سالانہ ۲ عہ
معاونین سے صہ
فی پرچہ ۳ ر

جلد نمبر ۱
شمارہ نمبر ۲

صفحہ	مضمون	مضمون نگار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۲	مشاہدات	کامل جونپوری	پاپی	ملک سلمان الارشد فاروقی	۲۰
۳	نوائے اثر	اثر لکھنوی	اضطراب عالم	عشرت علی صدیقی	۲۴
۴	بکھرے ہوئے پھول	ماہر القادری	عرفان تغزل	مجذوب دہلوی	۲۵
۵	دیوی حیات	جوش ملیح آبادی	بھوک	شفیق بالو	۲۶
۶	ہم کیا بولیں	ڈاکٹر محمد حامد فاروقی	زندگی	نشتر سندیلوی	۲۹
۸	آنسو۔ لمعات	مسعود اختر جمال	انتقام	حاتم طائی	۳۰
۹	؟	سلام مچھلی شہری	مکتبہ جامعہ	ادارہ	۳۱
۱۰	یہ تمہاری بھول ہے	شکیل صدیقی	مسلم سے خطاب	کامل رشید میوی	۳۹
۱۱	شاعر کا سجدہ	سروش ملیح آبادی	مذہب	نسیم سندیلوی	۴۰
۱۲	امانت	الیاس ردولوی	ہندوستانی فلم	سید خورشید احمد	۴۳
۱۴	بادۂ شیراز	نخشب ردولوی	سینما کے پردہ پر	ادارہ	۴۵
۱۵	عورت	علی سردار جعفری	صدائے بازگشت	ادارہ	۴۶
۱۶	مصطفےٰ کمال اتاترک	جمیلہ بیگم گورکھپوری	ہماری نظر میں	مدیر	۴۷

ضروری اطلاع

(۱) اضطراب کے لکھنے والوں سے گزارش ہے کہ وہ اپنے مضمون ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں ورنہ مضمون کی اشاعت اسی مہینے میں نہ ہو سکے گی۔

(۲) مضامین صاف اور خوشخط ہونے سے کتابت اور طباعت میں آسانی ہوتی ہے اور اس طرح مضمون نگار صاحبان کو غلط چھپائی کی شکایت بھی نہیں ہوگی۔

(۳) دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیے۔ ورنہ تعمیل میں دیر لگے گی۔

(۴) مضمون کی واپسی کے لیے ایک آنہ کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

(۵) نمونہ کا پرچہ مفت نہیں بھیجا جائے گا۔

منیجر

اضطراب

جلد ۱ اگست سنہ ۱۹۴۰ء نمبر ۲

اداریے

ہم اور آپ

یہ ہمارا دوسرا پرچہ ہے

اسی کی ترتیب میں جمیل مسعود اختر جان صاحب سے بہت مدد ملی ہے۔ ہم جمال صاحب کو ادارہ کی شرکت پر مبارکباد دیتے ہیں۔ آئندہ پرچہ سے آل صاحب نظم کے حصے کے نگراں رہیں گے۔ ہمیں خوشی ہے کہ انھوں نے ہمارا ہاتھ بٹایا اور ہم ان سے امید کرتے ہیں کہ وہ بھی ہماری ہی طرح پرچہ کے مفاد کے لیے کوشاں رہیں گے

پچھلا پرچہ بہت مقبول ہوا ہم نے اس پرچہ کی ترتیب میں بھی حتی الامکان کوشش کی ہے اور ہماری برابر یہی کوشش رہے گی کہ پرچہ کو کسی طرح بہتر سے بہتر بنائیں۔

ہم ان لوگوں کے خلوص کے شکرگزار ہیں جنھوں نے پرچہ کے متعلق اپنی صحیح رائے سے ہمیں آگاہ کیا

پرچہ کے لیے جن لوگوں نے خاص مضامین لکھے اور جو جگہ کی تنگی کی وجہ سے اس اشاعت میں شائع نہ ہو سکے ہم ان سے معافی چاہتے ہیں

اس مرتبہ مجبوراً دو صفحہ [illegible] کے کم کر دیے گئے ہیں اور اشتہارات بھی زیادہ نہیں لیے گئے لیکن اس پر بھی ہم اس پرچہ میں [illegible] نہ چھاپ سکے۔ آئندہ ماہ سے ہمارا ارادہ پرچہ کا حجم بڑھانے کا ہے اور اس وقت ہمیں امید ہے کہ ہم اپنے معاونین [illegible] کے سامنے [illegible] پیش کر سکیں گے

پرچہ کا معیار ابھی خود ہماری منشا کے مطابق نہ ہو سکا۔ لیکن اس کے لیے مضمون نگار اصحاب کی توجہ کی خاص ضرورت ہے۔ اس کی رجسٹریشن کے لیے درخواست دے دی گئی ہے لیکن ابھی پرچہ کی اشاعت اور خریداری کے لیے ہمارے معاونین کی کوشش ضروری ہے ——

لکھنؤ — [illegible]

مشاہدات

میں اکثر بیٹھ کر پہروں اسی پر غور کرتا ہوں
کہ آخر کس لیے بگڑا ہوا ہے نظم دنیا کا
کسی کے واسطے سیم و جواہر کے خزانے ہیں
کسی کو پیٹ بھر دانا بھی کھانے کو نہیں ملتا
کسی کی کٹ رہی چین سے آرام سے سکھ سے
سسکتا ہے بلکتا ہے دکھوں سے کوئی بیچارا
میسر ہیں امیروں کے لیے ایوان شاہانہ
غریبوں کو مگر ٹوٹا سا چھپر تک نہیں ملتا
خدا ہے ایک دونوں کا مجھے تسلیم ہے کامل
مگر ان کے مقدر میں ہے آخر فرق کیوں اتنا
جہاں تک سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں
یہ کیسا مسئلہ ہے جو سمجھ ہی میں نہیں آتا
نظر پڑتی ہے لیکن جب کسی ایوانِ عشرت پر
خیال آتا ہے مجھ کو ملک کے باغی جوانوں کا
حریفِ حال و مستقبل ہیں یہ ماضی کی تعمیریں
نظام زندگی ان کے سہارے چل نہیں سکتا
ہمیں نظم فرسودہ بدلنے کی ضرورت ہے
ہوس کے دیوتا کا سر کچلنے کی ضرورت ہے

کامل جونپوری

نوائے اثر

خان بہادر نواب مرزا جعفر علیخاں صاحب اثرؔ لکھنوی
ایم-بی-ای- اڈیشنل کمشنر- الہ آباد

تصور میں تیرے سحر ہو رہی ہے — پری نور ساگر میں منہ دھو رہی ہے
بایں نازنینی و ناز آفرینی — ستم ہے کہ مشقِ ستم ہو رہی ہے
محبت، محبت کی بھوکی محبت — تمناؤں کی جان کو رو رہی ہے
"حقیقت" کہ اوہام میں گھر گئی تھی — بحمد اللہ آزاد پھر ہو رہی ہے
دمکتے ہوئے اُنکے عارض جو دیکھے — سحر غازہ رخسار سے دھو رہی ہے
ہوا ختم پھولوں کا عہدِ جوانی — وہ رنگت رہی ہے نہ خوشبو رہی ہے
دمِ خواب ہے دستِ نازک جبیں پر — کرن چاند کی گود میں سو رہی ہے
کہاں اُنکے چہرے کی رنگیں صباحت — شبِ ماہ بھی گو دُلہن ہو رہی ہے
جب اتنی بسر ہو گئی ہنستے روتے — بسر وہ بھی ہو جائے گی جو رہی ہے
مسرت کے تو راز سے بے خبر ہے — مسرت کو تیری ہوس کھو رہی ہے

اثرؔ خانقاہوں میں کیا ڈھونڈھتے ہو
پرستش "خرابات کی" ہو رہی ہے

مرسلہ - اقبال صفی پوری

گلدستۂ نشاط

ہندوستان کے مشہور ہر دلعزیز ادبا و شعرائے کرام کے مضامین نظم و نثر کا بیش بہا دلگداز دلچسپ اور سبق آموز مجموعہ ہے۔ جسے ہندوستان کے ہر دلعزیز ادیب حضرت عادل رشید میوئی کی شادی خانہ آبادی کے موقع پر بطور تحفہ پیش کیا گیا ہے۔ اپنی پہلی فرصت میں بذریعہ ڈاک پانچ آنہ (۵/) کے ٹکٹ ارسال فرما کر گلدستہ نشاط جیسے گرانمایہ مجموعہ کو حاصل کیجئے —

اپنی پہلی فرصت میں آرڈر دیجئے

منیجر "شاہد" ویکلی گلشن محل لیڈی جمشید جی روڈ ماہم بمبئی نمبر ۱۶

(خاص "اضطراب" کے لئے)

بکھرے ہوئے پھول

جناب ماہر القادری صاحب

—— گلاب گلقند بن کر میٹھا ہو جاتا ہے، مگر گلاب نہیں رہتا۔

—— سپاہی کا فرض تلوار کی دھار اور سنگین کی نوک پر ادا ہوتا ہے۔

—— سنیما کے مناظر بہت خوشنما ہوتے ہیں کاش! لوگوں کو معلوم ہوتا کہ آنکھوں کے راستہ سے بھی جوانی لوٹی جا سکتی ہے!

—— دوشیزگی، اُس کلی سے بھی زیادہ معصوم اور لطیف ہوتی ہے، جسے تتلی کے ہونٹوں نے بھی نہ چھوا ہو۔

—— قمقموں اور فانوسوں سے اینٹ پتھروں کے بنے ہوئے مکان روشن ہو سکتے ہیں، مگر دلوں کے حجروں میں اُجالا نہیں ہو سکتا۔ خوب کہا اقبال رحمہ نے:-

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نُور، دل کا نُور نہیں

—— "تھوڑا تفکر" اور "بہت زیادہ عمل" — انقلاب و تعمیر کی بنیاد ہیں۔ صرف سوچنے اور غور کرنے سے، راستہ کی ایک ٹھیکری بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہو سکتی۔

—— جب دلیلیں ختم ہو جاتی ہیں، تو آدمی گالی گلوچ کے اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آتا ہے۔

—— ظلم کی نگاہ میں "آنسو" بھی بغاوت ہے اور مسکراہٹ بھی "قانون شکنی"!

—— موت کا خوفناک پنجہ بادشاہ کے حلقوم اور فقیر کے گلے میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔

—— خدا کا انکار، سب سے بڑی نادانی ہے۔ حقایق اور مسلمات کے انکار کو آزادی فکر سمجھنا "جہلِ مرکب" ہے بلکہ اس سے بھی بڑھکر!

—— قوموں کی تاریخ، مورخ کے قلم سے نہیں تلواروں کی نوکوں سے لکھی جاتی ہے۔

—— اسلام اور انسانیت، ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

—— اگر "دانائی" مول ملتی تو سرمایہ دار سب سے زیادہ عقلمند ہوتے۔

—— بچہ کی مسکراہٹ ایک کھلونے میں خریدی جا سکتی ہے۔

—— جوانی ایک ایسی چٹان ہے جس میں ایک طرف دہکتی ہوئی آگ اور دوسری طرف متلاطم سمندر ہے۔

—— غلاموں کے قہقہے بھی، آزاد کے آنسو کی برابری نہیں کر سکتے۔

—— عورت کے رخساروں میں حیا کی سرخی، دنیا کی سب سے زیادہ حسین اور دلکش چیز ہے

(طبعزاد)

دیدنی حیات

از حضرت جوش ملیح آبادی

پہلو میں تابِ حسنِ جواں دیدنی حیات
لو چراغِ خلوتیاں دیدنی حیات
کشتی رواں ہے نغمۂ ساقی کی لے کے ساتھ
موجِ خرامِ آبِ رواں دیدنی حیات
دم سازِ ابر و باد ہے رندانہ بانکپن
طرفِ کلاہِ پیرِ مغاں دیدنی حیات
آرائشوں کی فکر نہ زیبائشوں کا ہوش
وارفتگیٔ لالہ رخاں دیدنی حیات
حسنِ جواں شرابِ کہن سازِ برشگال
عشرت سرائے بادہ کشاں دیدنی حیات

مختصر افسانے — **آغاز خیال** — مختصر افسانے

"الحمد اس آواز کے جو برابر ہمارے کانوں میں پڑ رہی ہے کہ افسانہ صرف تفریح اور وقت گذاری کی چیز ہے، ہم اسے زندگی سے ملا کر دیکھنے اور نتیجہ نکالنے لگتے ہیں۔ کون ہے جس نے افسانہ پڑھتے وقت اپنے دماغ کے تمام خانے بند کر لئے ہوں، دلگرفتہ نہ ہوں اور افسانہ کو محض افسانہ سمجھ کر چھوڑ دیا ہو، کون ہے جسے افسانے کے ایک نہ ایک کردار سے ہمدردی نہ پیدا ہو گئی ہو۔" (ماخوذ از تبصرہ) سید احتشام حسین صاحب رضوی۔ "آغاز خیال" مسٹر نسیم سندیلوی کے بارہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے، قیمت ۸ر

منیجر "اضطراب" جاپلنگ مارٹ نظیر آباد لکھنؤ

ہم کیا بولیں؟

جناب ڈاکٹر محمد حامد صاحب انصاری ایم اے پی ایچ ڈی بار ایٹ لا الہ آباد

جب میں ہندی اُردو کے موجودہ قضیہ پر غور کرتا ہوں تو بے اختیار یہ شعر ورد زبان ہو جاتا ہے

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم
ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبیست

اُردو نے یو۔ پی میں جنم لیا۔ دہلی، لکھنؤ، آگرہ اور الہ آباد کی آب و ہوا میں پروان چڑھی، میر انیس، ذوق و غالب نے اسی صوبہ میں اسے پروان چڑھا کر لگایا۔ پریم چند، چکبست اور رتن ناتھ سرشار نے گنگا جمنا کی ان ہی لہروں کے کنارے بیٹھ کر اس کی آبیاری کی، لیکن زمانہ کی نیرنگیاں دیکھئے کہ آج اسی آب و ہوا، اسی صوبہ اور اسی خاک سے اس کا بیج ناپید کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں آنکھیں تو یہ دیکھنے کو ترس رہی تھیں کہ جب ہندوستان کی باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھوں سے نکل کر ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں آئے گی اور ہمارے صوبہ کی اسمبلی کے ممبر بولنے کھڑے ہوں گے تو سننے والے ان کی زبان کو سن کر پکار اٹھیں گے۔ پریم چند، دیا شنکر نسیم اور مومن و آزاد کی بھولی بھولی زبان پھر برگ و بار لائیگی اور اسمبلی ہال ہمارے قومی اتحاد کی جیتی جاگتی تصویر نظر آئے گی۔ لیکن افسوس کہ زمانہ کا انقلاب ان امیدوں پر پانی پھیرتا نظر آرہا ہے اور آج ہم اس فکر میں مبتلا ہیں کہ اُردو کو اس کی جنم بھوم میں مٹنے سے کیسے بچائیں۔

چند روز ہوئے ہندی ساہتیہ سمیلن کا سالانہ اجلاس ہوا تھا۔ اس میں ہمارے صوبہ کے صدر مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن، اور ہمارے صوبہ کے وزیر تعلیم مسٹر سمپورنانند اور مسٹر سکسینہ جیسے ممتاز قوم پرست (؟) افراد شامل تھے اس میں جو بیز ٹیپ کے بند کے طور پر بار بار دہرائی جاتی تھی وہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ ـــــ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اس صوبہ کے رہنے والوں کی مادری زبان صرف ہندی ہے۔ عدالتوں میں آج کل جو زبان رائج ہے وہ عوام کی زبان نہیں ہے اسے بدلنا چاہیے ملک بھر میں ذریعہ تعلیم صرف ہندی ہو وغیرہ وغیرہ۔

اس سمیلن کے اجلاس میں ہندی کی حمایت اور اُردو کی مخالفت میں جو جارحانہ اور جنگجویانہ تجویزیں پاس کی گئیں ان کو یہاں نقل کرکے میں خواہ مخواہ قارئین کو بدمزہ کرنا نہیں چاہتا البتہ اپنے صوبہ کے صدر اعظم مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن کی تقریر کے اس حصہ کی طرف ہلکا سا اشارہ کئے دیتا ہوں جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ ہندی کو ذریعہ تعلیم بنانے سے قبل ہمیں چاہیئے کہ اس کے لیے راستہ صاف کریں، میدان تیار کریں اور فضا ہموار کریں تاکہ آہستہ آہستہ وہ دن بھی جلد آئے جب ہم دفتری، عدالتی اور سرکاری تمام کاروبار صرف ہندی میں کر سکیں۔

اُردو ہندی کے قضیہ میں عجیب عجیب لفظی بازیگریوں اور منطقی مغالطوں سے کام لیا جاتا ہے ان ہی میں سے ایک ہندوستانی کی جدید اصطلاح بھی ہے۔ ہندی کے حامی حسب ضرورت موقع محل کی مناسبت سے کبھی ہندی اور اُردو کو ایک ہی زبان کے دو نام قرار دیتے ہیں کبھی اُردو کو ہندی کی شاخ بتلاتے ہیں، کبھی ہندی اُردو دونوں کو ہندوستانی میں ضم کر دیتے ہیں لیکن چالاک بازیگر کی طرح جب ان تمام بحثوں سے باہر آتے ہیں تو اُن کی زبان پر وہی ہندی ہوتی ہے جسے ہندی کے بجائے سنسکرت

کہنا زیادہ موزوں ہے۔

میں پرشوتم داس ٹنڈن اور بعض دیگر حضرات کا کافی احترام کرتا ہوں، اور اُن کی ذات کے ساتھ مجھے جو پُرخلوص دوستانہ وابستگی ہے اُسے مکدر کرنا نہیں چاہتا لیکن اس کے باوجود میں اُن کے اس عمل کی کسی طرح تائید نہیں کر سکتا جو اُردو ہندی کے موجودہ جھگڑے کے سلسلہ میں انھوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم زبان کے مسئلہ کو ایمانداری کے ساتھ سوچنے کے بجائے فرقہ وارانہ نکتوں پر سوچتے ہیں۔ زبان ایک لطیف چیز ہے لیکن افسوس کہ ہم نے اسے سیاست کی کانٹوں بھری وادی میں کھینچ کر اس کا حلیہ بگاڑنا شروع کر دیا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس وقت یہ مسئلہ اتنا اہم اور نازک ہرگز نہ بنتا۔

آج ہندی کی حمایت میں جو لوگ آواز بلند کر رہے ہیں، وہ اپنے رویہ میں اتنے شدید ہیں کہ کسی طرف سے ذرا سی لچک بھی ان میں نہیں پائی جاتی۔ انھیں اصرار ہے کہ زبان کا نام بھی ہندی ہو، رسم خط بھی دیوناگری ہو، الفاظ بھی دیوبانی ہوں۔ اور انداز بیان بھی وہی ہو جس سے آج تک کان آشنا نہیں۔

آج امیر خسرو، ملک محمد جائسی اور عبدالرحیم خان وغیرہ کے حوالے دے دے کر ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ جس طرح وہ ہندوستان کی زبان کو ہندی کہتے تھے اسی طرح تم بھی اُردو کے بجائے اسے ہندی کہو۔ نیز جس قسم کی وہ زبان لکھتے تھے ویسی ہی تم بھی لکھو گویا ہمیں یہ تلقین کی جاتی ہے کہ ایسی زبان لکھیں اور بولیں:-

چو شمع سوزان، چو ذرہ حیران، ہمیشہ گریاں بہ عشق آں مہ
نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں، نہ آپ آئیں نہ بھیجیں پتیاں (خسرو)

ہم سے کہا جاتا ہے کہ "پچھلے زمانہ کی طرف لوٹو" کیسی حیرت انگیز نصیحت ہے! سوال یہ ہے کہ اگر اس نصیحت کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر زبان ہی پر کیا منحصر ہے ہمیں ہر چیز میں آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی طرف لوٹنا چاہیے میں پوچھتا ہوں کیا تم کوئی ایک ایسے انگریز کا نام بتلا سکتے ہو جو یہ کہے کہ ہمیں موجودہ انگریزی کو چھوڑ کر اسپنسر، چاسر، بابین، جانسن اور ملٹن کی زبان اختیار کرنی چاہیے؟ کیا کوئی ایک ایرانی ایسا مل سکتا ہے جو آج کل کی ایرانی زبان کے بجائے عہد قدیم کی پہلوی کو ترجیح دیتا ہو؟ کیا کوئی ایک اٹالین ایسا دکھا سکتے ہو جو پرانی لیٹن کو اٹلی کی موجودہ زبان کی جگہ رائج کرنا چاہتا ہو؟ پھر یہ کیا مصیبت ہے کہ ہندوستان میں ہم سے یہ کہا جا رہا ہے کہ ہماری زبان نے صدیوں میں جو ترقیاں کی ہیں۔ انھیں بھول جاؤ صدیوں کی مدت میں اس میں جو کانٹ چھانٹ ہوئی ہے اس کو فراموش کر دو اور صدیوں کی کوششوں سے زمانہ کی ضروریات کی بنا پر اس نے جو رنگ اختیار کیا ہے اُسے دماغ سے محو کر دو اور اب پھر نئے سرے سے صدیوں پہلے کی بھولی ہوئی اور مٹی ہوئی زبان کو لکھنا اور بولنا شروع کرو۔ بچہ بڑھ کر جوان ہو گیا مگر اب اصرار ہے کہ تو پھر پہلے کی طرح بچہ بن جا۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ نہ دیکھو کہ کیا ہے؟ بلکہ یہ دیکھو کہ کیا تھا؟ —— حیرت!

بہر حال سیاسی، اقتصادی و منافرت کی موجودہ تاریک فضا کے باوجود میں اب بھی مایوس نہیں ہوں، اسی تاریک فضا میں مجھے کچھ ایسی ہستیاں بھی نظر آتی ہیں۔ جن سے اُمید کی جھلک صاف طور پر نظر آتی ہے۔ یہی ہستیاں ہیں جنھیں موجودہ غبار آلود مطلع میں امید کے چمکتے ہوئے تارے سمجھنا چاہیے مجھے یقین ہے کہ شاید یہ فضا زیادہ دیر تک باقی نہ رہے گی، ہم چیزوں کو صحیح طور سے دیکھیں گے اور غلط باتوں پر اصرار کرنا چھوڑ دیں گے۔ خدا کرے کہ یہ توقع غلط ثابت نہ ہو!

"آنسو"

جناب مسعود اختر جمال صاحب

کچھ تو ہوتا ان آنسوؤں میں اثر
داغ ہی میرے دل کے دھو دیتے

یا ترے گیسوئے پریشاں میں
موتیوں کی لڑی پرو دیتے

یا بڑھا کر یہ بے خودی میری
یاد بھی تیری دل سے کھو دیتے

اور یہ بھی نہیں تو کاش جمال
غم کے سیلاب میں ڈبو دیتے

لمعاتِ جمال

نقاب اُٹھا کے وہ جلوہ دکھا دیا تو نے
مجھے بھی میری نظر سے چھپا دیا تو نے

یہ تیرا حسنِ کرم ہے۔ تری نوازش ہے
کہ مجھکو عشق مجسّم بنا دیا تو نے

نظر سے چھیڑ کے مضرابِ عشق و سازِ وفا
تمام ہستیٔ دل کو جگا دیا تو نے

مری خطا ہے یہی میں تجھے بھلا نہ سکا
ترا کرم ہے کہ مجھکو بھلا دیا تو نے

نظر کے ایک اشارے سے موجِ ہستی کو
تجلیات کی رَو میں بہا دیا تو نے

چمن میں نرگسِ مخمور و جلوۂ گل کو
مری نگاہ۔ مرا دل بنا دیا تو نے

مری نظر میں غمِ دو جہاں کو اے ساقی
مئے نشاط پلا کر بڑھا دیا تو نے

جمال

(خاص "مضراب" کیلئے)

؟

(جناب سلام صاحب مچھلی شہری)

سب ہی یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ خیام کی رباعیوں اور ... ورڈز ورتھ (حالانکہ یہ بہت مشہور شاعر نہیں) کی نظمیں ان دونوں میں وہ کسے زیادہ پسند کرتا ہے کیوں کہ یہی دو چیزیں اس کے مطالعے میں دیکھی جاتی تھیں۔

سب ہی یہ جاننا چاہتے تھے کہ اس کی ذاتی نظموں میں رومان و موسیقی اور شراب و کباب کے تخیل پائے جاتے ہیں یا وہ رنج و غم اور موت کے مناظر بھی صرف کھینچ لیتا ہے کیوں کہ وہ ہر قسم کی نظمیں لکھتا ہوا پایا جاتا ہے

احباب اس کے متعلق یہی معلوم کرنا چاہتے تھے اور انہیں بھی کوئی شک نہیں کہ اس معاملے میں جمال کی زندگی ایک معمے سے کم نہ تھی۔

لیکن اب سب خوش تھے ان کو جمال کی عزیز ڈائری مل گئی تھی۔

کتنی حیرت کی بات ہے یہ ڈائری بالکل سادی تھی نظموں کے بدلے صرف پہلے صفحے پر ایک مختصر سی عبارت تھی جیسے کسی انگریزی یا فارسی نظم کا ترجمہ

"پھر وہ اسے اتنا عزیز کیوں رکھتا ہے؟"

"شاید کچھ پاگل ہو گیا ہے" دوستوں نے ایک معنی خیز تبسم کے ساتھ ڈائری میز پر پھینکدی۔ "مگر یہ عبارت ہے کیا؟" منظر نے ڈائری اٹھالی۔

"خیام! تم اپنے گناہوں کے لئے اتنا افسوس کیوں کرتے ہو۔؟

اس توبہ اور فریاد سے کیا فائدہ؟

ان پر خدا کی رحمت نہیں ہو سکتی جنھوں نے کبھی گناہ نہیں کیا ہے۔

رحمت صرف گنہگاروں کے لئے ہے ———

پھر افسوس کیسا؟

"حسین ساقی اٹھ اور اپنا رنگین پیالہ شراب سے بھر دے کیوں کہ میں اس سے دنیا کی تمام مصیبتوں کو دھو ڈالنا چاہتا ہوں"

(خیام)

"دیکھو میں ٹھیک کہتا تھا جمال ایک رومانی شاعر ہے وہ صرف حیات اور شراب و شباب کا پیغام دیتا ہے" منظر نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر نوٹ بک میز پر پھینکدی۔

اب دوستوں اور تمام ادبی حلقوں میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ جمال ایک شاعر شباب ہے وہ حوادث مصیبت اور موت کا افسردہ اور خشک پیام نہیں دیتا۔

جمال کی عمر بیس یا اکیس برس سے زیادہ نہیں ہے مگر وہ دن بدن گھلتا اور کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ لوگ اسکی نظموں میں حسن و شباب کی کیفیت محسوس کرتے ہیں مگر اس کے لئے خود اس کی نظمیں دیمک ثابت ہوتی ہیں۔

کچھ دن سے جمال بیمار ہے ———

آج زندگی کی آخری رات ہے۔

"اچھا میں نے اس ڈائری میں کچھ لکھا ہی نہیں"

جمال مسکرایا۔

روح کی طرح سنجیدہ اور سفید ہاتھ قرطاس پر متحرک تھے

"... ایسی ہی گھڑی ہے جو شباب کی مسرت اور ان سب چیزوں کو چھین لیتی ہے جو ہمارے پاس ہیں اور ہمیں زمین ... کے سپرد کر دیتی ہے۔

جب ہم دنیا کی سیر اچھی طرح کر لیتے ہیں تو وہ زندگی کے فسانے کو ناپید کر دیتی ہے۔
لیکن اسی زمین، اسی قبر اور اسی خاک سے میرا خدا مجھے پھر اٹھائے گا۔
مجھے یقین ہے۔۔۔ (والٹر ریلے)

دوسرے دن احباب جمال سے ملنے آئے۔
وہ مر چکا تھا۔

اس کی عزیز ڈائری اب بھی میز پر پڑی تھی۔ منتظر نے ڈائری اٹھائی۔ سب سے آخر میں والٹر ریلے کی نظم تھی۔۔۔

"زمانہ ایسا ہی بے رحم ہے جو شباب و مسرت اور ان چیزوں کو چھین لیتا ہے جو ہمارے پاس ہیں۔۔۔"

اور درمیان کے تمام صفحے خالی تھے جن پر "؟" کے نشان بنے تھے۔

ہم لوگ گھر آ رہے تھے۔۔۔
میں نے منتظر سے متواتر کئی سوال کئے؟۔۔۔
کیا وہ خالی صفحے پھر بھرے جا سکتے ہیں؟
وہاں کیا لکھا جا سکتا ہے؟
جمال کو والٹر ریلے کی یہی نظم کیوں پسند آئی؟
اس نے ڈائری میں کچھ لکھا کیوں نہیں وہ تو شاعر تھا؟
وہ شباب ہی میں کیسے مر گیا؟
کیا اس کی زندگی مسرت بخش نہیں تھی؟

ادب لطیف

یہ تمہاری بھول ہے۔۔۔

جناب سلیم صاحب صدیقی

میں جانتا ہوں کہ تم ایک پیکر شعر و نغمہ ہو کائنات تمہارے گیتوں کی سحر آفریں دھن پر رقصاں ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم ایک مجسمہ حسن و جمال ہو۔ فضائیں تمہارے تبسم کی بے پناہ کشش میں ڈوبی ہوئی ہیں ۔۔۔ اور میرے سینے میں ایک حساس دل بھی ہے۔ لیکن ۔۔۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ملک کے نوجوان اسوقت فوجی بینڈ کی گت پر ایک جنگی ترانہ گا رہے ہیں۔ کیا تمہیں اس کی خبر نہیں کہ افلاس زدہ کسان اپنے ملک کی حفاظت کے لئے میدان کارزار کی طرف برابر آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ دیکھو فضا میں مزدوروں کا سرخ جھنڈا لہرا رہا ہے

تم مجھے روک رہی ہو ۔۔۔ نہیں ۔ نہیں ۔ یہ کبھی نہ ہوگا ۔۔۔ خدا حافظ ۔ مجھے تم سے ملنے کی فرصت نہیں ۔ تم یہ سمجھتی ہو کہ میں اس کشمکش سے دامن چھڑا کر تمہارے دامن میں پناہ لونگا۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں ان مصائب کو بھول کر تمہاری یاد کی لطافتوں سے دل کی جنت بسا لوں گا۔ لیکن میری دلنواز یہ تمہاری بھول ہے۔

شاعر کا سجدہ

(جناب شرف احمد خانصاحب سرخوش)

عبودیت سے جو ایک روز قلب گھبرایا
تو نقشِ بندگی دل سے مٹا دیا میں نے

گلا کے آہنی زنجیر آدمیت کی
نشیمنِ بشریت جلا دیا میں نے

بجھا کے محفلِ ہستی میں ہوش کا فانوس
جنوں کی شمع کو رہبر بنا دیا میں نے

سنہرے ابر سے ٹپکا کے زندگی کی شراب
ضمیرِ وقت کو بھی تھرتھرا دیا میں نے

شفق کی مے کو ستاروں کے جام میں بھر کر
صنم کدے میں قمر کے بہا دیا میں نے

بلند اتنا ہوا میرا شہپرِ پرواز
چراغِ شمس و قمر جھلملا دیا میں نے

لرزتے رہتے ہیں جس جا پہ شہپرِ جبریل
وہاں سے بھی قدم آگے بڑھا دیا میں نے

ستارہ اک چمک اٹھا ضمیرِ یزداں میں
حریمِ قدس کا پردہ اٹھا دیا میں نے

جبیں پہ اپنی ستاروں کا تاج کج کر کے
الوہیت کا چمن جگمگا دیا میں نے

نہ دیکھی میں نے وہاں جب شعاعِ برقِ جمال
تو پھر نگاہ کا پردا جلا دیا میں نے

رُو پہلے نور نے حلقے میں لے لیا مجھ کو
سرخوش سجدے میں سر کو جھکا دیا میں نے

امانت

جناب الیاس احمد صاحب ردولوی

رات آدھی گذر چکی ہے۔ چودھویں کا چاند ہے۔ بے پنّے آسمان سے اپنی شعاعوں کے نورین کے خم لنڈھا رہا ہے ساری کائنات ایک خواب و مدہوشی معلوم ہوتی ہے۔ نفرتیہ پارک کی سحر آگیں خاموشی میں دفعتاً ایک موٹر کی آواز گونجی اور چند لمحوں بعد ایک کار وکٹوریہ کے مجسمے کے بالکل سامنے ٹھہر گئی۔ اور اس میں سے ایک شکیل نوجوان اور ایک بہت حسین لڑکی اترکر پاس والے سبزے پر جا بیٹھے

سریندر۔ کہو سروج تصویر کیسی رہی۔

سروج۔ نہایت اچھی حقیقتاً یہ ایم۔ بی۔ ایم کا شاہکار کہی جانے کے لئے مستحق ہے۔ مگر چھوڑو ان باتوں کو مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کہنی ہے۔

سریندر۔ تو کہو میں سننے کے لئے بالکل آمادہ ہوں

سروج۔ سریندر۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ مجھ میں ماں بننے کے آثار پیدا ہو چکے ہیں، مجھے اس کی کچھ تشویش نہیں لیکن ڈر اس کا ہے کہ کہیں عشق اور امتحان کا تصادم نہ ہو جائے۔

سریندر۔ کیوں؟ کیا دیوالی کی طرح جوت ہو رہا تھا، سروج یہ بڑی بری خبر ہے تمھیں ماں ہرگز نہ بننا چاہیئے۔

سروج۔ کیوں؟

سریندر۔ اس لئے کہ اس سے ہمارا تمھارا معاملہ دنیا پر آشکارا ہو جائے گا اور اس میں ہم دونوں کی سخت رسوائی ہے۔

سروج۔ سوال تو یہ نہیں کیا سوال ہے تم اپنے پتاجی سے سارے واقعات کہکر مجھ سے شادی کرنے کی اجازت حاصل کر لو۔

سریندر۔ کیوں؟ ہوا! لیکن تم تو جانتی ہو۔ پتاجی ابھی میری شادی کرنی نہیں چاہتے۔ ان کی خواہش ہے کہ ابھی ایم۔ اے کرنے کے بعد ولایت جاؤں۔ اور ڈاکٹریٹ حاصل کروں پھر کہیں شادی ہوگی۔

سروج۔ تم ان سے کہو تو سہی۔ وہ واقعات سے آگاہ ہو جائیں گے اور انھیں معلوم ہو جائیگا کہ ہم تم ایک دوسرے کو ایک عرصہ سے چاہتے رہے ہیں تو وہ ضرور شادی کی اجازت دیدیں گے۔

سریندر۔ نہیں سروج۔ وہ کبھی بھی اس کی اجازت نہ دیں گے۔ میں ان کی طبیعت سے خوب واقف ہوں اور اتنا ہی نہیں۔ وہ اس واقعہ کو اپنی پوزیشن پر ایک سخت دھکا بھی متصور کریں گے۔ لہذا میری بات مانو میں کل تمھیں یونیورسٹی میں ایک دوا لادوں گا۔ تم اسے کھا لینا اور بس۔

سروج۔ میں ایسا ہرگز نہ کروں گی۔ تمھیں شاید باپ بنتے ڈر لگتا ہے! ——؟

سریندر۔ ہاں۔ حقیقت تو یہی ہے کہ نہ میں ابھی باپ بننے کو تیار ہوں اور نہ تمھیں ماں بننے دینا چاہتا ہوں۔

سروج (جس کے چہرے پر غصے کی سرخی دوڑ رہی ہے) تم باپ بنو نہ بنو۔ لیکن مجھے ماں بننے میں کوئی عار نہیں ہے

سریندر۔ دیکھو سروج۔ بچپنے کی باتیں نہ کرو۔ اس سے تم بھی بدنام ہوگی اور میں بھی۔ آخر تم دوا استعمال کرنے سے

انکار کیوں کرتی ہو۔

سروج۔ میں اپنے آنے والے بچے کی قاتل کبھی نہوں گی۔ اس کے علاوہ میں اسے اپنی اور تمہاری سچی محبت کا حاصل سمجھتی ہوں۔ گناہ کی پیداوار نہیں۔

سریندر۔ لیکن یہ تم سمجھتی ہوتا؟ دنیا تو ایسا کبھی نہ سمجھے گی۔

سروج۔ دنیا نہ سمجھے گی تو کیا ہوا۔ میرا ضمیر تو مجھے ناپاک نہ کہے گا۔

سریندر۔ سروج۔ ضمیر کے نشتر اتنے تیز نہیں ہوا کرتے۔ جتنے دنیا والوں کے تمہیں ابھی شاید اسکا تجربہ نہیں ہوا۔

سروج۔ (غصے سے کھڑی ہو کر) تو تم چاہتے ہو کہ میں دوا سے بچے کو ضایع کر دوں اور اپنے حاصل محبت کو حاصل معصیت بنا ڈالوں۔ یہی نا۔

سریندر۔ سروج محبت اور معصیت میں بڑا فرق ہے اور پھر کچھ بھی نہیں محبت اپنی ... لباس اوقات معصیت کا روپ بھرتی ہے اور انکار چھپکتی ہے اور محبت کرنے والے اور دنیا والے محبت کی شکل میں کوئی تبدیلی نہیں پاتے لیکن جب کبھی محبت معصیت کا ایسا روپ پہن لیتی ہے جس کا علیحدہ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے تو محبت ایک "معصیت مستقل" بنکر رہ جاتی ہے۔ دنیا والوں کی نگاہ میں بھی اور محبت کرنے والوں کی نگاہ میں بھی سمجھو سروج! ایشور کے لئے سمجھو۔

سروج۔ دنیا والوں کی نگاہ میں محبت کی صورت مسخ ہو جاتی ہو گی۔ لیکن محبت کرنے والوں کی نگاہ میں وہ ہمیشہ بے داغ رہتی ہے بشرطیکہ محبت میں فریب کو دخل نہ ہو

سریندر۔ (گھڑی دیکھ کر) اف ایک بج چکا ہے۔ اب اسوقت تو اس مسئلہ کو زیادہ طول نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن میں پھر کہتا ہوں سروج کہ تم میری بات پر غور کرو اور کل یونیورسٹی میں مجھے بتانا۔

"دوسرے دن گیارہ بجے"

—— یونیورسٹی لائبریری کے سامنے والے سبزے پر سروج ایک عجیب رنجوری کے عالم میں ٹہل رہی ہے کل تک جو شوخ و نغمہ آج ایک مجسمہ حزن و یاس بن چکا ہے وہ بتا رہی ہے محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی اسے آواز دے رہا ہے وہ پیچھے مڑتی ہے اور سریندر کو لمبے لمبے قدموں سے اپنی طرف آتے دیکھتی ہے۔

سروج۔ کہو کیا کہنا ہے؟

سریندر۔ کہنا کچھ نہیں۔ میں وہ دوا لے آیا ہوں (کوٹ کی جیب سے ایک ... نکالتے ہوئے) یہ لو

سروج (خشمگیں انداز میں) میرا فیصلہ وہی ہے جو کل تھا۔ سنا تم نے میں دوا ہرگز نہیں پی سکتی۔

سریندر۔ سروج۔ انجام پر نظر کرو۔ تم یہ کیا کہہ رہی ہو ابھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا ہے خدانخواستہ دیر ہو گئی تو سوائے کف افسوس ملنے کے اور کچھ نہوگا۔

سروج میں کف افسوس کیوں ملنے لگی۔ میں نے کوئی ناروا حرکت نہیں کی ہے جس کے لئے مجھے منفعل ہونا پڑے ہاں —— اگر میں نے دوا کھا کر اپنی محبت کی نشانی کو فنا کر دیا تب البتہ مجھے پشیمان ہونا پڑے گا کیونکہ اسوقت میرا ضمیر مجھ سے کہے گا "سروج۔ تو قاتل ہے۔ تو بدکار ہے۔ تو نے محبت نہ کی تھی گناہ کیا تھا۔ سریندر! مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ماتما کے لئے مجھے میرے سرمایۂ محبت کو سرمایۂ معصیت سمجھنے پر مجبور نہ ..

سرنیدر۔ میں تم سے یہ کب کہتا ہوں کہ تم اسے سرمایۂ معصیت تصور کرو۔

سروج۔ لیکن اس حرکت کے معنی یہی ہوں گے۔ بچہ کو ضائع کر دینا میرے آسودہ گناہ ہونے پر دلالت کرے گا اور میں یہ کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ تم باپ بننے کو تیار نہیں ہو ——— میرا بچہ کیا کہلائے گا اور میں ——— لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں دنیا والوں کی نگاہ میں میں اس سے ضرور ذلیل ہو جاؤں گی مگر اپنی نگاہ میں نہیں۔

سرنیدر۔ تو پھر میں یہ سمجھ لوں کہ تم میری خواہش کو رد کر رہی ہو۔

سروج۔ ہاں تم یونہی سمجھ لو۔

سرنیدر۔ (گڑگڑاتے ہوئے) سروج اگر میری عزت کا نہیں تو میرے پتا ماتا کی عزت کا خیال کرو۔ اس سے میرے خاندان کی پشتہا پشت کی حاصل کی ہوئی آبرو جاتی رہے گی۔

سروج۔ تو یوں کیوں نہیں کہتے کہ تمھیں اپنی رسوائی کا خوف ہے۔ میرے ماتھے پر کلنک کا جو ٹیکہ لگنے والا ہے اس میں شاید تم اپنی تصویر دیکھتے ہوئے ڈرتے ہو۔ بولو

سرنیدر۔ نہیں۔ نہیں سروج میں تمھاری خاطر بھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سروج۔ (سرنیدر کی بات کاٹتے ہوئے) خاموش۔ میری خاطر داری تمھیں منظور ہوتی تو یہ صورت کبھی نہ پیدا ہوتی بہرحال تم اطمینان رکھو۔ میں تمھیں بدنام نہ ہونے دوں گی۔ کسی کو یہ نہ معلوم ہو سکیگا کہ بچے کا باپ کون ہے میں اپنے بچے کی قسم کھا کر وعدہ کرتی ہوں۔

(خاص)

بادۂ شیراز

جناب حکیم ابراہیم صاحب فخر دہلوی

وہ عشوۂ ترا سروِ گل اندام نہیں ہے
وہ جلوۂ مہتاب لبِ بام نہیں ہے

آئینۂ دلبر، دلِ ناکام نہیں ہے
اُف اپنی طرف رُوئے دلِ آرام نہیں ہے

جز بیخودیٔ عشق، مجھے کام نہیں ہے
جز ناز و فریاد کچھ آرام نہیں ہے

شیریں سخنی میں ترے ہونٹوں کے مقابل
گویا لبِ نے خندۂ صد جام نہیں ہے

دلبر کی اداؤں کا احاطہ نہیں ہوتا
ایسی بھی ہیں کچھ جنکا کوئی نام نہیں ہے

رخنے دلِ دیں میں تری مژگاں نے ہیں ڈالے
پھر بھی خلشِ اندیشۂ انجام نہیں ہے

اک جلوۂ بیرنگ سے ہے ربطِ نظر کو
نظارہ پریشان لبِ بام نہیں ہے

اے فخر نہیں درد محبت کے سوا کچھ
خاموش کہ احساسِ نظر عام نہیں ہے

عورت

جناب علی سردار صاحب جعفری

کیا ہوا اگر تیری رنگیں رہگذر سے دور دور
زندگی کے راستوں میں پیچ و خم کھاتا ہوں میں
تو نہ جانے کیوں سمجھتی ہے کہ تجھ کو بھول کر
اپنے احساسات کی دنیا میں کھو جاتا ہوں میں
میری خاموشی پہ اکثر تمتما اٹھتی ہے تو
تیری خاموشی کا لیکن راز پا جاتا ہوں میں
چاہتی ہے مجھ سے تو نسوانیت کا احترام
اور تری انسانیت کے زمزمے گاتا ہوں میں
آہ یہ تہذیب کا جادو۔ تمدن کا فریب
سوچتا ہوں جس قدر اتنا ہی شرماتا ہوں میں

"اک سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھی ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھی ہے تو"

اس نظام زندگی میں جس سے رسوا ہے حیات
تیری ہستی رقص عشرت کے سوا کچھ بھی نہیں
اپنے ہونٹوں کی حسیں گلنار محرابوں سے پوچھ
ان میں بوسوں کی حرارت کے سوا کچھ بھی نہیں
تیرے ابرو کے اشاروں میں ارادہ ہے نہ شوق
تیری آنکھوں میں شرارت کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ ترے ماتھے کا ٹیکا یہ تری زلفوں کے خم
کاروان رنگ و نکہت کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ ترے چہرے کا غازہ یہ ترے ہونٹوں کا رنگ
عشق کی نظروں کی دعوت کے سوا کچھ بھی نہیں
تیرے اعضا کی نزاکت تیرے پہلو کا گداز
مرد کے بستر کی زینت کے سوا کچھ بھی نہیں
میں یہ کہتا ہوں محبت زندگی کا درد ہے
تو یہ کہتی ہے محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
سوچتا ہوں اور اکثر سوچتا رہتا ہوں میں
کیا تری دنیا نزاکت کے سوا کچھ بھی نہیں
جذب کر لیتی ہے تجھ کو مرد کی جادوگری
تو کہ اک لمحے کی فرصت کے سوا کچھ بھی نہیں
اک نشاط آگیں کھلونا بنکے رہ جاتی ہے تو
جیسے تو سامان راحت کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ تکلف یہ تصنع یہ ادب یہ احترام
اک ہوس پرور سیاست کے سوا کچھ بھی نہیں

جب تلک تو خود نہ توڑے گی طلسم رنگ و بو
تیری قیمت ایک عورت کے سوا کچھ بھی نہیں

(خاص اضطراب کے لیے)

مصطفیٰ کمال اتاترک

محترمہ جمیلہ بیگم صاحبہ

کون ایسا شخص ہوگا جو مصطفیٰ کمال کی شخصیت سے واقف نہ ہوگا۔ غازی موصوف بیسویں صدی کے بہترین سپہ سالار، اعلیٰ مدبر، بڑے مصلح، اور بہت اعلیٰ درجہ کے سیاستداں تھے۔ آپکا وجود نہ صرف مسلمانوں کیلئے بلکہ تمام دنیا کے لوگوں کے لئے باعث فخر تھا۔ آپ نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ترکی کو یورپ کے چنگل سے بچایا۔ جہالت کو دور کیا ملک کے منتشر شیرازہ کو جمع کیا آپ کو اس مقصد کے لئے طرح طرح کے مصائب کا سامنا کرنا پڑا مگر اس اولوالعزم شخص نے صبر و استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا۔ جس ملک کو دنیا "مرد بیمار" یا "بیمار ترکی" کے نام سے موسوم کرتی تھی اسقدر طاقتور بنا دیا کہ بڑے بڑے اعظم کی بڑی سے بڑی سلطنت اس کے نام سے کانپنے لگیں۔ یورپ آپ سے اسقدر خوفزدہ تھا کہ آپ کو "گرے ولف" یعنی بھورا بھیڑیا کے نام سے پکارتا تھا۔ شہنشاہ جارج پنجم نے آپ کو گیلی پولی کی تاریخ کی ایک کاپی دی تھی جس پر مندرجہ ذیل الفاظ میں پیشکش تحریر تھی "دنیا کے سب سے بڑے کمانڈر۔ فیاض دوست۔ شریف دشمن سپہ سالار عالی غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے حضور میں اپنی دوستی کے ثبوت میں یہ کتاب ہدیہ پیش کرتے ہیں"

بیسویں صدی کا یہ سب سے بڑا انسان ۱۲ مارچ ۱۸۸۰ء کو پیدا ہوا تھا۔ ابھی پانچ ہی سال کی عمر تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ آپ کی والدہ نے اسقدر عمدہ تعلیم اور تربیت دی کہ آج دنیا ان کی مداح ہے آپکا نام صرف مصطفیٰ تھا۔ جب میٹرک پاس کرکے آپ نے ملٹری کالج میں داخلہ کرایا تو آپ کو دیکھتے ہی ایک مصری پروفیسر کے منہ سے نکلا کہ یہ لڑکا کسی دن دنیا میں کمال حاصل کریگا۔ جب سے آپ مصطفیٰ کمال کہلانے لگے۔

چونکہ بچپن سے آپ کے دل میں وطن کا خیال موجزن تھا۔ اسی وجہ سے آپ نے بغیر کسی قسم کی جھجک کے ملک میں اپنی تقاریر کے ذریعہ سے جوش پھیلانا شروع کیا۔ ترکی کے لیے یہ دور نہایت صبر آزما اور حوصلہ شکن تھا۔ ملک میں بیک وقت تین طاقتیں کارفرما تھیں۔

(۱) سلطان کی سازشی حکومت جسے ملکی فلاح و بہبود سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ سلطان کو صرف اپنی عیاشیوں کی فکر تھی۔ اور اس کے لئے وہ ہر ممکن تدبیر عمل میں لاتے تھے۔ انھیں حرم کی رنگ رلیوں سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ وہ عوام کی مصیبتوں پر نظر کرتے۔

(۲) غیر ملکی حکومتیں جن کی عدالتیں، ڈاکخانے اور پولیس کے محکمے الگ الگ قائم تھے۔

(۳) قوم کی خود ساختہ پارلیمنٹ کی قوت جو قانون کے ذریعہ عوام کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی تھی۔

ان طاقتوں کے علاوہ ایک طاقت اور بھی تھی جو خفیہ طریقے پر اپنا کام کر رہی تھی اور جس کا یہ مقصد تھا کہ موجودہ حکومت کو ختم کرکے ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی جائے لیکن عوام کی اس بڑھتی ہوئی کشمکش میں تعمیر سے زیادہ تخریب کا پہلو تھا۔ فوجی قوتوں کی زمام ایک جوشیلے سپہ سالار انور پاشا کے ہاتھ میں تھی جو ملک کے اندرونی مسائل سے نظر ہٹا کر یورپ کو فتح کرنے کے منصوبے سوچا کرتے تھے۔ سلطان کی بے راہروی سے ملک پر قرضے کا

انبار لدتا چلا جاتا تھا۔ جن کے سود کی ادائیگی بھی ناممکن نظر آتی تھی۔ جن غیر ملکی حکومتوں نے قرضہ دیا تھا انھوں نے ملک میں بیچارہ ماتیوں کے ذریعہ سازشوں کا ایک جال بچھا رکھا تھا اور وہ ترکوں کی جنگجویانہ اسپرٹ کو یکلخت ختم کردینا چاہتے تھے۔ اس ناگفتہ بہ دور میں مصطفےٰ کمال پاشا کا عروج واقعی ایک معجزہ ہے۔ انھیں صرف غیر ملکی حکومتوں سے ہی نہیں بلکہ خود اپنے ملک کی تخریبی طاقتوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اور آخر ش وہ کامیاب ہوئے۔

کمال کے آہنی ارادوں اور کامیابی کا راز سمجھنے سے پیشتر ہمیں پہلے اُن کی زندگی پر ایک سرسری نظر نظر ڈالنی چاہیے۔ موصوف بچپن ہی سے بلا کے ذہین واقع ہوئے تھے۔ اُن کے معلم ہمیشہ ان کے مداح رہتے۔ تعلیمی دور ختم کرکے آپ نے فوجی تعلیم حاصل کی جب آپ اٹھارہ سال کے ہوئے۔ اسی زمانے میں ترکوں اور یونانیوں سے جنگ چھڑ گئی۔ آپ نے اس میں شرکت کی۔ اور پہلی مرتبہ عملی جنگ کے تجربے حاصل کئے اس معرکہ میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد آپ نے قسطنطنیہ کی فوجی کالج میں داخلہ لیا اور وہاں کے امتحان میں اول رہے انھیں ایام میں آپ نے اطراف و جوانب میں کافی شہرت حاصل کرلی تھی بلکہ ان ترقیوں سے متاثر ہوکر خود سلطان نے ایک مرتبہ انھیں دربار میں بلایا اور شرف باریابی بخشا۔ جس کی وجہ سے عوام کی نظروں میں آپ کی عزت نظاہر بڑھ گئی۔ لیکن انھیں کیا معلوم تھا کہ ایک دن یہی شخص سلطان کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد خود اس ملک کی قسمت کا مالک بنے گا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد بائیس سال کی عمر میں آپ فوج میں لفٹنٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہاں سے آپ کی عملی زندگی کا اور قومی جدوجہد کا آغاز ہوتا ہے

ابتدا میں آپ نے وطن کے نام سے ایک ملکی انجمن قائم کی جس کی شاخیں دور و نزدیک پھیلتی رہیں اسی سلسلے میں آپ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ دو مرتبہ گرفتار ہوئے لیکن حکومت نے آپ کی سابقہ خدمات کا خیال کرکے رہا کردیا۔ اور اس انجمن کو خطرناک سمجھکر سلطان نے کمال کو بیروت بھیج دیا۔ اور اس کے بعد دمشق میں ایک فوجی دستہ کا کپتان مقرر کردیا۔ یہاں پر بھی موصوف اپنی کوششوں سے باز نہیں آئے۔ اور ترکوں میں انقلابی روح بیدار کرنے کے لیے ایک انجمن "فادرلینڈ" کے نام سے قائم کی اس میں کچھ فوجی افسر اور ترک سپاہی بھی شامل ہوگئے۔ اسی دوران میں روسیوں کی بغاوت فرو کرنے کے لئے مصطفےٰ کمال کو پھر جنگ میں حصہ لینا پڑا۔ اس مہم کو آپ نے اس بہادری اور قابلیت کے ساتھ سر کیا کہ وہاں کے واپسی پر حکومت نے آپ کو میجر کا عہدہ دیا۔ اب اس انجمن کی اشاعت بیت المقدس۔ حلب اور نواحی علاقوں میں بھی تیزی سے ہونے لگی۔ اور ترکوں میں کافی بیداری پیدا ہوگئی۔ لیکن پھر بھی کامیابی کا تصور ابھی بعید از فہم تھا۔ غیر ملکی ریشہ دوانیاں روز بروز بڑھتی جاتی تھیں۔ سلطان کی حکومت مذہب اور خلافت کی آڑ میں عوام کی ذہنیت کو بنیادی مسائل سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ جس کا لازمی اثر یہ تھا کہ ترکی حکومت نہ تو تمدنی ترقی کرسکتی تھی اور نہ بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کرسکتی تھی۔ اس نفسی نفسی کے عالم میں ملاؤں اور مولویوں کی بن آئی تھی وہ خدا اور رسولؐ کے نام پر اپنی دنیا کو رشک فردوس بنائے ہوئے تھے اور قوم کو جہنم کے دروازے تک لیجانے میں حکومت کے آلہ کار بنے ہوئے تھے۔ قومی جماعتوں کو حکومت سے زیادہ ان مذہبی پنچایتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا اس زمانے میں "مقدونیہ" انقلاب و بغاوت کا مرکز تھا۔ کمال نے کسی طرح اپنا تبادلہ وہاں کرالیا۔

اور انجمن اتحاد و ترقی کے ممبر بن کر انھوں نے نہایت مستعدی سے اپنا کام شروع کیا۔ دوسری طرف انکی انجمن بھی روز بروز ترقی کرتی رہی۔ ان تمام ذرائع کے علاوہ انھوں نے ملک کی دوسری ترقی پسند قومی جماعتوں سے معاہدے کر رکھے تھے تاکہ اس سے مدد لی جائے۔ انھیں ایام میں سلطان نے ملک کے تمام تجربہ کار جرنیلوں اور مدبروں کی ایک جماعت طلب کی تاکہ ان کے خیالات سے فائدہ اٹھاکر ملک کی حالت درست کی جائے۔ سلطان المعظم خود پس پردہ لوگوں کی تقریریں سن رہے تھے۔ مصطفےٰ کمال نے اس موقعہ پر غیر معمولی جرارت سے کام لیکر ایک دستور ساز اسمبلی کی تحریک پیش کی اور موجودہ نظام کو بے انتہا ناقص اور تباہ کن بتایا۔ آخرش یہ تحریک کامیاب ہوئی اور تمام جلاوطن ترک جو قومی تحریک کے سلسلے میں ملک کے باہر اپنی زندگی بسر کررہے تھے واپس بلا لیے گئے لیکن خود سلطان کی خفیہ ریشہ دوانیوں سے رفتہ رفتہ دستور ساز اسمبلی ناکامیاب ہونے لگی۔ مصطفےٰ کمال اس موقعہ پر پہلی مرتبہ قومی رہنما کی حیثیت سے سامنے آئے اور لوگوں کو کہا کہ ابھی اصلاحات نافذ ہوئی ہیں۔ رفتہ رفتہ ہم لوگوں کی تمام توقعات پوری ہونگی۔ گھبرانے اور شور مچانے سے ہم لوگ کچھ تعمیری کام نہ کرسکیں گے۔ ابھی حالات پر پوری طور پر قابو نہ حاصل ہوا تھا کہ آسٹریا نے بوسنیا اور ہرزگوینا ترکی کے دو صوبوں کو اپنے قبضے میں کرلیا۔ سرویا نے اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا بلگیریہ کا عیسائی گورنر وہاں کا مطلق العنان بادشاہ بن بیٹھا۔ یونان نے کریٹ کو اپنے مقبوضہ علاقوں میں شامل کرلیا۔ دوسری طرف طرابلس پر اٹلی کے حملے کا اندیشہ غالب تھا۔ ان بغاوتوں میں بہت کچھ سازشیں خود سلطان کی تھیں۔ جو ملک کی مرکزی حکومت کو کمزور کرکے اپنا اثر بڑھانے کے لیے کوشاں تھے کمال کو ایسے نازک موقعہ پر طرابلس بھیج دیا گیا۔ حالانکہ اس وقت طرابلس کی حالت بھی بہت نازک تھی لیکن غازی موصوف نے شیخ سنوسی کی مدد سے وہاں کے نظم ونسق کو بخیر وخوبی سنبھال لیا۔

ابھی یہ سب ہنگامے فرو نہ ہونے پائے تھے کہ سلطان نے رجعت پسندوں کی مدد سے ترکوں کی قومی جماعتوں کی بیخ کنی شروع کردی۔ اور اسی سلسلہ میں مشہور ترکی قوم پرست اڈیٹر طیبسن کو شاہراہ عام پر پھانسی دیدی گئی۔ اس واقعہ نے قومی کارکنوں پر بہت برا اثر ڈالا اور وہ بھاگ بھاگ کر سالونیکا میں جمع ہونے لگے۔ غازی موصوف بھی ایک سوداگر کے بھیس میں وہاں جا پہونچے اور ان لوگوں کو جو افردی کے ساتھ ان ناسازگار حالات کے مقابلے کے لیے آمادہ کیا۔ یہاں پر باغیوں کی ایک فوج بنائی گئی جس کے کمانڈر خود غازی موصوف تھے۔ اس وقت بڑی مصیبت کا سامنا تھا۔ سلطان نے بھی اپنی تمام طاقتیں جمع کررکھی تھیں اور وہ باغیوں کا سر کچلنے پر تلے ہوئے تھے۔ لیکن حق وباطل کا یہ معرکہ ترکی قوم کی عظیم الشان کارناموں میں سے ایک ہے مصطفےٰ کمال آندھی کی طرح آگے بڑھے اور ایک ہی دن میں استنبول پر جاکر دم لیا۔ یہ ایک حیرت انگیز فوجی کارنامہ ہے۔ جنگ میں فتح باغیوں کی ہوئی۔ اور سلطان المعظم کو معزول کرکے ان کی جگہ محمد رشاد دوم (محمد خامس) کو تخت پر بٹھایا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں آپ پیرس میں بغرض مطالعہ آلات حرب بھیجے گئے اور وہاں سے آکر ایک طویل مضمون اسی موضوع پر لکھا جس میں ترکی فوج کو بالکل نکمی اور ناکارہ بتایا اور جدید طریقوں پر ترکی فوج میں بھی انقلاب کر دینے کی تجویز پیش کی۔ حکومت نے مجبوراً آپ کو فوجی پرنسپل کے عہدے پر مامور کیا۔ جو اس زمانے میں بہت اہم تھا لیکن چونکہ آپ کے مسائل سے کنارہ کش رہنا پڑا اسی زمانہ میں طرابلس پر اٹلی نے حملہ کردیا۔ غازی موصوف اپنے عہدے سے استعفےٰ

دیگر بھیس بدلے ہوئے مصر کے راستے سے طرابلس جا پہونچے۔ بعد میں انور پاشا بھی انکی ماتحتی میں کام کرنے کے لئے بھیجے گئے۔ لیکن یہاں پر ذہنی اختلاف کے باعث ان دونوں سپہ سالاروں میں تفرقہ کی بہت بڑی خلیج حائل ہو گئی۔ یہ سب کچھ ہوا مگر جنگ کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ برآمد ہوا اور حکومت نے اغیار کے دباؤ سے مجبور ہو کر انھیں واپس بلا لیا۔ غازی موصوف کے لئے یہ پر آشوب زمانہ تھا۔ انور بے کی مخاصمت نے بھی ان کے عزائم کو بہت نقصان پہونچایا کیونکہ عوام کی باگ ڈور اُس وقت انھیں کے ہاتھ میں تھی۔ ان دنوں ترکی میں واقعات نہایت تیزی سے بدل رہے تھے۔ دوسری طرف یورپین حکومتیں بھی اس بدنصیب ملک کے حصے بخرے کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں۔ لیکن کوئی حکومت یہ نہیں چاہتی تھی کہ قسطنطنیہ اور درہ دانیال پر اس کے سوا کسی دوسری حکومت کا قبضہ ہو۔ یہ باہمی رقابت ہی کمزور ترکی کی حلیف تھی۔ اس کے بعد جرمنی کی ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں اور جنگ عظیم کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ مصطفےٰ کمال نے بہت کوشش کی کہ اس نازک دور میں ترکی جنگ میں نہ اُلجھنے پائے لیکن انور بے کی جوشیلی طبیعت نے ان کے ارادوں کو پست کر دیا اور ترکی بھی میدان کارزار میں کود پڑا۔

جنگ عظیم کی ہولناکیوں سے کون ہے جو واقف نہیں۔ جرمنی کی شکست ترکوں کی بربادی کا باعث ہوئی۔ سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اتحادیوں نے آپس میں تقسیم کر لیا۔ اس طرح خلیفہ کا اقتدار بھی ختم ہو گیا اور ان کی حیثیت کٹھ پتلی کی سی ہو گئی۔ جس نے اتحادیوں کی تجویز کے مطابق غازی موصوف صرف اس جرم میں باغی قرار دیا کہ وہ اناطولیہ میں اپنے ملک کو دشمنوں کے پنجے سے آزاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس وقت ترکی فوج بمشکل ساٹھ ہزار تھی اور ہر ترک کو بیک وقت تین اور کبھی کبھی چار چار یونانیوں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ لیکن پھر بھی مصطفےٰ کمال نے نہایت استقلال سے دشمنوں کو شکست دے کر ترکی کو خود مختار سلطنت تسلیم کرا لیا۔ اب جدید ترکی کی بنیاد پڑی خلافت اور بادشاہت اٹھا دی گئی جمہوریت قائم کی گئی جس کے صدر خود مصطفےٰ کمال منتخب کئے گئے۔ اور پے در پے چار دفعہ آپ کا انتخاب ہوا۔

ترکی کو سب سے زیادہ نقصان اپنوں سے پہنچا ادھر جنگ عظیم میں عربوں نے غداری کر کے مخالفوں کی مدد کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حجاز ترکی کے ہاتھ سے نکل گیا ادھر خود ترکی کی حکومت میں جو مذہبی عنصر غالب تھا اُس نے تقدس کی آڑ میں ملک کی تباہی میں کافی حصہ لیا لیکن غازی موصوف نے جاہل اور قدامت پرست مولویوں سے ملک کو خالی کرانا شروع کیا اور جگہ جگہ کالج اور یونیورسٹیاں۔ کتب خانے قائم کئے جس کی وجہ سے ہر طرف تعلیم عام ہو گئی یہ تعلیم ہر ترک عورت اور مرد کے لیے لازمی قرار دی گئی۔ یورپین اقوام کا جو رعب ترکی پر چھایا ہوا تھا اسے دور کیا گیا۔ اس طرح چند سال میں ترکوں کو اپنی زبان اور اپنی قوم سے محبت ہو گئی اور اب وہ ہندوستانی مسلمانوں کی طرح نماز میں رٹے ہوئے الفاظ نہیں استعمال کرتے بلکہ نماز اور قرآن شریف سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ کمال اتاترک نے آج جو احسانات مسلمانوں پر کئے ہیں کسی طرح بھی بھلائے نہیں جا سکتے۔ ان کا وجود صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لئے ایک ایسا قابل فخر کارنامہ ہے جس پر انسانیت کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

آج جبکہ موجودہ جنگ کی تباہ سامانیوں کے باعث یورپ کا نقشہ روز بروز تبدیل ہو رہا ہے۔ ہمیں مصطفےٰ کمال ایسے مدبر کی بڑی ضرورت محسوس ہو رہی ہے لیکن امید ہے کہ عصمت انونو بھی اپنے پیش رو کی طرح ترکی کے نگہبان ثابت ہونگے۔

خاص "اضطراب" کے لیے

پاپی

جناب ملک سلمان الارشد صاحب فاروقی

زندگی کی قیمت روپیہ ہے اور روپیہ کی قیمت زندگی۔ غربت کی نشانی نوٹوں کی گڈیاں ہوتی ہیں اور ذلالت کی نشانی عسرت ہے یہی اس دنیا کا معیار ہے اور اسی کسوٹی پر دنیا کے افراد کھرے کھوٹے کی پہچان کرتے ہیں۔ راجو زندگی کی اسی منزل میں تھا۔

اس کا دنیا میں لے دیکر اگر کوئی تھا تو صرف اس کی بہن لاجونتی تھی۔ جس سے کہ وہ بے انتہا محبت کرتا تھا۔ اور وہ اس کا دین و ایمان تھی۔ اس کی دنیا میں صرف ایک آرزو تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ لاجونتی کا بیاہ ہو جائے۔ مگر بیاہ کی لازمی شرط سماج نے یہ رکھی ہے کہ لڑکی کو کچھ زیور دیا جاسے اور دولہا کی قیمت چند روپہلی اور سنہری سکوں کے ذریعہ ادا کی جائے۔ غریب راجو ایک معمولی کسان تھا جس کی کل کائنات چند بیگھے زمین۔ دو بیل اور ایک ہل تھا۔ لاجونتی کے بیاہ کے لیے جتنے روپیوں کی ضرورت تھی وہ کبھی اس نے خواب و خیال میں بھی نہیں دیکھے تھے پھر بھلا وہ کس طرح سے لاجونتی کا بیاہ کر سکتا تھا

گاؤں کا دوسرا خدا زمیندار ہوا کرتا ہے اور جب غریب دیہاتی آسمانی خدا سے ناامید ہو جاتے ہیں تو پھر وہ اس انسانی خدا سے مدد طلب کرتے ہیں۔ یہ خدا دو حاجت سے کوسوں دور مگر گرد و قریب میں یکتا ہوتا ہے۔ وہ شروع میں اپنی میٹھی اور باتوں سے غریبوں کو اپنا گرویدہ کر لیتا ہے۔ اور پھر اپنی من مانی کارروائیاں کرتا ہے۔ رائے پھمن داس جی اپنے گاؤں کے اوتار سمجھے جاتے تھے غریبوں اور مظلوموں کی انھوں نے سرپرستی کی تھی۔ کب اور کیسے یہ سب ہی جانتے تھے لیکن کیوں یہ اسکی کسی کو خبر نہ تھی۔ اس گاؤں کے لوگ فخریہ بیان کرتے تھے کہ ہمارے گاؤں کے زمیندار منش نہیں ہیں۔ بلکہ اوتار ہیں اوتار۔ البتہ دولی چند۔ بجو اور شیخ جی اس راز سے واقف تھے کہ رائے پھمن داس اوتار کے بھیس میں کرد فریب کے دیوتا ہیں۔ ان کو تو اپنے حلوے مانڈے سے کام تھا۔ مردہ خواہ دوزخ میں جاے یا جنت میں انکی بلا سے۔

سیکڑوں لڑکیوں کی رائے صاحب نے اپنے خرچ سے شادی کرائی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں اقتصادی مشکلات کے باعث ان لڑکیوں کے والدین کی زمین اور بیل قرق کرا لیے۔ مگر پھر بھی وقت پر مدد تو کر دیتے تھے یہی کیا کم بات تھی۔ دوسرے لڑکیاں جب بھی اپنے میکہ آتی تھیں تو رسماً ایک رات کے لئے مالک کے گھر جانا ضروری تھا خواہ گھر ان موجود ہوں یا نہ ہوں

لاجونتی کی عمر ۱۶ برس کی ہو چکی تھی دل میں امنگیں بیتاب تھیں لیکن ہونٹوں پر شرم سے خاموشی کی مہر لگی ہوئی تھی اور سارے گاؤں والوں کی حریص بھوکی نظریں اس پر پڑ رہی تھیں۔ مگر بیاہ اس لیے نہیں کر سکتے تھے کہ لاجونتی کے پاس روپہلی اور سنہری سکے دینے کے لیے نہیں رہتے ——— پھر بھلا ان نوجوانوں کے ماں باپ اس رشتہ کو کیسے قبول کر سکتے تھے البتہ گاؤں بھر میں بھگوا ایک ایسا نوجوان تھا جس کا سر پھر گیا تھا پھر وہ لاجونتی سے بیاہ کے لیے تیار تھا اور روپیے پیسے کا طالب نہیں تھا مگر آج اس سے اس لیے لاجونتی کا بیاہ نہیں ہو سکتا تھا کہ گاؤں والوں نے اس کو اسی جرم کی بنا پر برادری سے خارج کر رکھا تھا کہ غریب کا جو ایسا اقدام

کرتا کو اتفاقاً برادری اس کا بھی حقہ پانی بند کر دیتی۔ راجو سماج کے انتقام کے خوف سے قدم نہ بڑھا سکا۔

مجبوراً غریب راجو نے آس پاس کے گاؤں میں بر کی تلاش شروع کی۔ اور خوش قسمتی سے اس کو ایک سستا سا بر بھی مل گیا۔ جو ڈھائی سو روپیہ کے ساتھ لاجونتی کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا البتہ اس کی عمر ضرور پچاس سال کی تھی اور اسی لئے وہ سستا بھی تھا۔ دکھی راجو اس رشتہ سے بہت خوش ہوا۔ اور جلدی جلدی روپیہ کا انتظام کرنے لگا خون و پسینہ کی گاڑھی کمائی کے سو روپیہ اس کے پاس جمع تھے اور سو روپیہ غلہ بیچ کر اس نے فراہم کر لئے۔ مگر اب بھی سو روپیہ کی ضرورت تھی۔ کیونکہ پچاس روپیہ صرف برادری کی دعوت ہی کے لئے ضروری تھے غریب راجو نے ہر ممکن کوشش کی کہ روپیہ مل جائے۔ غریب کو قرض بھی نہیں مل سکتا تھا۔ کیونکہ مفلس کا اعتبار ہی کیا اس ناکامی میں اس کو ایک موہوم سی شعاع امید نظر آئی۔ اور وہ زمیندار صاحب کی فیاضی تھی ــــــــ

زمیندار انسان تھا لیکن گاؤں والوں کے لئے اوتار۔ وہ روپیہ دینے پر راضی ہو گیا یہ دوسری بات تھی کہ قاعدے کے مطابق راجو کی زمین اور بیل گروی رکھ لئے۔ مگر اس کے ساتھ ایک رعایت یہ بھی کی کہ راجو زمین جوت سکتا تھا۔ اور اگر سال بھر میں قرضہ ادا کر دے تو اسی طرح سے زمین کا مالک دوبارہ بن سکتا تھا۔ زمیندار صاحب نے ۱۲۵ روپیہ راجو کو دئے جس میں ۲۵ روپیہ سود کے کاٹ لئے۔ راجو سو روپیہ دھوتی میں باندھے خوشی خوشی گھر آیا۔

شادی کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ راجو بے حد مسرور تھا۔ اتفاق سے زمیندار صاحب کے یہاں مہمان آنے والے تھے۔ زمیندار صاحب نے راجو سے کہا کہ وہ گاڑی لیکر اسٹیشن چلا جائے تاکہ معزز مہمانوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ یوں تو بہت سے آدمی یہ کام کر سکتے تھے مگر زمیندار صاحب کا حکم تھا۔ "راجو مجھے صرف تم پر بھروسہ ہے اور تم مہمانوں کو بہت آرام سے لاؤ گے" غریب راجو زمیندار صاحب کے اعتماد سے پھولے نہیں سماتا تھا وہ گاڑی لے کر جنار گڈھ کے اسٹیشن کی طرف چلا گیا ــــــــ مہمانوں کی آمد کی وجہ سے گھر میں بہت سے کام تھے اس لئے زمیندار صاحب نے لاجونتی کو بلا بھیجا کہ وہ آکر آٹا پیس دے۔ لاجونتی کے اوپر زمیندار صاحب نے احسان کیا تھا پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس وقت ان کے کام نہ آئے۔ وہ زمیندار صاحب کے گھر دوڑی آئی۔ تھکرائن سو چکی تھیں۔ زمیندار صاحب نے خود اس کو گیہوں بتائے اور چکی اٹھا کر گیہوں کی کوٹھری میں رکھدی۔

رات کے دو بجے تھے۔ لاجونتی اس وقت تک دس سیر گیہوں پیس چکی تھی۔ وہ پسینہ میں شرابور ہو رہی تھی سانس کی تیزی نے اس کے سینہ میں ایک خاص قسم کا تلاطم برپا کر رکھا تھا۔ کہ اتنے میں زمیندار صاحب داخل ہوئے۔

"ارے لاجو! تو تو بہت تھک گئی۔ بس اب رہنے دے۔ کل پیس دینا۔ جا مگر ذرا سویرے آجانا"

لاجونتی زمیندار صاحب کی اس مہربانی سے بہت متاثر ہوئی اور پرنام کر کے جانے لگی۔ کہ پھر زمیندار صاحب نے کہا "لاجو اتنی رات گئے کہاں جاتی ہے۔ تجھے ڈر نہیں لگے گا؟ تو یہیں سو جا"

"نہیں مہاراج، میں چلی جاؤں گی"

"اری پگلی۔ اتنی رات گئے! نا، نا میں نہیں جانے دوں گا۔ زمانہ خراب ہے۔ راجو الگ نہیں ہے گاؤں کے نوجوان بدمعاش ہیں اگر کوئی آفت آگئی تو میں راجو کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ جا تو سامنے والی کوٹھری میں سو جا"

لاجونتی بھی اس خیال سے ذرا گھبرائی۔ مگر تھی کوٹھری میں داخل ہو گئی اور پیچھے پیچھے زمیندار صاحب، زمیندار صاحب

نے عجیب نگاہوں سے لاجونتی کو دیکھتے ہوئے کہا " ارے لاجو تیرا جس سے بیاہ ہو رہا ہے وہ تو بہت بڈھا ہے "

لاجونتی چپ رہی ــــــــــ

" تجھ جیسی سندر لڑکی اس بڈھے کے قابل نہیں۔ تو تو محلوں کے قابل ہے " زمیندار صاحب کی آواز میں رتنا شی تھی ــــــــــ۔

" سرکار! غریب کا غریب ہی سے نباہ ہو سکتا ہے، لاجونتی نے بڑی مشکل سے کہا "

زمیندار کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ سانس تیز ہو گئی ــــ " لاجو! تجھ جیسی سندر لڑکی پر میں تن من دھن سب نچھاور کر سکتا ہوں ــــ "

لاجونتی کانپنے لگی۔ اس نے گھبرا کر کہا " سرکار تو ہمارے دوسرے مائی باپ ہیں۔

" لاجو " زمیندار صاحب نے کوٹھری کی زنجیر لگا دی۔

" سرکار "۔۔ لاجونتی کچھ نہ کہہ سکی ــــــــــ

سولہ برس کی دھان پان لڑکی ایک مرد اور زمیندار کا کیا مقابلہ کر سکتی تھی ــــــــــ

ــــــــــ لفنڈے لے پانچ بجائے ــــ " اری روتی کیوں ہے؟ ــــ دیکھ کسی سے کچھ کہنا نہیں ــــ میں جلد ہی تجھ سے بیاہ کر لوں گا ــــ جو بات بیاہ کے بعد ہوتی تھی اب وہ ہو گئی۔ اس میں نقصان ہی کیا ہے ــــ " ڈیوڑھی سے جاتے وقت بجو نے چاندی کے پانچ سکے لاجونتی کے ہاتھ میں رکھ دئے اور چپکے سے کچھ کان میں کہا ــــ ایک دوشیزہ کی تباہی کا معاوضہ ــــ پانچ روپیہ!!

شادی کے دن قریب آتے جا رہے تھے ــــ لاجو کسی نہ کسی بہانہ سے زمیندار صاحب کے یہاں سر شام جاتی تھی اور رات گئے واپس آتی تھی۔ دو ہی چند اور غنیم جی نے اکثر زمیندار صاحب کے پیغام سلام لاجونتی تک پہونچائے تھے۔

" زمیندار صاحب پرسوں بیاہ ہے۔ آپ اپنا وچن کب پورا کریں گے۔؟ "

زمیندار صاحب مسکرائے " پگلی بیاہ ہو جائے تو چلی جانا۔ میکے تو آتی ہی رہیگی۔ میں کہیں بھاگا تھوڑا ہی جا رہا ہوں۔ بیاہ تو سماج کے لئے ہے ہمارے لئے نہیں "

لاجونتی کانپنے لگی " اور یہ بالک! یہ جلد ہی سنسار میں آنیوالا ہے۔ اس کا پتا کون ہوگا۔

" یہ تو جانے۔ مجھے کیا معلوم "

" مگر اس بالک کے تو آپ ہی پتا ہیں۔ "

" مجھ پر دوش لگاتی ہے۔ اس کا پتا میں ہوں۔ ہونہہ۔ بھگو سے پوچھ بھگوا سے۔ اس سے جس سے تو چھپ چھپ کر ملتی تھی " لاجونتی خاموش واپس آئی ــــــــــ

اس کا آخری سہارا بھگوا تھا۔ اس نے اس سے سب کچھ کہہ دیا اور اس سے امداد چاہی ــــــــــ

گاؤں میں بھی انسان بستے ہیں ــــــــــ صبح سویرے زمیندار صاحب باہر مردہ پائے گئے [illegible] ــــــــــ

گاؤں کا گاؤں رنجیدہ تھا۔ زمیندار صاحب جیسے اوتار کو کسی پاپی نے قتل کر دیا تھا ——— دوسرے دن بھگوا نے پولیس کے سامنے آکر خود ہی اقبال جرم کر لیا ——— قاتل کو گرفتار کر لیا گیا ——— ایسے مہاپرش انسان کو قتل کرنیوالا یقیناً پاپی تھا ———

لاجونتی نے گاؤں والوں اور پولیس سے اپنی بپتا کہی۔ مگر اس غریب کی کون سنتا تھا ——— دوسرے دن لاجونتی کی لاش ایک کنوئیں سے برآمد ہوئی ——— غریب لاچار لاچار ہو گیا

بھگوا کو عدالت نے ملزم قرار دیا ایسے پاپیوں کے لئے قانون نے پھانسی کی سزا تجویز کی ہے۔ لیکن بھگوا پر رحم کھا کر عدالت نے عمر قید کی سزا دی۔

البتہ گاؤں والے اب بھی کہتے ہیں کہ بھگوا اور لاجونتی پاپی تھے۔ زمیندار صاحب نے ان کو ایک دن دیکھ پایا تھا۔ وہ اس پاپ پر بہت خفا ہوئے تھے بھگوا نے اس ڈر سے کہ کہیں گاؤں والوں کو یہ قصہ معلوم نہ ہو جائے۔ ان کو قتل کیا۔ اور لاجونتی نے ان پر ایسا برا دوش لگایا ——— ایسے مہاپرش کو مارنے والا بڑا پاپی تھا ——— اور ایسے اچار پر دوش لگانے والی پاپن ——— ۔

لیکن دونی چند۔ سچ بھی۔ اور بھو جانتے تھے کہ ———

پاپی! ——— کون تھا؟

(بقیہ اضطراب عالم) میں پھانس رکھا ہے مگر اٹلی کو ابھی تک کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ ساتھ ہی اسے کوئی زیادہ نقصان بھی نہیں ہوا ہے۔ مصر کی سرحد پر اگرچہ لڑائی ہو رہی ہے مگر ابھی تک اس نے اعلان جنگ نہیں کیا ہے۔

یہ تو تھا پردے کے پیچھے کا حال اب چلتے چلاتے اسٹیج پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ جرمن ہوائی جہاز انگلستان پر حملے کر رہے ہیں اور برطانی جہاز جرمن علاقوں اور ہالینڈ اور فرانس کے جرمن مقبوضات پر جوابی حملے کر رہے ہیں۔ بحر روم اور افریقہ کے شمالی علاقہ میں اٹلی اور برطانیہ میں چھوٹی موٹی ٹکریں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن یہ حالت اب زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکتی۔ انگریزوں کو یقین ہے کہ ہٹلر انگلستان پر حملہ کر کے رہے گا۔ اس حملہ کی کیا صورت ہوگی اسکی بابت نہیں کہا جا سکتا۔ ہٹلر خفیہ ہتھیار، کی دھمکی دیتا ہے اور انگریز سوچ سوچ کر کاٹ نکال رہے ہیں۔ بہر حال یہ یقین ہے کہ موجودہ سکون ایک آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہو گا۔ یہ طوفان زلزلہ اور آخری ہوگا اور اسی پر دنیا کے مستقبل کا دارومدار ہے

جناب عشرت علی صاحب صدیقی

اب دیر مت کیجئے

حجاب

محترمہ عذرا بیگم کی زیر ادارت شائع ہونے والا مشہور ماہنامہ بہت جلد ہندوستان کے بلند پایہ اہل قلم حضرات کے مضامین کو اپنے دامن میں لیے ہوئے آپ کے ہاتھوں میں ہو گا۔

سالانہ چندہ صرف عہ رگر پرچہ شائع ہونے کے فوراً بعد عاہ نمونہ کے لیے ۳ کا ٹکٹ ارسال کیجئے۔

المشتہر: منیجر ماہنامہ حجاب" گلشن محل لیڈی جمشید جی روڈ ماہم بمبئی نمبر ۱۶ -

اضطراب عالم

لڑائی نے یورپ کے ساز کو برہم کر دیا ہے ناچ گھروں کی میٹھی موسیقی قہوہ خانوں کے سریلے نغمے۔ اور حسینان جہاں کے ناز و غمزے یورپ کے ایک خطے سے نابود ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ فوجی بینڈ۔ توپوں کی گرج۔ طیاروں کی بھنبھناہٹ۔ بموں کے پھٹنے کی خوفناک آواز۔ مجروحوں کی کراہ اور بے خانماں شہریوں کی آہ و بکا کا دور دورہ ہے ہندوستان میں بھی گرانی اور غیر مستقل سیاسی صورت حال۔ مختلف جماعتوں کی کشمکش اور مستقبل کے متعلق خطرناک پیشینگوئیوں نے تمام شعبہ حیات کو ایک مسلسل بیقراری بنا رکھا ہے۔ غرضیکہ جدھر دیکھئے ایک ہلچل مچی ہوئی ہے۔ پریشانی۔ بے چینی۔ اضطراب۔ بعض سیاسی نجومی اسے دردِ زہ سے تعبیر کرتے ہیں اور دیکھنا ہے کہ ان کٹھن گھڑیوں کے بعد بطن گیتی سے کیا چیز پیدا ہوتی ہے۔ دائمی امن یا بربریت اور دیوانگی۔

لڑائی پارسال ستمبر میں شروع ہوئی تھی۔ چند مہینے تو سازندوں کو ساز ملانے میں لگ گئے پھر طبلے پر تھاپ پڑی بربریت کی مردم خور دیوی نے گھنگھرو بجائے اور آناً فاناً یورپ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تھرکنے لگی جہاں جاتی لاکھوں انسانوں کی بھینٹ لیتی۔ اور ان کی برسوں کی کمائی کو نگل جاتی۔ چند مہینوں میں حکومتوں کا توازن بالکل بگڑ گیا۔ پہلے پولینڈ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ اور پھر بات کہتے میں ناروے۔ ڈنمارک۔ ہالینڈ۔ بلجیم اور فرانس ختم ہو گئے۔ فسطائیت کے سیلاب نے جمہوریت کے قلعوں کو منہدم کر دیا۔ جمہوری طاقتیں اپنے گرد و پیش سے بے خبر خواب خرگوش میں پڑی تھیں۔ اور اس وقت چونکیں جبکہ یورپ کا بیشتر حصہ ان کے اثر سے نکل چکا تھا۔ روس نے پولانڈ سے بھرے جرمنی سے اپنا حصہ بانٹ کر لیا۔ پھر اسٹونیا۔ لیٹویا اور لتھونیا پر عوامی حکومتیں قائم کرائیں اور اب خبر ہے کہ وہاں سوویٹ طرز کی حکومتیں بن رہی ہیں اس طرح اب یہ تینوں ملک عملاً روس میں ضم ہو جائیں گے۔ روس نے یہ پیش بندی اس لئے کی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے خلاف دشمن جنگ کا رخ اسی کی طرف پھیر دیں اور فسطائیت اور سوشلزم کی لڑائی چھڑ جائے۔ یہ خطرہ کم ہوتا نہیں دکھائی دیتا تھا اور مشرق میں روس کے صنعتی اور زراعتی علاقوں کے زد میں آ جانے کا امکان تھا اس لئے اس نے رومانیہ پر دور ڈالکر اپنا پرانا علاقہ بسربیا لے لیا۔ جرمنی نے ناروے پر قبضہ کر کے نہ صرف اپنے لئے تجارتی راستہ کا انتظام کر لیا بلکہ سویڈن کو بھی اپنے اثر میں لے لیا۔ بلقانی ریاستوں سے ہنگری تو پہلے ہی سے اس کے اثر میں تھا۔ اور اب جرمنی اس کی طرف سے رومانیہ پر ٹرانسوانیا واپس کر دینے کے لئے دور ڈالکر رومانیہ کو بھی اپنے قابو میں کر لینا چاہتا ہے لیکن یہاں جرمنی اور روس کے مفاد آپس میں ٹکراتے ہیں تاہم یقین ہے کہ جرمنی روس سے بگاڑ کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ جب رومانیہ میں نیم فسطائی حکومت برسر اقتدار آئی اور اس نے جرمنی سے باہمی امداد کا معاہدہ کرنا چاہا تو جرمنی نے انکار کر دیا۔ ترکی عجب کشمکش میں مبتلا ہے۔ وہ جرمنی۔ برطانیہ اور روس میں سے کسی کو خفا کرنا نہیں چاہتا۔ برطانیہ کو اس نے اپنی طرفداری کا یقین دلایا ہے۔ روس کو راضی رکھنے کے لئے یہ اعلان کر دیا ہے کہ وہ اس کے خلاف کسی لڑائی میں شریک نہیں ہوگا اور جرمنی کو منہ بھرائی دینے کے لئے اس نے حال ہی میں اس کے ساتھ ایک تجارتی معاہدہ کر لیا ہے۔

فرانس کی ہار کے وقت جرمنی کا پلہ بھاری دیکھ کر اٹلی بھی لڑائی میں اسکا ساتھی بن گیا۔ اس کی تمنا ہے کہ بحر روم اطالوی سمندر بن جائے اور اس کے جنوب کے ممالک یعنی مصر سوئیز اور اس کے گرد کے اسلامی ممالک اس کے اثر میں آ جائیں۔ اٹلی کے داخلے نے فرانس کے لیے ایک بلی گھونسہ کا کام کیا اور اس کا خاتمہ بہت جلد ہو گیا برطانیہ کے لئے بھی ایک مصیبت اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس لئے کہ ایسے موقع پر جب انگلستان پر جرمنی کے حملہ کا چرچا ہو رہا ہے اٹلی نے اس کے بحری بیڑے کا کافی معقول حصہ بحر روم

عرفانِ تغزّل

حضرت خواجہ سید عزیز الحسن صاحب
مجذوب دہلوی انسپکٹر مدارس۔ بنارس

بےخودیٔ شوق یہاں جلوہ گہِ ناز میں ہے　طور پر بحث ابھی صورت و آواز میں ہے
کوئی محرم نہیں سب حال مرا راز میں ہے　ناشنیدہ ہے وہ نغمہ جو مرے ساز میں ہے
وہ مزہ ہو مرے نالوں میں کہ نغموں میں نہیں　کیفِ صد ساز مری خاطرِ ناساز میں ہے
حسنِ خفا را سے سمجھوں کہ کہوں حسنِ ادب　راز داں ہو کے بھی دل جستجوئے راز میں ہے
میں بنا خاک سے کیوں خاک میں ملنے کے لئے　میرا انجام بھی مضمر مرے آغاز میں ہے
ناحق الزام انا الحق کا ہے منصور کے سر　لب پہ طرب کے جو نغمہ ہو وہی ساز میں ہے
پر شکستہ نہ سمجھ بلبلِ قدسی ہوں میں　پرِ جبریل مرے بازدے پرواز میں ہے
یوں تو اس پیکرِ ہستی میں مرے کچھ بھی نہیں　کوئی مطرب ہو تو ہر نغمہ مرے ساز میں ہے

لاکھ اٹھا اب کہیں اٹھتا ہی یہ مجذوب کا سر
سجدہ مچلا ہے ترے در پہ جبیں ناز میں ہے

بھوک

محترمہ شفیق بانو صاحبہ

"ہاں تو تمھیں نوکری کی ضرورت ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہاں روزانہ بہت سی عورتیں آتی رہتی ہیں لیکن ابھی تک کوئی پسند نہیں آئی۔"

"بیگم صاحب آپ سمجھ سکتی ہیں کہ ایک ضرورت مند زیادہ محنت سے آپ کے حکم پر چلے گا۔ بیگم صاحب بہت مصیبت زدہ ہوں۔ بدقسمت ہوں۔ غربت کے اندھیرے میں ہاتھ پاؤں چلانے کی سکت نہیں رہی۔ اچھے گھر کی بیٹی ہوں اچھے گھر میں بیاہی گئی۔ لیکن اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔ شادی کے سترہ برس بعد یہ بچہ ہوا تھا اور وہ اسے تین روز کا چھوڑ کر چل بسے۔ گھر کا اثاثہ تو زندگی ہی میں ختم ہو چکا تھا اب حضور کا نام سن کر چلی آئی۔"

"اچھا تو پھر جب تم نوکری رہنے والی ہو تو ہمارے ہاں کام کیونکر کر سکو گی۔ یہاں پردہ ورده کچھ نہ ہوگا۔ سب نوکروں کے سامنے آنا ہوگا اور وقتاً فوقتاً میں کچھ کہوں تو ان سے کام بھی لینا پڑیگا۔ میں اپنے بے بی کو دودھ پلانا چاہتی ہوں۔ دس روپیہ اور کھانا ملے گا۔ عید بقرعید پر تمھیں اور تمھارے بچے کو کپڑے بھی ——— لیکن یہ شرط ہے کہ تمھارا بچہ الگ رہے گا۔ اسے باہر دودھ روزانہ اور کبھی کچھ پھل وغیرہ دیا کریں گے۔ اس کی تمھیں سختی سے پابندی کرنی ہوگی کہ تمھارا بچہ تمھارا دودھ نہ پی سکے۔ ڈاکٹری اصول سے تمھیں صفائی سے رہنا اور وقت پر دودھ پلانا ہوگا۔ تم بہت دبلی اور زرد دکھائی دیتی ہو کیا بات ہے؟ میں ذرا اپنے فیملی ڈاکٹر کو فون کر کے بلاتی ہوں وہ تمھیں دیکھ کر اطمینان کر لے۔"

ڈاکٹر آیا معائنہ کیا اور یہ کہا کہ انا کے دل اور خون میں کوئی خرابی نہیں سب ٹھیک ہے فاقوں سے خون کم ہو گیا ہے۔

یہاں مقابلہ تھا "بھوک" اور "ممتا" کا۔ تقابل تھا محبت اور مفلسی کا۔ نوکری کبھی نہ کی تھی گھر سے کبھی نکلی تھی لیکن آج وہ تمام باتیں معمولی سمجھ کر ملازمت کی کوشش کر رہی تھی ایسا نہ ہو بیگم صاحب انکار کر دیں۔ غریبی کے بھیانک تخیل نے اسے مجبور کر دیا محبت پر مفلسی غالب آئی مجبوریاں محبت پر بادل بنکر چھا گئیں تھوڑی دیر تک سوچتی رہی اور پھر بول اٹھی۔

"بیگم صاحب مجھے آپ کی ساری پابندیاں منظور ہیں"

"لیکن تمھیں باقاعدہ تین سال کا اگریمنٹ کرنا ہوگا۔ یہ رہا کاغذ اس پر دستخط کر دو ——— تمھارے حقوق ہمیشہ سمجھے جائیں گے اور تمھیں ہماری ملازمت میں بہت آرام ملے گا۔"

دستخط کرنے والی کا ایک دفعہ ہاتھ کانپا اور خدا جانے کن کن خیالات کو سامنے لا کر وعدہ کر ہی لیا اور دستخط کر دیے"

بیگم نے ایک مرتبہ مشکور نگاہوں سے دیکھا اور دوسری ملازمہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "دیکھو حسن انھیں جو کمرہ دکھا دو اور ان کا سارا سامان قرینہ سے لگا دو سب باتیں ٹھیک سے سمجھا دو۔ ان کے بچہ کو نانو کے سپرد کر دو اور تاکید کر دو کہ اسے آرام سے رکھے مانوس کر کے ماں کو بھلا دے۔ اس کے لیے بے بی کا پرانا اپل کا تھا اور پھٹی ہوئی چادر دیدو۔"

"بہت اچھا سرکار!" کہکر ملازمہ الٹے پاؤں کمرے سے چلی گئی اور آنکھ جھپکتے تمام احکامات پورے ہو گئے۔

نئی ملازمہ کو "انّا" کا رتبہ مل گیا۔ جب اسے کوئی آواز دیتا "انّا! او انّا!" تو اُس کے دل کو دھکا سا لگتا۔ کئی دفعہ سوچا کہ وہ مالکہ سے کہے کہ سب کو حکم دے دیجیے کہ وہ میرا نام لیا کریں لیکن پھر چپکی ہو گئی کہ ٹھیک تو کہتے ہیں دودھ پلانے والی کو سب ہی "انّا" کہتے ہیں
وہ کوٹھی کے ایک نہایت شاندار کمرے میں بچہ کو لیکر رہنے لگی۔ گھڑی کا ہر تیسرا گھنٹہ اُسے چونکا دیتا اور وہ اپنے فرض کو پورا کرتی۔ جس وقت دودھ پلاتی تو دوسری چھاتی سے دودھ ٹپ ٹپ گرتا رہتا۔ اُس کا دل بُری طرح مسلتا۔ بچہ کی ممتا۔ اُسے یہی خیال لگا رہتا۔ خدا معلوم میرا بچہ۔ میرا معصوم لال سو رہا ہے یا رو رہا ہے جانے دودھ بھی دیا ہوگا یا نہیں۔ رات کو گیلے میں سویا ہوگا یا سوکھے میں ـــــ اگر گھر میں وہ اتنا بھی چھوڑ کر مرتے کہ میں روکھی سوکھی کھا کر بچّے کو پال سکتی تو پھر میں یہ نوکری کیوں کرتی۔ آہ میرے بچے ـــــ تو یوں مصیبت میں پل رہا ہے۔ سترہ برس تیرے لیے دعائیں مانگیں تھیں۔ کیا اس بُرے دن کے لیے؟ میں آرام سے ہوں۔ لیکن یہ بستر مجھے کانٹوں سے کم نہیں۔ مجھ سے بہتر تو پنجاب کی وہ گوجری عورتیں ہیں جو بچہ کو تنخواہ مقرر کر کے دو سال تین سال کے لیے گھروں پر لیجاتی ہیں اس طرح انکی ممتا بھی ٹھنڈی رہتی ہے اور اپنے بچہ کو بھی دیکھتی رہتی ہیں۔ یہاں تو اتنا بھی حکم نہیں کہ میں سامنے بھی جاؤں یا ذرا سی دیر کو اپنے لال کو کھلا لوں ـــــ یہ سب باتیں تو پہلے ہی دن کہہ دی گئی تھیں میری غرض تھی ہر بات پر سر جھکا دیا۔

یہ باتیں انّا سوچتی اور اپنا سر دُھنتی ... وہ اس عہد کو توڑ نہ سکتی تھی اور توڑ دیتی تو کہاں جاتی؟ اور پھر کیا اور کہاں سے کھاتی؟ روٹی کے ٹکڑوں نے اسے مجبور کر دیا۔ وہ بدستور نہایت ہوشیاری سے احکام کی پابندی کرتی اور وقت سے دودھ پلاتی رہی۔ چونکہ وہ گھر کی رہنے والی مصیبت زدہ تھی اس لیے اُس کے دل میں فرض کا احساس زیادہ تھا۔ حاضر غائب بچہ کو بہت اچھی طرح رکھتی دل کا حال تو خیر خدا کو معلوم تھا۔

جب تک اس کا بچہ چھوٹا رہا تب تک تو خیر لیکن جب ذرا بڑا ہو گیا۔ تو نوکروں کے کوارٹر سے لڑھکتا ہوا تمام میں پھرنے لگا اور کبھی کبھی ماں کی طرف بھی جا نکلتا۔ ماں فوراً ہی بھگا دیتی "میرے لال میاں سے چلا جا ـــ بیگم صاحب دیکھ لینگی تو خفا ہونگی ـــ کوٹھری میں بند کر دیں گی"

بچہ بیگم صاحب کو ہوّا سمجھنے لگا۔ وہ بیگم کا نام سن کر خوفزدہ ہو جاتا اور نوکروں کے کوارٹروں کی طرف چلا جاتا جہاں اس کی بھی کوٹھری تھی اور وہ نانو کے ساتھ رہتا تھا۔ نانو اگر اپنے جون میں ہوئی تو خیر ورنہ اُسے بری طرح جھڑکیاں دیتی اگر وہ روتا تو خوب چانٹے لگا کر خاموش کر دیتی۔ نانو کو محبت تو تھی نہیں سرکاری حکم سے اُسے پال رہی تھی۔ پھر بھی غنیمت تھا کہ اسے پیٹ بھر کھانے کو وقت سے دیدیتی اور رات کو روتے ہوئے کو چپ کرا دیتی۔ کبھی پانی دیدیتی کبھی روٹی کا ٹکڑا پکڑا دیتی۔

بیگم صاحب انّا پر بہت مہربان تھیں اور کیوں نہ ہوتیں وہ غریب ان کے اشاروں پر اپنی ممتا کو قربان کر رہی تھی بیگم اپنے بچہ کو تندرست پلتا ہوا دیکھکر خوش ہوتیں اور انّا بیچاری یہ سوچ کر کہ یہ دودھ میرے لال کا حق تھا گھٹتی اور سانس گھونٹ کر رہ جاتی۔ ایک دن اس کا بچہ اِدھر اُدھر دیکھتا چپکے سے ماں کے پاس چلا آیا۔ ماں بے بی کو صبح کے وقت سے نئے کپڑے پہنا رہی تھی اُس کے معصوم بچے نے تتلا کر پوچھا "اماں یہ للا (کرتا) پھول پھول ـــ آپکا ـــ یہ پالا پالا چھاپ چھاپ (صاف صاف) اماں میں بھی لوں ـــ پھر اپنا میلا کرتا ہاتھ میں لیا اور ماں کو دکھا کر بولا۔ "اماں میلا للا کرتا میرا ـــ میلا میلا ـــ اُنں ہوں میں بھی"
ماں نے مصلحت وقت کو سوچ کر بچہ کو بہلا کر کہا "اب تم جاؤ۔ بیگم صاحب بے بی کو دیکھنے ابھی آتی ہی ہونگی۔ بھاگ جاؤ!"
بچہ بدستور کھڑا رہا اور غصہ سے منہ پھلائے شیشے کی الماری میں اپنا عکس دیکھتا رہا ـــ کبھی للچائی ہوئی نظروں سے

بسکٹ کے ڈبوں کی طرف دیکھنے لگتا۔ "اماں وہ...... وہ بہت چھالے دسارے، میٹھے میٹھے۔ بکٹ (بسکٹ)"۔

ماں نے جلدی سے ایک بسکٹ دے دیا اور کہا "میرے بچے جا۔ جا جلدی سے بھاگ جا اسے کرتے میں چھپا لے کہیں جاکر کھالے اور پانی پی کر کھیل۔ بیگم صاحب آتی ہونگی خفا ہوں گی"۔

بچہ بسکٹ پاکر خوش ہوگیا۔ بیگم صاحب کا نام سنتے ہی چپ ہوگیا اور بھاگتا ہوا ایک دم کوٹھے پر چڑھ گیا اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ کوٹھے پر کوئی نہیں، یہاں ذرا چھپ کر یہ بسکٹ کھالوں ۔۔۔ سامنے اڑتی ہوئی چڑیاں دیکھنے میں ایسا مشغول ہوا کہ ہاتھ سے چھجے پر بسکٹ چھوٹ گیا اور ساتھ ہی وہ معصوم بھی بسکٹ اٹھانے کو آگے بڑھا۔ لکڑی کا خوشنما جال بہت نیچا لگا تھا وہ جیسے ہی جھکا کر ہاتھ بڑھا کر بسکٹ اٹھانے لگا کہ ایک دھماکے کے ساتھ شاخ سے لڑھکتا ہوا نچلی منزل کے پختہ فرش پر آرہا۔ گرتے ہی سر پھٹ گیا۔ سب آواز کے ساتھ دوڑے ایک شور مچ گیا معصوم کے منھ سے خون بہہ رہا تھا۔ ہر ہر عضو کانپ رہا تھا۔ دماغ کرچی کرچی ہوگیا تھا ۔۔۔ ماں نے چیخ مار کر بچے کو اٹھالیا اور اس کے خون بھرے منھ پر اپنا منھ رکھ دیا۔ ماں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ "میرے لال! میری سترہ برس کی آرزو اجڑ گئی"!!

بچہ کا سر ماں کی گود میں تھا۔ اور ماں کے لب بچہ کے ننھے خون آلود منھ پر ساکت تھے۔ ماں کی آنکھیں کھلی تھیں کبھی ٹکٹکی باندھ کر بچہ کو دیکھنے لگتی تھی کبھی ایک چیخ کے ساتھ سر دیوار سے ٹکراتی تھی۔ سب کھڑے اس دل ہلا دینے والا منظر کو دیکھ رہے لیکن کسی نے "اُف" "واہ" کا لفظ بھی نہ کہا۔ ہاں نوکر چاکر کبھی نظر بچا کر بیگم کی طرف دیکھ لیتے تھے۔

حسرت نصیب نامراد ماں کی گود میں خاک آلود بچہ دم توڑ رہا تھا!! ماں کے آنسو معصوم بچہ کی پیشانی پر گر گر کر خون میں مل کر بہہ رہے تھے!! بچہ کے ایک ہاتھ میں وہ بسکٹ تھا۔ جس کے اٹھانے کی کوشش میں خود گرا اور جان ہی گئی

معصوم کی مٹھی میں بسکٹ کا ٹکڑا بھوک کی گواہی دے رہا تھا!!

بے بی آنا سے بہت مانوس تھا۔ انا کو روتا دیکھکر اس سے چمٹ گیا اور خود بھی رونے لگا۔ انا نے ایک ہاتھ سے بے بی کو کلیجہ سے چمٹا لیا اس کا دوسرا ہاتھ اپنے بچہ کی پیشانی پر تھا۔

بیگم نے اپنے بچہ کو روتا دیکھکر اسے انا سے الگ کرلیا اور پائیں باغ کی طرف چلی گئیں۔ اور اب نوکروں نے انا کو دلاسا دینا شروع کیا...... دکھی ماں اور زور سے رونے لگی۔....

دو چار دن بعد بیگم نے انا کو الگ کردیا کیونکہ اس کا دودھ خشک ہوچکا تھا.....

جس بھوک کو بجھانے کے لئے اس نے اپنی سترہ برس کی دعاؤں کو قربان کیا تھا۔ آج پھر وہی بھوک اسے ستارہی ہے۔

انعامی سوال

جولائی کے پرچہ میں جو انعامی سوال تھا اس کے اکثر صحیح جواب وصول ہوئے جن حضرات نے صحیح جواب بھیجے تھے انکے نام ایک جلد "آغاز خیال" کی روانہ کردی گئی

[illegible] صفحات [illegible] ورق [illegible]"

زندگی

حضرت نشتر سندیلوی

نگاہِ شوق کی تسکین ہی کبھی نہ ہوئی — کوئی عذاب ہوئی آہ! زندگی نہ ہوئی
جو دل پہ ایک نظر ہو کے پھر کبھی نہ ہوئی — ترس رہا ہوں کہ تجدیدِ زندگی نہ ہوئی
رہِ نیاز میں مٹنے کا اپنے غم کیسا — خوشی یہ ہے کہ تری اے فلک خوشی نہ ہوئی
جو دل کے جام کو لبریزِ بیخودی کردے — مرے نصیب! ادھر وہ نگاہ ہی نہ ہوئی
ہم اونکی جلوہ گہِ ناز میں تھے اک تصویر — نگاہ اوٹھ نہ سکی بات ہی کبھی نہ ہوئی
دلِ حزیں! تجھے اب کیا کریں، کہاں لیجائیں — چمن کو دیکھ کے بھی کچھ شگفتگی نہ ہوئی
یہ کس نگاہ سے دیکھا تھا حسنِ ظالم نے — کہ دل ٹھہر تو گیا، درد میں کمی نہ ہوئی
وہ اک خوشی، کہ جسے دل خوشی سمجھتا ہو — تمام عمر کبھی دل کو وہ خوشی نہ ہوئی

مفر ہوئی نہ غمِ زندگی سے اے نشتر
بسر یہ زیست! باندازِ زندگی نہ ہوئی

انتقام

(اضطراب کے لیے مخصوص)

جناب حاتم طائی صاحب

کردار

پریم لتا ——— ایک سترہ سالہ طالبہ
کشور ——— پریم لتا کا ہم جماعت طالبعلم عمر ۲۰ سال
شانتی ——— پریم لتا کی ماں عمر ۳۰ سال
کنور ——— پریم لتا کی سہیلی

پہلا منظر

ایک انگریزی طرز پر آراستہ کمرہ میں پریم لتا اور اس کی ماں چائے پی رہی ہے۔

شانتی۔ کل شام کو کہاں گئیں تھیں ...... پریا؟

پریم لتا۔ کشور کے یہاں۔

شانتی۔ کون کشور؟ (یہ پوچھتے ہوئے وہ گھبرا کر جھرجھری سی لیتی ہے لیکن پریم لتا کو اس کا احساس نہیں ہوتا)

پریم لتا۔ وہی میرا کلاس فیلو ...... کنور کا دوست۔ وہ مجھ سے بڑی محبت سے ملتا ہے اماں! کل اس نے دعوت کی تھی۔

شانتی۔ وہی جسکے گھونگھریالے بال ہیں؟

پریم لتا۔ ہاں۔

شانتی۔ چوڑا ماتھا؟

پریم لتا۔ ہاں

شانتی۔ نیلی آنکھیں؟

پریم لتا۔ ہاں ہاں وہی۔

شانتی چیخ مار کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور حلق میں اٹکتی ہوئی آواز میں کشور۔ کشور کہکر گر پڑتی ہے۔ پریم لتا گھبرا کر نوکر کو آواز دیتی ہے۔

نوکر۔ حاضر سرکار!

پریم لتا۔ ڈاکٹر کو لاؤ۔ ڈاکٹر کو ...... جلدی جاؤ۔

کشور۔ کیا ہے پریم لتا؟

پریم لتا۔ جلدی دیکھئے ماتا کو کیا ہوا جا رہا ہے۔

کشور۔ (نبض دیکھکر) کچھ نہیں کوئی پریشانی کی بات نہیں کسی صدمہ سے بیہوش ہو گئی ہیں۔۔۔ تھوڑا ٹھنڈا پانی منگوا دیجئے۔

پریم لتا دوڑ کر پانی لاتی ہے۔ کشور شانتی کے منہ پر چھینٹے دیتا ہے۔

شانتی۔ (ہوش میں آنے کے بعد کشور کو دیکھکر) کون۔ میرے پاس کون ہے۔۔۔ میں کہاں ہوں میں خواب دیکھ رہی ہوں؟

پریم لتا۔ آپ اپنے کرہ میں ہیں ماتا۔ آپ کے پاس کشور بیٹھے ہیں۔

شانتی۔ (آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوئے) کشور۔۔۔ کشور کیسے آئے۔

پریم لتا۔ آپ بیہوش ہو گئی تھیں۔۔۔ اگر یہ نہ آتے تو نہ معلوم میرا بھی گھبراہٹ میں کیا حال ہوا ہوتا۔ ایشور نے انہیں بھیجا۔ پانی کے چھینٹے دیکر آپ کو ہوش میں لائے ہیں۔۔۔ (دروازہ پر کان لگاکر) وہ لیجئے ڈاکٹر صاحب بھی آ گئے۔

ڈاکٹر۔ (اندر آکر) کیا بات ہے میڈم خیریت تو ہے؟

پریم لتا۔ ایشور کی دیا سے اب تو سب خیریت ہے (کشور کی طرف اشارہ کرکے) ان کی وجہ سے۔۔۔۔ ابھی پندرہ منٹ پہلے ماتا جی چائے پیتے پیتے ایک دم سے بیہوش ہو گئیں۔ میں تو ہکا بکا رہ گئی۔ مگر مسٹر کشور نے وقت پر خوب مدد کی۔

ڈاکٹر۔ خیر اب تو ہوش میں ہیں؟

شانتی۔ میں اچھی ہوں ڈاکٹر صاحب۔ پریما بچہ ہے گھبرا گئی نہیں تو کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں تھی۔ بس گرمی کا اثر تھا۔

ڈاکٹر۔ (نبض دیکھکر) بالکل ٹھیک۔۔۔۔ اور کوئی وجہ نہیں (میز پر چائے کی پیالیاں دیکھکر) غالباً آپ چائے پی رہی تھیں مگر اچھا یہ ہے کہ آج کل چائے کم کر دیجئے اور۔۔۔۔ اور کچھ پھلوں کا استعمال بھی کیجئے (سوچ کر)۔۔۔ کسی دوا کی ضرورت نہیں۔

شانتی۔ آج ہی سے آپ کی ہدایت پر عمل ہوگا۔۔۔ معاف کیجئے آپ کو بہت تکلیف ہوئی۔۔۔۔ بیٹی پریما! آپ کی فیس ادا کرو مطلب کا حرج ہوتا ہوگا۔

پریم لتا فیس ادا کرتی ہے۔ ڈاکٹر سلام کرکے باہر جاتا ہے وہ بھی اپنی ان کا حال پوچھنے کے لئے ساتھ چلی جاتی ہے۔

شانتی۔ (بیٹھتے ہوئے) ظالم کشور!

کشور۔ خاموش! خاموش۔ پریما آتی ہوگی!

شانتی۔ (تیز آواز میں) تم جانتے ہو میں بیہوش کیوں ہو گئی تھی۔

کشور۔ میں کیا جانوں۔

شانتی۔ تمہارا خوفناک نام سن کر۔۔۔ یہ معلوم کرکے کہ پریما تمہارے یہاں جاتی ہے۔۔۔ دعوتیں کھانے اور۔۔۔ دل کی بہلانے

کشور۔ یہ تم سے کس نے کہا؟

شانتی۔ پریما نے۔

کشور۔ پریم نے؟

شانتی۔ ہاں۔
کشور۔ اچھا پھر تمہارا مطلب؟
شانتی۔ کیا تم مطلب نہیں جانتے!
کشور۔ میں نہیں جانتا۔
شانتی۔ (کشور کے پیر پکڑ کر) ایشور کے لیے پریم لتا کے لیے میری بیٹی پر رحم کرو۔۔۔ تم اسے بھی برباد کرنا چاہتے ہو میری طرح۔۔۔ شرم شرم۔ وہ تمہاری اولاد ہے جائز یا نا جائز۔
کشور۔ (بگڑ کر) غلط۔ جھوٹ۔۔۔ بالکل جھوٹ۔۔۔ اگر وہ ہو سکتی ہے تو لسٹن کی اولاد۔۔۔ کیونکہ تمہارا اصلی شوہر تو شاید تمہارا منہ بھی نہیں دیکھ سکا کہ تم نے اس کو زہر۔۔۔۔۔
شانتی۔ (چیخ کر) آہ۔۔۔ آہ چپ رہو۔۔۔ ظالم۔۔۔ میری روح ان باتوں کے سننے سے کانپ اٹھتی ہے (آسمان کی طرف دیکھکر) ہے ایشور۔ جگ کرتار۔ مجھے معاف کر۔ مجھے بچا۔۔۔
کشور۔ (طنزیہ ہنسی ہنس کر) ایشور معاف کریگا۔ تمہاری جیسی ظالم عورت کو۔ ضرور معاف کریگا۔
شانتی۔ (بیقراری سے کشور کا منہ دبا کر) چپ رہو۔۔۔ بس چپ رہو اب کچھ نہ کہو۔۔۔ میری جان نکلی جاتی ہے، میری رگوں سے دم کھنچ رہا ہے (گڑگڑا کر)۔۔۔ رحم کرو۔
کشور۔ ہاں میں چپ رہ سکتا ہوں جب تم بھی میرے اور پریم لتا کے درمیان دخل نہ دو۔۔۔ ورنہ تمہارے کرتوتوں (خطوط) کا بھانڈا پھوڑ دیا جائیگا۔

شانتی کانپنے لگتی ہے۔ پریم لتا کے آنے کی آہٹ معلوم ہوتی ہے۔

کشور۔ (باتوں کا رخ بدل کر) اماں۔۔۔ سچ کہوں۔ میں پریم لتا کو چاہتا ہوں۔
شانتی۔ (حقارت سے دیکھتے ہوئے) تمہاری چاہت۔۔۔
کشور۔ (بات کاٹ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے) اور آپ جانتی ہیں کہ نہ میرے ماں باپ ہیں نہ بہن بھائی۔ بدانتظامی کی وجہ سے گھر برباد ہو رہا ہے اور جائداد تباہ۔۔۔ اس لیے شادی کی جلدی کرتا ہوں ویسے جو آپکی مرضی —

پریم لتا دروازہ کی آڑ میں کھڑی ہو کر یہ باتیں سننے لگتی ہے۔

شانتی۔ (کشور کی لال لال آنکھوں سے خوفزدہ ہو کر) تو مجھے کب انکار ہے۔
کشور۔ آپ دیکھیں گی کہ آپ کی پریم لتا مجھ سے کتنا خوش ہوتی ہے۔۔۔ (گھڑی دیکھکر) اچھا اب مجھے کافی دیر ہو گئی پھر حاضر ہونگا۔

کھڑا ہو جاتا ہے۔ کہ اتنے میں پریم لتا اندر داخل ہوتی ہے۔

کشور۔ (مسکرا کر) میڈم پریم لتا!۔۔۔۔ کہاں چلی گئی تھیں؟
پریم لتا۔ (نیچی نظریں کئے ہوئے) ناجی کی حالت پوچھتی ہوئی ذرا ڈاکٹر صاحب کے موٹر تک۔۔۔۔ تو کیا اب آپ جا رہے ہیں
کشور۔ ہاں۔۔۔ میں تو پانچ منٹ کے لیے آپ سے ایک کتاب مانگنے آیا تھا وہی لو یرکس (LOVELIRCS) مگر یہاں بہت دیر ہو گئی (مسکرا کر) پھر ملیں گے کالج میں۔

پریم لتا کشور کو کتاب لا کر دیتی ہے وہ چلا جاتا ہے

دوسرا منظر

کشور اپنی کوٹھی کے ایک کمرہ میں ہارمونیم پر گا رہا ہے۔ ابر گھر گھر کر آسمان پر ایک نئی تصویر بنا رہے ہیں کمرہ کی کھڑکی سے باہر کا منظر بہت دلکش ہے

گانا

بات کی اب سکت نہیں عاشق جاں نثار میں — چشم براہ ہے مگر آپ کے انتظار میں
حسن کے ساتھ ناز بھی جور بھی ہے جفا بھی ہے — ایک نہیں تو بس دغا ہے ستم شعار میں
جام و شراب و چاندنی اور کنار آب جو — آپ نہیں تو کچھ نہیں موسم صد بہار میں!

پریم لتا داخل ہوتی ہے مگر کشور کو گاتا دیکھکر چپکے سے اس کے پیچھے کھڑی ہو جاتی ہے۔ کشور بے خبر گا رہا ہے۔

جام و شراب و چاندنی اور کنار آب جو — آپ نہیں تو کچھ نہیں موسم لالہ زار میں!
عشق تمام کر گیا قصہ عاشق حزیں — آنکھ مگر کھلی رہی آپ کے انتظار میں!

پریم لتا کشور کی محویت پر ہنس دیتی ہے۔

کشور: (مڑ کر) خوب...... تم یہیں موجود ہو اور میں تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔

پریم لتا: اور میں بھی......

کشور: تو یوں کہو (مسکرا کر) دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی۔

پریم لتا: اچھا یوں ہی سہی (شرما کر سر جھکا لیتی ہے)

کشور: اچھا پریم! سچ کہو آج موسم کتنا پیارا ہے (کھڑکی کی طرف) اودی اودی گھٹائیں منڈلا رہی ہیں۔ مہین مہین پھوار پڑ رہی ہے...... ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لوریاں دے رہی ہے ایسے میں اگر جھولا نہ گاؤ تو کتنا ظلم ہے۔

پریم لتا: (مسکرا کر) تم ہی گاؤ نا۔

کشور: (منہ بنا کر) مجھے تو رونا آتا ہے۔ رو چکا...... دردمندوں کو گانے سے کیا مطلب۔

پریم لتا: اور میں بڑی سکھی ہوں دکھ سو چکی مگر خیر...... تمہاری خوشی کے لئے گاؤں گی۔

گانے لگتی ہے

بادل گرجے بجلی چمکے...... جیرا دھڑ دھڑ ہوئے
یاد کوئی کی کر کر کے...... مجرا مورا روئے

کشور کرسی کے پیچھے پر بیٹھ جاتا ہے اور مسکراتا جاتا ہے۔

بھولی بھالی جانت کا تیوں...... الفت ظالم ہوئے

کشور آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ اس کی گردن کے گرد ڈال لیتا ہے۔
ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھتے جاتے ہیں

نیناں جلوہ واکا ڈھونڈیں...... کیسے جوئے کوئے

کشور۔ (ایک دم سے رک کر) بس رہنے بھی دو اس گانے کو۔۔۔ اور طبیعت پریشان ہوگئی۔

پریم لتا۔ (ہنس کر) آپ کی خوشی کے لیے گایا تو پریشانی ہوئی اب پریشانی کے لیے گاؤں گی تو نہ معلوم کیا ہو۔

کشور۔ (سنجیدگی سے) کچھ نہو۔۔۔ خوشی ہو۔۔۔ لطف آئے۔۔۔ (انداز سے دیکھکر) اگر۔۔۔

پریم لتا۔ اگر؟

کشور۔ گانے گانے سے زیادہ کچھ تھوڑی سی پی لی جائے۔

پریم لتا۔ کیا چیز؟

کشور۔ (مسکرا کر) رنگین۔

پریم لتا۔ (تعجب سے) یعنی

کشور۔ شربت۔۔۔ جو میرے پاس ہے (اور آنکھیں جھکاتے ہوئے) اس الماری میں۔

پریم لتا۔ میں کچھ اور سمجھی۔

دونوں قہقہہ مار کر ہنس دیتے ہیں۔

کشور الماری کھول کر ایک بوتل سے دو گلاس بھرتا ہے۔

کشور۔ (ایک گھونٹ پی کر دوسرا گلاس پریم لتا کو دیتے ہوئے) پریم لتا! "لطف بہار کیا۔ جام و سبو نہ ہو اگر"

(پریم لتا کے پی لینے کے بعد) جان بہار زندگی موت ہے تو نہ ہو اگر"

آؤ پریم! آؤ ہم تم مل کر گائیں۔۔۔ پریت کی آج نوبت منائیں

دونوں گاتے ہیں

پھولوں میں ہم جھولا جھولیں۔ حسن ندی میں چھینٹے کھیلیں۔ پچھلے سب دکھ بھول ہی جائیں۔ عید منائیں عید منائیں۔

آؤ ہم تم مل کر گائیں۔۔۔ پریت کی آج نوبت منائیں

پریم لتا۔ رک کر، کتنا اچھا شربت ہے۔۔۔ جی چاہتا ہے اور پیوں۔

کشور۔ ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ابھی لاتا ہوں۔

تھرمس سے برف ڈال کر پھر پیتا ہے۔

پریم لتا۔ (پی کر) پیارے کشور۔۔۔ تم نے تو آب حیات پلا دیا معلوم ہوتا ہے کہ اڑی جا رہی ہوں۔

کشور۔ مگر پریا مجھے تمہاری یہ تعریف اچھی نہیں لگتی۔

پریم لتا۔ (کشور کے گلے میں ہاتھ ڈال کر) یہ کیوں؟

کشور۔ اس لیے کہ تم اس سے بھی زیادہ لطیف ہو۔ (ادا سے آنکھیں چلا کر)۔۔۔ جو اگر کسے کی تعریف کرے تو کیا بھلی معلوم ہوگی؟

پریم لتا۔ (کشور کو چڑھانے کے لیے) کتنا پیارا رنگ ہے اسکا!

کشور۔ یہ اسکا رنگ نہیں گلاس میں تمہارے گلگوں رخساروں کا عکس پڑ رہا ہے

پریم لتا۔ کیسا مزیدار ہے۔

کشور۔ تمہاری باتوں کا اثر پڑ گیا ہے۔

پریم لتا۔ کیسا نشہ ہے!

کشور۔ تمہارے لب بلبل سے چھو گیا ہے نا!

پریم لتا۔ (کشور کے سینہ پر اپنا سر رکھتے ہوئے دکھانے کو بگڑ کر) تم (میری ہی) ثنا خوانی کر رہے ہو۔

کشور۔ پھر کس کی کروں؟

پریم لتا۔ (چمک کر) اپنی۔۔۔ اپنی بھونرا جیسی آنکھوں کی۔ گھونگھر والے بالوں کی۔۔۔ چاند جیسے مکھڑے کی۔۔۔ اور

کشور۔ (پریم لتا کی پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے) اور اس چکدار پیشانی کی۔

پریم لتا اپنے جسم میں ایک پر لطف سنسناہٹ سی محسوس کرتی ہے۔ مگر پھر سنبھل جاتی ہے۔

پریم لتا۔ (بگڑ کر) آئیں یہ کیا کرتے ہو۔

کشور۔ کچھ نہیں پیاری۔۔۔ سچی اور بے لاگ محبت کی مہر۔

پریم لتا۔ (غصہ سے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں) تمہیں۔۔۔ اسکا۔۔۔ حق کیا ہے۔۔۔ ہٹو الگ۔

کشور۔ حق!۔۔۔ پیاری پریا۔۔۔ تمہیں نہیں معلوم کہ محبت کی نظر میں ہمیشہ کے لیے تم میری ہو۔۔۔ اور رواج کی نظر میں بھی ہونے والی ہو۔۔۔ بہت جلد۔۔۔ شاید آئندہ ہفتہ میں۔

پھر پیار کرتا ہے اور پریم لتا کے رگ و پے میں بجلی دوڑ جاتی اور نیند سی آنے لگتی ہے۔

پریم لتا (رک رک کر) بیشک۔۔۔ بیشک پیارے اب ہم اور۔۔۔ تم۔۔۔

کشور پریم لتا کے رخساروں کا بوسہ لیتا ہے۔

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا منظر

کنور کے مکان کا کمرہ۔ ایک بڑھیا، (دائی) بیٹھی ہے۔ پریم لتا آتی ہے۔

پریم لتا۔ کنور کہاں ہے؟

عورت۔ ابھی ابھی اپنی چچی کے یہاں گئی ہیں۔۔۔ بیٹھئے آتی ہونگی۔

پریم لتا۔ کتنی دیر میں آئینگی تم بلا لاؤ بوا۔۔۔ کہنا پریم تم سے ملنے آئی ہے بہت ضروری کام ہے۔

بڑھیا چلی جاتی ہے۔ پریم لتا بڑبڑانے لگتی ہے اسکا چہرہ اترا ہوا اور رنگ زرد ہے۔

"ظالم کشور۔۔۔ تو نے مجھے شربت میں شراب پلائی۔۔۔ اس طرح پہلے میری عقل پر ڈاکہ مارا پھر عزت پر۔۔۔ اب شادی سے بھی انکار کرتا ہے مجھے حقیر و ذلیل جان کر۔۔۔ بدکار اور بازاری عورت سمجھکر۔۔۔ (دانت پیس کر) آہ۔۔۔ تو نے کتنی معصوم ہستیوں کی چوری کی۔۔۔ کتنی شریف عورتوں کو کسبی بنا دیا۔۔۔ کتنی بے گناہ کنواریوں کی عصمت برباد کی۔۔۔ (آسمان کی طرف دیکھکر) اے پرمیشور مجھے ہمت دے کہ میں اس سے ان سب مظلوموں کا بدلہ لے سکوں۔۔۔ میری نسوانیت وقت پر مجھے دھوکہ نہ دیجائے۔۔۔ میری کمزوری میرے ارادوں کو ڈگمگا نہ دے۔۔۔ میری نزاکت مجھے بدحواس نہ کرائے۔۔۔ اور میرا انتقام عصمت کے ڈاکوؤں کے لیے عبرت آموز ہو۔۔۔"

کنور کے آنے کی آہٹ معلوم ہوتی ہے۔۔۔ پریم لتا خاموش ہو جاتی ہے۔

کنور۔ (اندر آکر) اخاہ بہن پریا۔۔ صبح ہی صبح اور۔۔۔ آج یہ تم زرد کیوں ہو؟

پریم لتا۔ کچھ نہیں۔۔۔ یونہی ذرا طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔۔۔

کنور۔ جبھی آج تین چار دن سے کالج نہیں آئیں۔۔۔ میں بھی اپنے چچا کے یہاں گئی ہوگی۔ نہیں تو دیکھنے ضرور آتی۔۔۔ مگر اب تو بالکل اچھی ہو؟

پریم لتا۔ ہاں پرماتما کی دیا ہے۔۔۔ مگر چھوڑو ان باتوں کو اس وقت میں ایک بہت ضروری کام سے تمھارے پاس آئی ہوں ——

کنور۔ کہو۔

پریم لتا۔ پہلے وعدہ کرو کہ جو میں کہونگی وہ مان ضرور لوگی۔

کنور۔ ہاں ماننے والی بات ہوگی تو انکار کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔

پریم لتا۔ نہیں اقرار کرو۔

کنور۔ اچھا ہوگیا اقرار۔

پریم لتا۔ پرسوں شام سے تم بیمار ہو جاؤ۔۔۔ یا بن جاؤ۔

کنور۔ بیمار ہو جاؤں یا بن جاؤں؟ کیسی بہکی بہکی باتیں کرتی ہو تم۔۔ ارے پرسوں تو کالج میں ڈرامہ ہے۔ اس میں ہیروئن کا پارٹ مجھ ہی کو کرنا ہے

پریم لتا۔ وہی تو میں کرنا چاہتی ہوں۔

کنور۔ اور ریہرسل۔؟

پریم لتا۔ اس سے اطمینان رکھو۔۔۔ میں نے سب یاد کرلیا ہے۔۔۔ تمھاری کاپی لے گئی تھی نا! اسی سے دیکھکر۔

کنور۔ اور ایکٹنگ؟

پریم لتا۔ آج تین دن سے کنور سے سیکھتی ہوں۔

کنور۔ اچھا۔ مجھے سناؤ۔

پریم لتا کردار کے بعض حصے عمل کیساتھ سناتی ہے جسے دیکھکر کنور حیرت میں آجاتی ہے

پریم لتا۔ کہو اب تمھیں اطمینان ہوگیا۔۔۔ اگر کوئی کمی رہ گئی ہو تو بتاؤ وہ بھی پوری کرلوں۔

کنور۔ نہیں نہیں۔ بہت اچھا ہے۔۔۔ مجھے تمھاری بات منظور ہے۔

پریم لتا۔ پیاری کنور! (مسکراکر) تم سنوگی کہ تمھاری پریم کتنا اچھا پارٹ کرتی ہے۔۔۔ اچھا اب جاتی ہوں۔

کنور۔ پھر کب آؤگی۔

پریم لتا۔ ایشور جانے۔ کہکر چلی جاتی ہے۔ (پردہ گرتا ہے)

چوتھا منظر

کالج کے ہال میں ڈرامہ ہو رہا ہے چوتھا منظر پیش نظر ہے کشور پھٹے ہوئے کپڑے پہنے فقیر کے لباس میں ظاہر ہوتا ہے۔ سر سے خون بہہ رہا ہے

کشور۔ آہ۔۔۔ آہ یہاں بھی نہیں۔ وہ حسن سراپا۔۔۔ وہ نور مجسم۔۔۔ عروج کمال۔۔۔ سبزہ جس کے قدموں پر لوٹتا ہے۔۔۔ چاندنی جس کے پیروں کو چومتی ہے۔۔۔ ماہتاب جس کی مشاطہ ہے اور۔۔۔ اور آفتاب جس کا غلام۔۔۔ دولت عزت۔ مال و منال

نہیں نہیں ہزاروں جانوں سے زیادہ عزیز نوشاد..... (پکارتا ہے) نوشاد! نوشاد! دنیائے محبت کی ملکہ نوشاد آ...... آ میرے سینہ میں سما جا میرے خون میں........ میری روح میں سما جا　　آسمان کی طرف دیکھ کر۔

میں بلاتا تو ہوں اسکو مگر اے جذبۂ دل　اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

(زور دار پر رک کر) آگئی... آگئی... میرا خود یہ کھینچ لایا! (پھٹی ہوئی آنکھوں سے سکتے کے عالم میں دیکھنے لگتا ہے)

پریم لتا شہزادی نوشاد کے لباس میں سہیلیوں کے ساتھ آتی ہے۔

پریم لتا۔ یہ فقیر کون ہے؟
ایک سہیلی۔ وہی ملکہ عالم کا عاشق جانباز... شہباز۔
پریم لتا۔ شہباز عیار... میرے عشق کا دعویدار۔
کشور۔ (چونک کر) نہیں نہیں... دلوں کی ملکہ... وہی وفا شعار آپ کا فرمانبردار۔
پریم لتا۔ (کرخت لہجہ میں) فرمانبردار! مجھے گلی گلی بدنام کرنے والے... کوچہ کوچہ رسوا کرنے والے... میری عفت و عصمت کا مذاق اڑانے والے... گریبان میں منہ ڈال اور پھر اپنی فرمانبرداری کی حقیقت دیکھ۔ ارے... شقی... ظالم... جابر
کشور۔ (ایک لمبی سانس لے کر) ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام　وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا۔
شاہزادی! مجھے جابر کہتی ہو... مجھے ظالم بتاتی ہو... مجھے شقی سے خطاب کرتی ہو جس کا سب کچھ تم نے لوٹ لیا صرف ایک نظر دیکھ لینے کے جرم میں...... یاد کرو تم اپنے نور محل سے جھانک رہی تھیں میں نیچے سے گذر رہا تھا تم نے کمان ابرو سے تیر مارا ایسا جچا تلا کر کلیجہ پر آ لگا۔ دل بیتاب ہو گیا۔ مگر تم...... آہ تم سچ مچ بھی سنگ دل ہو۔ پتھر اور لوہے سے زیادہ سنگ دل......
پریم لتا۔ خاموش او بے ادب خاموش ورنہ زبان گدی سے کھینچ لی جائے گی۔
کشور۔ (قہقہہ لگا کر) زبان گدی سے کھینچ لی جائے گی.... زہے نصیب جو تمہارے سامنے موت آئے... خوشا تقدیر جو مرتے وقت تم کو مسکراتا ہوا دیکھ لوں۔
پریم لتا۔ یہی بات ہے۔
کشور۔ سونا کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے اور قول عمل پر۔
پریم لتا۔ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔
کشور۔ بدل و جان۔
پریم لتا۔ (ایک سہیلی سے) جاؤ زہر قاتل کی بوتل لے آؤ۔

سہیلی بوتل لاتی ہے پریم لتا اپنے ہاتھ سے گلاس میں زہر انڈیلتی ہے

پریم لتا۔ (کشور سے) جانتے ہو یہ کیا ہے —— زہر۔
کشور۔ نہیں نہیں...... سکون قلب... آرام روح... راحت جان...
پریم لتا۔ اور تمہیں یہ پینا ہوگا۔
کشور۔ سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔

پریم لتا گلاس کشور کو دیتی ہے۔

کشور۔ (گلاس لیتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ کر) اے خدا۔۔۔۔ اے رحمن و رحیم تو گواہ ہے کہ میں خودکشی نہیں
کر رہا ہوں بلکہ کسی کا حال جہاں آرا میری محبت کا امتحان لے رہا ہے۔۔۔ اگر امتحان سے بھاگتا ہوں تو عشق شرمندہ ہوتا
ہے۔۔ وہ عشق جس پر کائنات کی بنیاد ہے وہ عشق جو گلشن حیات کی زینت اور باغ ہستی کی رونق ہے۔۔۔۔
اے حسن شاہد رہیو کہ میں نے محبت کی عزت رکھ لی ہے (پی جاتا ہے) میں نے الفت پر اپنی جان کی۔۔۔ قربانی
۔۔۔۔ خدا۔۔۔۔ دی۔۔۔ آہ۔۔۔۔ آہ

گر پڑتا ہے۔ مجمع تالیاں بجاتا ہے۔ دوبارہ دوبارہ کی آواز
بلند ہوتی ہے۔ ایک منٹ کے بعد کشور تڑپنے لگتا ہے
پریم لتا چیخ مار کر بیہوش ہو جاتی ہے۔۔۔ پردہ گرتا ہے
پانچ منٹ کے بعد اسٹیج کے اندر سے شور کی آواز آتی
ہے ایک شخص بہت پریشان ہو آتا ہے اور کہتا ہے۔

"حضرات! شہباز کے اداکار مسٹر کشور کی حالت بہت خراب ہے۔ خیال ہے کہ انھیں اصلی زہر دے دیا گیا۔۔۔ اور
میڈم پریم لتا بھی بیہوش ہیں۔ مجمع میں اگر کوئی ڈاکٹر ہوں تو فوراً چلے آئیں۔"

ڈراپ

مکتبہ جامعہ

ہمارا ادب اب ایک نئے انقلابی دور سے گذر رہا ہے۔ دنیا میں روز نئے نئے تغیر ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ تحریر و تقریر کے ذریعہ عوام کی صحیح رہنمائی کی جاتی۔ مکتبہ جامعہ نے اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ ایک طرف اس نے اپنی مطبوعات کے ذریعہ قدیم ادب کے بیش بہا ذخیروں کو ایک جگہ جمع کر کے آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے اور دوسری طرف جدید ادب کے نئے رجحانات سے بھی غافل نہیں رہا ہے۔ یہ ایک ایسا قابل فخر کارنامہ ہے جسے بہی خواہانِ ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ساتھ ہی ساتھ مکتبہ نے اپنی تمام مطبوعات کو پبلک کے لیے نہایت دیدہ زیب صورت میں پیش کیا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ہمارے کتب فروش کسی بازار کی ایک چھوٹی سی میلی کچیلی کتاب میں اردو ادب کے شہ پارے بادامی رنگ کے سڑے ہوئے کاغذ پر چھپوا کر بیچا کرتے تھے۔ کاروباری حیثیت سے پنجاب کے چند اداروں نے اس طرف توجہ ضرور کی تھی لیکن اُن کا مقصد ادب کی خدمت سے زیادہ اپنی تجارت کو فروغ دینا تھا۔ اب جامعہ نے حیرت انگیز طریقہ پر اس کمی کو پورا کیا ہے اور ملک کے پڑھے لکھے طبقے نے اس کی کوششوں کو سراہا بھی ہے لیکن افسوس ہے کہ عوام نے اب تک اس قابل قدر مکتبہ کی کچھ بھی ہمت افزائی نہیں کی۔ اگر ہمارے سکوت و جمود کا یہی عالم رہا تو وہ دن دور نہیں جب کہ صفحۂ زمین پر اُردو ادب کا ایک نام لیوا بھی نہ باقی رہے گا

(ادارہ)

مسلم سے خطاب

جناب کامل رشید صاحب

باخبر اے صف شکن! اے مردِ غازی ہوشیار سینۂ گیتی میں برپا ہو رہا ہے خلفشار
تہ نشیں موجیں ابھرنے کے لیے ہیں بیقرار اور تو بے فکر ہے افسوس اے غفلت شعار
اُٹھ کہ اب ہونے کو ہے اسرارِ ہستی بے نقاب
ہونے والا ہے زمانے میں نرالا انقلاب

ساری دنیا پر مسلط ہے نیا جوشِ شباب آ رہی ہے ذرہ ذرہ سے صدائے انقلاب
آنے ہی کو ہے سوا نیزہ کے اوپر آفتاب ساری قومیں جاگتی ہیں اور تو ہی محوِ خواب
تیری ہستی اس طرح حسرت سے دامنگیر ہے
درد و غم کی گویا جیتی جاگتی تصویر ہے

تو ہے وہ گم کردہ منزل جسکی منزل ہی نہیں اور منزل ہے اگر تو جذب کامل ہی نہیں
کیا ملے لطفِ چمن شورِ عنادل ہی نہیں کشتیِ مسلم کا یعنی کوئی ساحل ہی نہیں
اب خدا کے واسطے خانہ بدوشی چھوڑ دے
بت شکن مشہور ہے تو بت پرستی چھوڑ دے

تھا کبھی اوجِ ثریا پر ترا قومی نشان ہر گھڑی دم تیرا بھرتے تھے زمین و آسماں
سجدہ گاہِ زندگی تھا ایک تیرا آستاں منزلِ مقصد سے تھا نزدیک تیرا کارواں
آہ کل تک حال تیرا کیا تھا اور کیا آج ہے
تیرا دل محکوم ہے غیروں کے سر پر تاج ہے

مذہب

نسیم سندیلوی

میں مذہب کو زندگی سے ملا کر دیکھتا ہوں۔ پیشواؤں اور عقیدتمندوں سے اس کی سچائی کا اندازہ لگاتا ہوں — کتابیں تو سب ہی اچھی ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان مذہبی کتابوں پر چلنے والے کیا ہیں — اور انھیں کہاں تک پاس ہے وہ کس حد تک اپنے پیغمبر کے، اپنے دیوتاؤں اور رشیوں کے بنائے ہوئے اصولوں پر کاربند ہیں۔

آج فرقہ وارانہ فساد کی آواز سن کر ہر شخص کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اکثر مجھ کو بیٹھتے ہیں۔ جاہل انسان کا ذکر کیا۔ ان کی تو بیچارگی مشہور ہے۔ یہاں تعلیم یافتہ طبقہ کا یہ حال ہے کہ ذاتی مفاد کے لیے، لیڈر بننے کے شوق میں سیکڑوں بیگناہوں کا خون بہا دیتے ہیں۔ اپنی تقریروں سے اپنے قلم سے لوگوں میں نفرت کی آگ بھڑکاتے ہیں۔ بڑھتی ہوئی لپک کو ہوا دیتے ہیں۔ فرقہ وارانہ اشتعال پر تیل چھڑکتے ہیں۔

کیا اسی کا نام مذہب ہے؟ کیا یہی مذہب کی ساری کتھا ہے؟

ایک طرف اسلام خطرہ میں ہے۔ دوسری طرف گاؤکشی سے ہندوؤں کی مذہبی بنیاد متزلزل ہے۔ سنڈے اسکول کے عام نہ ہونے سے عیسائی ناداں ہے۔ ایک دوسرے سے لڑنے کو ہزاروں بہانے ہیں لیکن خدا کی وحدانیت پر جب کا ہر شخص قائل معلوم ہوتا ہے اتحاد کسی میں نہیں۔ مسلمان خدا پر سو جان سے فدا ہے۔ ہندو ایشور، ایشور کی دھن لگائے ہے، عیسائی گاڈ کے گیت گاتا ہے۔ مسلمان کو یقین ہے کہ ایشور وہی ہے جسے وہ خدا کہتا ہے۔ ہندو سمجھتا ہے کہ گاڈ اور ایشور دونوں ایک ہیں۔ عیسائی جانتا ہے کہ گاڈ اور خدا میں کوئی فرق نہیں، اُردو کے ایک پرانے مشہور دکنی ادیب کی زبان میں: "ایک کلمہ کا فرق ہے باقی خدا کی وحدانیت میں ہندو ہور مسلمان فرق ہے" ؎۱

لیکن ......؟

اس پر بھی مسلمان کتھا سن کر کانوں پر ہاتھ رکھتا ہے۔ ہندو خدا کا نام سن کر رام رام جپنے لگتا ہے۔ عیسائی کلمہ سن کر منہ پھیر لیتا ہے
بنیادی اصول سب کے ایک ہیں سچائی ہر مذہب کی پشت پناہ ہے۔ ہر مذہب اچھائیوں کا رہبر ہے۔ برائیاں کسی کو نہیں بھاتیں
لیکن ......؟

پیشواؤں کے لیے بھی تو کچھ کام چاہیئے۔ اگر مذہب کو اتنا ہی آسان بنا دیا جائے تو پھر ہمارے سجادہ نشین، گرو مہاراج اور فادر کیا کریں گے۔ ان کی زندگی کے لیے آپس کی منافرت کا زندہ رہنا ضروری ہے۔ بنیادی اصول نہ سہی ان کے خود کے بنائے ہوئے من گھڑت مسائل تو ہیں۔ مسلمان کے چھو جانے سے ہندو کی رسوئی ناپاک ہو جاتی ہے۔ ہندو کے باجہ بجانے سے محرم کے جلوس کی توہین ہوتی ہے۔ یہ گتھیاں کون سلجھائے گا؟

فرقہ وارانہ لڑائیوں کے لیے چندہ ہوتے ہیں۔ علما جہاد کے فتوے دیتے ہیں۔ غیر جانبدار لوگوں کی زندگی وبال ہو جاتی ہے۔ شہر کے امن کے لیے حکام بندشیں لگاتے ہیں۔ باہر والے ہنستے ہیں اور یہ ہیں کہ کانٹے کو دوڑتے ہیں۔ بھونکتے ہی چلے جاتے ہیں۔ جب ذرا شور کم ہوا تو پھر ایک شگوفہ چھوڑ دیا۔

؎۱ [illegible] ص ۱۲۰

ہزاروں مسلمان۔ بھوک سے فاقہ کرکے جان دیتے ہیں۔ لیکن متمول ہستیوں کی رواداری اس بات کی متقاضی نہیں ہوتی کہ دو وقت کی روٹی تک کا انتظام کر سکیں۔ جو دو ایک یتیم خانہ ہیں ان کی اقتصادی اور مالی حالت دگرگوں ہے۔ دو ہو آشرم کے گہوارے بیچاری بے بس بیواؤں کی عصمت سے کھیل رہے ہیں اور ان پر دینی نظر کرنے والا نہیں۔ غریبوں کے بچے گلی کوچوں میں اپنی تعلیم کا وقت بیکار گنواتے ہیں لیکن ان پر کوئی ترس نہیں کھاتا۔ بڑی بڑی دعوتوں میں۔ جی حضوری کی پکار میں ہماری دولت سے تو دیگیں چڑھاتے ہیں۔ اپنی بھونڈی اور بھدی آواز سے ایک نغمہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ نغمہ جو غریبوں کا خون چوس کر ان کو لاچار کرکے۔ انکی محنت کی کمائی ان سے چھین کر اپنے مصرف کے لئے سامراجی مندر میں دولت کی دیوی کے چرنوں پر اس کی پوجا کے لیے۔۔۔ اسکو خوش کرنے کے لیے لایا جاتا ہے۔۔۔ وہ اس قصر شاہی میں دوش بدوش چل کر غریبوں کی امیدوں کو۔ اُن کی بڑھتی ہوئی تمنگوں کو پامال کر رہا ہے ہیں۔ یہی حضرات محل شاہی کے جگمگاتے مینار پبلک میں آکر ایک دوسرے کو کوستے ہیں۔ اپنی عیاشی پر ہزاروں روپیہ برباد کرتے ہیں لیکن ہم وطنوں پر کوڑی خرچ کرتے دم نکلتا ہے۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند چوں بخلوت میروند آں کار دیگر می کنند (حافظ)

ہم جانتے ہیں کہ ان بہروپیوں کی جن کی خانگی زندگی پبلک کی زندگی سے بالکل مختلف ہے۔ جو پلیٹ فارم پر آکر ایمان کے وقتی جوش میں سوڈا واٹر کی بوتل کی طرح اُبل پڑتے ہیں لیکن عشرت کدہ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر ساقی و مینا کو صد ہا سجدہ کرتے ہیں۔ جنھوں نے ابتک اپنے لوہے کے پنجہ میں ہزاروں بے بس انسانوں کو مقید کر رکھا تھا آج انکی محفلیں بھی سونی ہو رہی ہیں۔ ان کے پنجوں میں زنگ لگ چکا ہے اور اب وہ وقت دور نہیں کہ انکے اس خونی پنجہ کو خون سے ہی پاک کیا جائے گا۔ ستار کے تار رفتہ رفتہ ٹوٹ رہے ہیں۔ اب ان پر من مانے گیت نہیں گائے جا سکتے۔ وہ وقت کے پابند ہیں۔ وقت کا طمانچہ ان پر اس قدر زبردست لگنے والا ہے کہ صدیوں تک پانچوں انگلیوں کے نشان انکے گندمی گالوں پر نمایاں رہیں گے۔ وہ وقت دور نہیں کہ وہ ساز و نغمہ کی محفلیں چھوڑ کر کاسۂ گدائی لئے دربدر مارے مارے پھریں گے۔ وقت بدلے گا۔ انقلاب ان لوگوں کے جھلسے ہوئے سیاہ داغ والے دلوں کا گرد فریب زمانہ کی گردش سے مٹا دیگا۔ جو آج ساقی کے سامنے ایک جرعہ آخریں کے لیے سرنگوں ہیں وہ کل دہقان کے قدموں پر زندگی کی بھیک مانگیں گے اور ہمارے سادہ لوح صاف دل لیکن مفلس کسان انھیں ان ہی کے کارنامہ سنا کر ان پر لعنت کریں گے۔ اس وقت ان کا یہ مذہب کا جال جسے لئے وہ مچھیروں کی طرح بھولی مذہب پرست مچھلیوں کو شکار کرکے اپنی غذا بنا رہے ہیں۔ اس قدر بحیثیت ہوگا کہ اس پھندے میں مچھلی تو کہاں گھاس پھوس بھی آنا پسند نہ کریگا۔ ان کے چہروں پر زمانہ کی لعنت کی مکھیاں بھنبھنائیں گی اور ان کے وقت سے شل کئے ہوئے ہاتھ اس قابل بھی نہ رہیں گے وہ ان کو اڑا سکیں۔

لاوارث کی موت پر کوئی چار آنسو نہیں بہاتا۔ کسی کو اس کے کفن کی فکر نہیں اسکی آخری رسم ادا کرنے والا بھی نہیں ملتا لیکن ——— ؟

اگر اس کے اعتقاد پر ذرا بھی تفرقہ کی جھلک ہو سکتی ہے تو ایک طرف مسلمان صف آرا ہو جاتے ہیں دوسری طرف ہندو ڈھول بجاتے آتے ہیں۔ کلیسا کی گھنٹیاں بجا کر پادری گرجے کے دریچوں سے جھانکتا ہے اور اس بات کا منتظر رہتا ہے کہ ان دونوں میں چل جائے تو پھر اپنی جنت کی ہواؤں سے سربسجدہ ہو کر کہوں کہ کاش مجھ میں آج وہ طاقت دیتی کہ [illegible]

پھر ہم اس کے استقبال کے لیے چشم براہ ہو جائیں گے اور کلیسا کے سب سے شاداب چمن میں اسکی میت کو اتنی تمازی جگہ دیں گے۔ وہ جگہ جو آنے والی نسلوں سے بزبان خامشی یہ کہہ سکے کہ بیسویں صدی کے دور میں بھی عیسائیوں کی روحانیت قابل ستائش تھی
کیا یہی مذہب ہے ؟

جس نے جودوں کو لیا اُت کچھ کسی کو ں دیا
ہزار کعبہ بنا دیا ہزار حج لی کیا (دہبی)

مذہب انسانیت کا نام ہے۔ انسانیت مذہب ہے۔ خدمت خلق کا اختیار مذہب۔ انسان کو انسان سے زیادہ اور کیا چیز عزیز ہو سکتی ہے۔ اگر کسی شخص میں صرف انسانیت کا جذبہ ہے اس کی آنکھیں یتیم کو دیکھکر نم ہو جاتی ہیں۔ بیوہ کو دیکھکر اس کے دل میں ہمدردی کی ایک لہر پیدا ہوتی ہے غمگین کی پیشانی سے وہ بیچارگی کا پسینہ اپنے دامن سے پونچھتا ہے۔ غریب کی مدد کرتا ہے۔ اندھے کی لاٹھی پکڑکر اسے راستہ بتاتا ہے مسافر کو وہ اپنی منزل تک پہونچنے میں مدد دے کر اسکی مشکل کو دور کرتا ہے۔ بوڑھی اور لاچار عورت کو اسکے جوان بچے کی موت پر دلاسا دیتا ہے سہاگن کے بیوہ ہو جانے پر سماج سے باغی ہو کر اسکے لیے ایک دوسرا جیون لگاتا ہے۔ جاہل کو جو ہر تعلیم سے جوان کرتا ہے۔ وہ شخص اس دنیا کا قائد اعظم ہے۔ اس کے مذہب کو جس کا کلمہ انسانیت ہے جس کا پیغمبر صداقت جس کا خدا صاف طینت ہے اسکو زمانے کے مذہبی اپنی شریعت کے غبار میں اڑکر بھی چھو نہیں سکتے پنڈتوں کے رنگ برنگ سجے ہوئے ماتھے اپنی خود بینی کی کھڑاؤں پر بھی اگر ڈیرا اس کی جلا نہیں پا سکتے۔ پادری اپنے تمام کلیسائی نغموں میں حقیقت کے متلاشی اگر چاہیں کہ اس انسان کے سرور کو پہونچ جائیں جس کا مذہب انسانیت ہے تو ان کے لیے یہ ناممکن ہے۔

مذہب کی بیجا پابندیوں سے خود ساختہ رسوم نے ان تمام کو اسقدر محدود کر دیا ہے کہ وہ جتنا روحانیت سے قریب تر ہونا چاہتے ہیں اتنا ہی مذہب کی خود نمائی انہیں اپنے بنائے ہوئے دائرے کا چکر لگاتے رہنے پر مجبور کر دیتی ہے یہ مذہبی ترشح جس سے انکی تمام امیدیں وابستہ تھیں تب بھی ارسے وہ سمجھتے تھے کہ انکے چمن کی کایاں شباب لائیں گی جنھوں نے کلید جنت اپنے ہاتھ میں لیکر دوسروں کو شمع دکھلانے کا دعویٰ کیا تھا۔ آج وہ چراغ ٹمٹما رہا ہے۔ وقت جلد ہی اس کو چراغ سحری بنانے کا منتظر ہے پھر اس مذہب کے اندھیرے میں پیشوا دیوانہ وار خود ہی سہارے کی تلاش میں اپنے بھاری بھرکم لبادے اتار کر سچائی کی طرف دوڑیں گے انکو معلوم ہو جائیگا کہ عوام سے مذہب کی آڑ لیکر اپنی پرستش کرانا انکا کام تھا انکا کام روحانیت کے سبق پڑھانا اور انکی اخلاقی قوتوں کو ابھارنا تھا مندر میں سونے کی مورتی رکھکر داسیوں سے رقص کرانا مسجد میں گھی کے چراغ جلا کر بھولی بھالی عورتوں سے مرادوں کی دعا منگوانا کلیسا میں دہریہ جبینوں پر پاک پانی کی چند بوندیں ڈال دینا۔ پادری سے گناہوں کا اعتراف کر لینے پر حضرت عیسیٰ کے دامن سے فراک کو خیالی گٹھا میں منسلک کر دینا پاپیوں کی کبھی نہ بجھنے والی جلتی ہوئی آگ میں صندل کی لکڑی ڈالکر گناہ کا کفارہ دیدینا۔ ان سب سے انسانیت کو کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ اور وہ مذہب جو انسانیت کو اونچا نہ کر سکا اسکے پیرو زندگی کی جد وجہد کا کیا مقابلہ کر سکیں گے۔

ہمارے مذہبی پیشوا یہ سمجھتے ہیں کہ ماتھوں پر سجدوں کے نشان۔ سفید داڑھیوں پر عطر کی خوشبوئیں۔ صاف جبینوں پر سیندور کی لکیریں سینوں پر صلیب کے نشان انکی مغفرت کرائیں گے۔

لیکن شاید وہ یہ نہیں جانتے کہ زندگی کا مقصد غریب دوستی علم پرستی۔ جذبہ انسانیت۔ سماج کی بندشوں سے بغاوت انسانیت کے حقوق کی حفاظت اور اسکی ہمدردی ہے۔ یہ زندگی کا مذہب ہے جو مذہب زندگی کے مسائل حل نہ کر سکا کیا وہ مذہب مذہب کہا جا سکتا ہے ؟

سینما ——

ہندوستانی فلم

جناب سید خورشید احمد صاحب

"فلم اور ہماری زندگی" کے عنوان پر کافی لکھا جا چکا ہے اور یہ بتایا جا چکا ہے کہ ہماری زندگی اور سینما میں بہت گہرا تعلق ہے ایسی صورت میں اچھے اور برے فلموں کا ہماری زندگی پر اثر انداز ہونا ضروری ہے، اگر فلم برے ہیں تو وہ نہ صرف ہمارے اخلاق کو گندہ کریں گے بلکہ ہمارے ذوق کو پست بنانے کے بھی بہت حد تک ذمہ دار ہوں گے اگر یہ مان لیا جائے کہ "ذوق کسی قسم کا بھی ہو خود نہیں پیدا ہوتا بلکہ پیدا کیا جاتا ہے" تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ سینما کا صحیح ذوق بھی فلموں ہی کے ذریعہ پیدا کیا جا سکتا ہے اور اس کی تمام تر ذمہ داری فلم سازوں پر ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملک میں جس قسم کے فلم کی مانگ ہوتی ہے ویسی ہی تصویریں بنتی ہیں۔ اچھے اور برے کا انحصار پبلک پر ہے فلم ساز اس کے لئے ذمہ دار نہیں ہو سکتے مگر اس خیال کو زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی کیونکہ جہاں فلم تفریح کا سامان ہیں وہاں وہ اپنا دیرپا اثر ہمارے ذہنوں اور دماغوں پر چھوڑتے ہیں اگرچہ یہ اثر بالکل غیر شعوری ہوتا ہے مگر ہے یہی کہ ہم ان سے برابر اثر قبول کرتے رہتے ہیں اور چپکے چپکے وہ ہماری ذہنیتوں میں بھی انقلاب پیدا کرتے رہتے ہیں اور یہی ذہنی انقلاب آگے بڑھ کر ساری زندگی کو تبدیل کر دیتے ہیں اور ہر شعبہ حیات پر حاوی ہو جاتے ہیں۔

مگر افسوس ہے کہ ہمارے ملکی فلم ساز اس اہمیت کو بہت کم محسوس کرتے ہیں اور اب بھی شاید انھیں اس کا احساس نہیں ہندوستانی فلم انڈسٹری کی جو حالت ہے اسے دیکھ کر دکھ ہوتا ہے تکلیف پہونچتی ہے اب بھی جب دنیائے فلم میں انقلاب پیدا ہو چکا ہے دیگر ممالک میں یہ انڈسٹری کہاں سے کہاں پہونچ چکی ہے اس کی اہمیت کو محسوس کر کے اس سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے ہندوستان میں فلمی کند ذہنی کا یہ عالم ہے کہ یہاں نوے فیصدی بلکہ اس سے بھی زائد فلم ایسے بنتے ہیں جو محض "ہیچ گوئی" اور لغویات سے پر ہوتے ہیں بات یہ ہے کہ فلم ساز حضرات اس انڈسٹری کو آنکھ بند کر کے مستقل آمدنی کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں انھیں اس سے غرض نہیں کہ اس کا معیار پست ہو رہا ہے یا بلند، کمائی بجائے نفع کے نقصان ہو رہا ہے یا حقیقتاً اسے کچھ مل رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے پیش نظر کوئی اصلاحی پروگرام ہے اور نہ ان کا مقصد اسے ترقی دینا، انھیں صرف اپنی تجوریاں بھرنے سے کام ہے اور بس، آئے دن سینما گھروں میں "ہری کین ہلسا" "سائیکل والی" کے سے فلموں کی نمائش ہوتی رہتی ہے، ایسے فلم دیکھ کر ہمارا فلمی ذوق ہی پست نہیں ہوتا بلکہ ہمارے خیالات، جذبات اور احساسات کا غلط استعمال بھی، اس طرف سے غفلت اور بے حسی کا یہ نتیجہ ہوگا کہ ہمارے سامنے کبھی کوئی معیاری فلم نہ آ سکے گا اور نہ یہ انڈسٹری کبھی پایۂ تکمیل تک پہونچ سکے گی۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں تعلیمی فقدان کے سبب عوام میں بالعموم معیاری فلم پسند نہیں کیجا سکتی ہیں جس کی وجہ سے ہماری ذہنی اور دماغی قوتیں بیدار نہیں ہیں احساسات میں حس و حرکت اور ستھرا پن نہیں ایسی صورت میں یہ امید کرنا کہ ہم معیاری فلم پسند کریں گے ایک بے معنی سی بات ہوگی مگر جیسا میں کہہ چکا ہوں کہ ذوق خود نہیں پیدا ہوتا بلکہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ فلم دیکھنے والوں پر غیر محسوس طور پر اثر پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ تعلیمیافتہ

اور غیر تعلیم یافتہ کی کوئی قید نہیں وہ دونوں طبقوں پر یکساں اثر انداز ہوتا ہے، اگر شروع سے ہمیں اچھے اور معیاری فلموں کا عادی بنایا جاتا تو ہم کبھی لغو اور لچر فلم پسند نہ کرتے۔ ہماری ذہنی تربیت اس لائن پر ہوتی اور عوام کی پسند اور غیر تعلیم یافتہ کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان میں مشکل سے ایک یا دو فلموں کے علاوہ اور کوئی فلم ایسا بنا ہو جس سے کسی قسم کا اصلاحی کام لیا جا سکے خواہ وہ معاشی اور تمدنی اصلاح ہو یا فلمی کور ذوقی کی اصلاح، اگرچہ ہر فلم کی نمائش کے وقت یہ پروپیگنڈا ضرور ہوتا ہے کہ معاشی اور تمدنی مسائل بہترین طریقہ سے حل کئے گئے ہیں۔ ہندوستانی سماج کو عمدہ طور پر پیش کر کے اس کی گتھیوں کو سلجھایا گیا ہے وغیرہ وغیرہ مگر محض پروپیگنڈا ہوتا ہے اصلیت سے اسے کوئی سروکار نہیں ہوتا ہر اسٹوری کا پلاٹ تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ ہمارے سامنے رکھ دیا جاتا ہے، کوئی صاف وصریح بات نہیں بتائی جاتی کہ سوسائٹی کی اصلاح ان طریقوں سے ہو سکتی ہے ممکن ہے کہ فلم اپنے ٹکنیک کے لحاظ سے مکمل ہو مگر مختلف شعبہ جات کی اصلاح کا عنصر اس میں بالکل نہیں ہوتا اس کی جگہ رنگ رلیاں موسیقی اور رقص وغیرہ لے لیتی ہیں مجھے اعتراف ہے کہ فلم انڈسٹری نے اپنی پچیس چھبیس سالہ زندگی میں کافی ترقی کی ہے لیکن یہ ترقی محض ٹکنیک تک محدود ہے، اس نے ایسے ایسے اداکار ضرور پیدا کر دیے ہیں جو اداکاری میں ہالی وڈ سے پیچھے نہیں ہیں ہمارے بعض فنکار اس وقت فن اداکاری میں آسمان فلم کے درخشاں ستارے بنکر پوری آب وتاب سے جگمگا رہے ہیں دیکھنے میں یہ الفاظ اور ان کا یہ مجموعہ بیحد دلکش اور جاذب معلوم ہوتا ہے لیکن غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ انھیں رنگین پردے کے پیچھے کیا سمجھا آج سے پچیس چھبیس سال پہلے جب فلمی دور کا آغاز ہوا تو اسے ایک مستقل چیز بنانے اور عوام تک پہنچانے میں کافی دشواریاں اور دقتیں پیش آئیں جیسا کہ عموماً ہر نئی چیز کو رائج کرنے میں ہوتا ہے مگر کارکنان کے استقلال اور ان کی انتھک کوششوں نے انھیں اپنے مقاصد میں کامیاب بنایا۔ سنیما نے بھی اپنی جگہ پیدا کی اور گوشہ گوشہ میں پھیل گیا، لوگ اس طرف متوجہ ہوئے اور یہ صنعت ترقی کرنے لگی۔ سیکڑوں کمپنیاں کھلیں اور ہزاروں آرٹسٹ مہیا ہو گئے، فلم سے متعلق بہت سی چیزوں، مثلاً اداکاری، میک اپ اور ڈائرکشن وغیرہ پر لوگوں نے قابو پایا۔ جہاں تک اس قسم کی ترقی کا تعلق ہے اس کا اعتراف میں اوپر کر چکا ہوں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہم صرف ان ترقیوں سے مطمئن ہیں، کیا اس صنعت سے اور کوئی کام نہیں لیا جا سکتا، کیا ہم اسے صرف تفریح محض کا آلہ بنائے رہیں گے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو ہمیں پوری قوت کے ساتھ یہ بتانا چاہیئے کہ اس صنعت کا صحیح مصرف کیا ہے تفریح کے ساتھ ساتھ اس سے ملکی فلاح وبہبود کا کام بھی لینا چاہیئے، فلم ساز حضرات سے یہ توقع رکھنا کہ وہ خود اس طرف متوجہ ہوں گے بالکل بیکار ہے اس لئے کہ ان پر جذبۂ زرگیری اس طرح قابو پا چکا ہے کہ وہ بھول کر بھی ملک کی بہتری کا خیال نہیں کر سکتے حالانکہ اس تجارت کے ساتھ ساتھ ان کا اولین فرض یہ ہونا چاہیئے تھا کہ وہ ہمارے سامنے مستقل اصلاحی پروگرام رکھتیں، ہمیں سیاسی، اقتصادی، معاشی اور تمدنی ترقیوں کا راستہ دکھاتیں، بہرحال اب ہمیں صرف اس بات سے مطمئن نہیں ہونا چاہیئے کہ صنعت فلمسازی نے عمدہ عمدہ آرٹسٹ، پروڈیوسر، کامیاب ڈائرکٹر اور کیمرہ مین پیدا کر دئے ہیں۔

ہندوستان آج کل جس ہنگامی دور سے گذر رہا ہے اس سے ہر شخص واقف ہے، ہمارے اضطراب، بےچینی اور ہیجان کا یہ تقاضا نہیں کہ ہمیں "الہ دین کا چراغ" "علی بابا اور چالیس چور" کے قصوں اور حسن وعشق کی فرسودہ روایتوں میں الجھا رکھا جائے، اب ایسے فلم جن میں محبت کا مذاق عریاں اور بہیمانہ جذبات کے ذریعہ اڑایا گیا ہو قطعی بیکار ہیں، وہ زمانہ بھی نہیں رہا کہ ہم مذہب اور اس کے محیر العقول کرشموں اور تماشوں سے پر تصویروں کو

پسند کریں۔ ضرورت ہے کہ ملک میں ایسے فلم تیار ہوں جو ذہنی ہیجان میں سکون پیدا کر سکیں جنہیں دیکھ کر ہم میں حب الوطنی، یکجہتی، محبت، اخوت اور اخلاق کا جذبہ پیدا ہو سکے اور ہم ان کے معنی سمجھ سکیں۔ اگر دوسرے ذرائع ہمارے خیالات، جذبات اور تاثرات میں انقلاب پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو میرے خیال میں تنہا اس کام کو بدرجہ احسن انجام دے سکتے ہیں۔ فلم کے ذریعہ ہماری سوئی ہوئی قومیں بیدار کی جا سکتی ہیں فلم تعلیم کا بہترین ذریعہ بن سکتے ہیں چنانچہ بیدار ملکوں میں بہت سے مضامین ایسے ہیں جن کی تعلیم فلم کے ذریعہ ہوتی ہے۔ سیکڑوں مسائل ہیں جن کا تعلق براہ راست ہماری روزمرہ کی زندگی سے ہے ان کی گتھیاں بھی فلم کے ذریعہ سلجھائی جا سکتی ہیں کاش ملک کی اس مانگ کی اہمیت کو ہمارے فلمساز محسوس کر سکیں اور اپنی تجارت کے ساتھ ساتھ ملک کی کچھ خدمت بھی کریں۔

تنقید

سینما کے پردے پر

کم کم - یہ ایک نادار رقاصہ کی کہانی ہے جو اپنی غریبی کی وجہ سے در بدر ناچتی گاتی پھرتی ہے اور اس طرح بھیک مانگ اور چوری کر کے اپنا پیٹ پالتی ہے دوسری طرف ایک انسان دولت کے نشے اور عزت کی ہوس میں غریبوں پر درپردہ ظلم کرتا ہے اور بظاہر لیڈری کر کے ان کی ترقی اور اصلاح کے لئے ہر ممکن کوشش کرنے سے باز نہیں آتا اس نے کم کم کے بوڑھے باپ پر بھی مظالم کئے ہیں اس نے غریب کا ڈرامہ چرا کر اپنے نام سے اُسے مشہور کیا۔ کم کم کے باپ کے روپیہ سے جو اس نے بطور امانت کے رکھائے تھے آج وہ رئیس زادہ بنا ہے۔ کم کم کے دل میں انتقام کی آگ بھڑکتی ہے وہ اس رئیس زادہ کے لڑکے سے شادی کر کے اس کے باپ سے بدلہ لینا چاہتی ہے اس نے اپنے باپ کا بدلہ اپنے سوامی کے باپ سے لے لیا لیکن وہ اپنے شوہر سے بغاوت نہ کر سکی ......

اس نے جو کچھ کیا انتقام کے جذبہ سے ... وہ زندگی کو سائل نہ سمجھ سکی ... جس ماحول سے وہ متنفر تھی اپنے انتقام کی چنگاریوں کو بجھا کر پھر اسی ماحول سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ آج کل ایسی ادھوری کہانیوں سے نہ اصلاح کا کام ہو سکتا ہے اور نہ ہی ہماری معاشرت پر اس کا مفید اثر پڑ سکتا ہے۔

آج کا ہندوستان رنجیت فلم کمپنی کا یہ لاجواب شاہکار ہے۔ اس سے پہلے اس فلم کمپنی کے کھیلوں میں چند مزاحیہ کردار اور چند ہیروئنوں کی عیاشانہ پارٹ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس فلم کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ رنجیت فلم کمپنی نے اسقدر جلد کسطرح اتنی کامیاب فلم تیار کی۔ ڈرامے میں نہایت واضح طریقہ پر دکھلایا گیا ہے کہ کسطرح ہمارے ملک کے نوجوانوں پر شہری تہذیب کا جادو رفتہ رفتہ انہیں حقیقت کی دنیا سے دور کرتا ہے۔ حالانکہ ابھی دیہات کی زندگی میں اصلاح کی بہت بڑی ضرورت ہے دیہات اور شہر کا تقابل کر کے سوسائٹی کی بیماریوں کو نہایت اچھے طریقہ پر پیش کیا گیا ہے۔ ہمارے ملک کو ایسے ہی کھیلوں کی ضرورت ہے جو ہماری معاشرت کی بنیادی اصول پر بحث کریں۔ بحیثیت مجموعی فلم نہایت کامیاب اور دلچسپ ہے۔ اس فلم کے دیکھنے کے بعد ہم رنجیت فلم کمپنی کے ڈائرکٹروں کے ستھرے ذوق کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتے اور ساتھ ہی ہمیں تعجب بھی ہوتا ہے کہ اسقدر جلد رنجیت فلم کمپنی کا مذاق اتنا ستھرا کیونکر ہوا بہت ممکن ہے کہ نئے کرتا دھرتا کے اس فلم کمپنی میں آنے سے یہ تبدیلی ہوئی ہو بہرحال اب ہم امید کرتے ہیں کہ رنجیت فلم کمپنی بھی اچھے معاشرتی اور اصلاحی کھیل پیش کرے گی اب اسکا ذوق کچھ بدلا ہوا سا معلوم ہوتا ہے۔

(ادارہ)

ریڈیو —

صدائے بازگشت

ہمارا یہ کالم ریڈیو کی خبروں کے لئے وقف ہے۔ عوام کو چاہیئے کہ اپنی صحیح تنقید دفتر اضطراب کے پتہ سے بھیجتے رہیں۔ ہم اپنی ذمہ داری کو سمجھتے ہوئے اسے برابر شایع کرتے رہیں گے اور کوشش کریں گے کہ اصلاح، ریڈیو کے پروگرام اور پبلک کے جذبات میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔ ضرورت ہوئی تو ہم خود بھی اپنے رائے کا وقتاً فوقتاً اظہار کریں گے۔

حال میں ہمیں کچھ شکایتی خطوط موصول ہوئے ہیں لیکن ان میں عقل سے زیادہ جذبات سے کام لیا گیا ہے آئندہ جو صاحب اپنی رائے کا اظہار کریں انہیں خیال رکھنا چاہیئے کہ سنجیدگی اور متانت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے ان خطوط کی اشاعت سے ہمارا ہرگز یہ مقصد نہ ہوگا کہ ہم خواہ مخواہ کسی ادارے کو بدنام کریں۔ لیکن "اضطراب" عوام کا پرچہ ہے اور ہمیں بہرحال ان کی جائز تنقید کو شایع کرنا پڑے گا۔

(۱۲-۲-۴۷)

انعامی افسانہ

پلاٹ یہ ہے ۔ ایک اچھوت لڑکا۔ ایک زمیندار کی لڑکی۔ دونوں کا بچپن کا میل جول۔ لڑکی تعلیم کے لئے باہر بھیجی جاتی ہے۔ لڑکا گاؤں میں رہ کر سماج کی اصلاح کرنا چاہتا ہے ساتھ ہی اسے بچپن کی باتیں کبھی کبھی یاد آجاتی ہیں۔ ان کی محبت۔ زمیندار اس ملاپ میں روڑے اٹکاتا ہے۔ لڑکی پڑھی لکھی ہے۔ لڑکا اچھوت گنوار اور جاہل۔ لڑکے کی بغاوت — ؟ — ؟ — ؟

کیا اسے لڑکی مل جائیگی ؟ کیا ایک تعلیم یافتہ لڑکی ایک گنوار جاہل کے ساتھ زندگی بسر کرنا قبول کرے گی۔

اس پلاٹ پر جو صاحب سب سے اچھا افسانہ لکھ کر بھیجیں گے ان کو پانچ روپیہ کی کتابیں جن میں مکتبہ ... کی بھی مطبوعات شامل ہوں گی بطور انعام دی جائیں گی۔

یہ انعامی افسانہ صرف نوجوان ادیبوں کے لئے ہے فیصلہ ایک تین آدمیوں کا بورڈ الگ الگ کریگا اور پھر ان کا مجموعی فیصلہ آخری ہوگا۔ انعامی افسانہ ستمبر کے پرچہ میں شایع ہوگا اور اگر ممکن ہو سکا تو پھر کبھی آئندہ ان تمام افسانوں کو ایک کتابی شکل میں پیش کیا جائیگا تمام افسانہ بنام ایڈیٹر صاحب ماہنامہ "اضطراب" جابلنگ ارٹ لنگرآباد لکھنؤ۔ ذخریں ۱۵ر اگست تک آجانے چاہئیں پلاٹ کے نباہنے کے ساتھ ساتھ زبان اور مختصر افسانہ نویسی کی خوبیوں [illegible] افسانے واپس نہ ہوں گے

ہماری نظر میں

سہارا اور دوسرے رومانی افسانے

مصنفہ شفیق بانو صاحبہ شفق
قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ
جامع مسجد۔ نجیب آباد

ادب عکس ہے زندگی کا اور جس ادب میں زندگی کی ترجمانی نہیں وہ ادب نامکمل ہے

اُردو ادب میں مختصر افسانہ نویسی حال ہی میں شروع ہوئی ہے۔ لیکن اکثر مصنفین کے علمی ذوق اور نفسیاتی مطالعہ کی کمی اس فن کو برباد کر رہی ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ اس نئے راستہ میں ہم کہیں گمراہ نہ ہو جائیں ہمیں اس شاہراہ پر بہت سنبھل کر چلنا ہے۔

سہارا چھوٹے چھوٹے کہانی افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ہماری بہنوں نے برابر مردوں کی تقلید کی ہے لیکن وہ ان کی زبان کو ان کے اظہارِ خیال کو زیادہ نباہ نہ سکیں۔

ہمارے گھروں میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ ہی ہمارے جذبات ہمارے احساسات کی اصل ترجمان ہے۔ اور جو زبان ہم روزمرہ اپنے گھروں میں بولتے ہیں وہ ہی اصل میں اُردو ہے

شفیق بانو صاحبہ نے اپنی زبان میں۔ اس زبان میں جو ہماری بہنیں گھروں میں بولتی ہیں۔ مختصر افسانے لکھے ہیں۔ اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔ زبان میں روانی ہے اور اظہارِ خیال کا طریقہ پاکیزہ ہے ممکن ہے دور بیں نظریں بلاغت کی متلاشی رہیں لیکن ہم صریح الفہم اور روزمرہ کے منکر نہیں ہو سکتے۔ ستھری زبان کے ساتھ چٹ پٹے جگمگاتے اور چبھتے ہوئے فقرہ افسانوں کی جان ہیں۔

کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شفیق بانو صاحبہ ایک ذکی الحس دل رکھنے والی خاتون ہیں۔ وہ سوسائٹی کی بیجا بندشوں سے متاثر ہوئی ہیں اور محبت نے بھی ان کے دل پر گہرا اثر کیا ہے۔ انھوں نے دوسروں کے جذبات کا اثر قبول کیا ہے اور وہ ان کی ترجمانی بھی آسانی سے اس طرح کر سکتی ہیں کہ پڑھنے والے پر کردار کے جذبات کا صحیح اثر پڑے۔

اکثر افسانوں میں زندگی کے مختلف عکس نمایاں ہیں۔ اور یہی مختصر افسانوں کی خاص خوبی ہے۔ کتابت میں اکثر غلطیاں ہیں۔ طباعت اچھی ہے۔

جوہر عبدالحق نمبر

مجلد قیمت ۱۲ر
مکتبہ جامعہ۔ دہلی لکھنؤ لاہور بمبئی

جوہر جامعہ ملیہ کے طلباء کا رسالہ ہے اور اپنے حدود کے اندر اُردو زبان و ادب کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی یاد میں "جوہر اقبال" نکال کر اس رسالہ نے اُردو ادب میں اپنے لئے جگہ پیدا کر لی۔ اب اس کا یہ دوسرا کارنامہ ہے جو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر انکی سترویں سالگرہ کے موقع پر پیش کیا گیا ہے۔ مولانا نے اُردو زبان اور ادب کی خدمت میں جس ایثار اور جانفشانی سے خود کو نثار رکھا ہے اس کی مثال آسانی سے نہیں مل سکتی اور اُن کی محنت کی یہ سب سے بڑی داد ہے کہ اُن کے مقصد کی ترویج کی جائے۔

جوہر عبدالحق نمبر سے دونوں باتیں کسی حد تک پوری ہوتی ہیں۔ ایک طرف تو ڈاکٹر عبدالحق کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ دوسری جانب ادبی اور تنقیدی مضامین سے اُردو زبان اور ادب کی خدمت ہوتی ہے جسے ڈاکٹر موصوف نے اپنی زندگی کا سب سے اہم فریضہ بنا لیا ہے۔

جو ہر کے اس نمبر میں وہ مضامین جو عبدالحق کی زندگی سے بحث کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لکھے ہوئے ہیں جو انھیں قریب سے جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ایک طرح کی شگفتگی اور تازگی ہے۔ جو محض تنقید لکھنے والوں کے یہاں مشکل سے پیدا ہو سکتا تھا۔ دوسری قسم ان مضامین کی ہے جو اردو زبان اور ادب سے بحث کرتے ہیں۔ اور ان میں بعض مضامین نہایت مفید اور قابل قدر ہیں۔ تنوع اور دلکشی کے لحاظ سے یہ ایک ایسا مجموعہ ہے کہ اردو زبان و ادب سے دلچسپی لینے والوں کیلئے اسکا مطالعہ نہ صرف مفید ہوگا بلکہ دلچسپ بھی۔ طباعت کتابت عمدہ ہے۔

رگبی کی زندگی

مکتبہ جامعہ۔ دہلی۔ لکھنؤ۔ لاہور۔ بمبئی ——— قیمت عہ ———

ہندوستان میں مکتبۂ جامعہ ہی ایک ایسا ادارہ ہے جس سے مفید کتابیں نکلتی رہتی ہیں۔ رگبی کی زندگی انگریزی کی مشہور کتاب "ٹام براؤنس اسکول ڈیز" کا ترجمہ ہے۔ انگریزی کی یہ کتاب ناول کے پیرائے میں انگلستان کے ایک بہت مشہور و معروف اسکول اور دارالاقامہ کی تصویر کشی کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں دلچسپ کھیل کود تعلیم و ترتیب کے بہت سے اصول آتے ہیں بہت سے نفسیاتی مواقع پیدا ہوتے ہیں جن سے بچے کی تعلیم و تربیت کے بارے میں اچھی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ ہندوستان ایسے ملک میں جہاں کی تعلیم بیحد ناقص اور جہاں کا طریقۂ تعلیم بالکل غیر فطری ہے اس کتاب سے بہت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب تعلیم کا انتظام کرنے والے ایک غیر معمولی انقلاب پیدا کر دیں۔ رگبی کی زندگی کئی حیثیتوں سے بہت مفید ہونے کے علاوہ [illegible] ناول ہونے اور ایک نقطۂ نظر پیش کرنے کے درمیان اس کی دلکشی کھو جاتی ہے۔ ترجمہ بھی جگہ جگہ مشکل ہے اگرچہ عام طور پر رواں اور سادہ ہے۔ جتنا فائدہ اس کتاب سے اٹھایا جا سکتا ہے اتنا ہندوستانی نہ اٹھا سکیں گے کیونکہ انگلستان کی وہ زندگی جس کا نقشہ یہاں پیش کیا گیا ہے ہندوستانیوں نے خواب میں بھی نہیں دیکھی ہے

مکتبہ جامعہ کے مختصر رسالے

قیمت فی رسالہ ار
ضخامت ۲۰ صفحہ

تعلیم و ترقی کے سلسلے میں مکتبہ جامعہ نے چند رسالے شائع کئے ہیں۔ زبان نہایت سلیس۔ عبارت شستہ اور بامحاورہ ہے بچوں کے لیے یہ رسالے نہایت کارآمد ہیں اور ہر گھر میں ان کی ضرورت ہے۔ اب بچوں کو پرانے طریقے پر تعلیم دینے سے انکی ذہانت کو فروغ نہیں دیا جا سکتا۔ یہ جدید رسالے باتصویر ہیں۔ بچے انھیں نہایت شوق سے پڑھیں گے۔

رسالوں کی فہرست حسب ذیل ہے:۔

۱۔ اردو پڑھنے کا قاعدہ باتصویر ۲۔ خط کتابت ۳۔ کہانیاں (حصۂ اول حصہ دوم) ۴۔ امی بھی پڑھنے لگے (ایک دلچسپ قصہ) ۵۔ نماز ۶۔ حبیب خدا ۷۔ صدیق اکبر۔ ۸۔ عمر فاروق۔ ۹۔ غزلیں (اردو کے مشہور شاعروں کی آسان غزلوں کا دلچسپ مجموعہ) ۱۰۔ قومی گیت۔ ۱۱۔ نظمیں۔ ۱۲۔ میونسپلٹی۔ ۱۳۔ ضلع کا انتظام۔ ۱۴۔ ہمارا ہندوستان۔

ہمیں افسوس ہے کہ ہم باقی کتابوں پر اظہار رائے نہ کر سکے۔ انشاءاللہ اگلے پرچے میں۔ — مدیر

نسیم سدیلوی بی اے آنرز ایڈیٹر و پبلشر نے شاہی پریس میں [illegible]

سونے کی ٹکر کی چیز

مسٹر آر ڈی موہن ایڈیٹر "..." اپنے ... قسم کے طلائی زیور کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ آپ کے یہاں سے آئے ہوئے پارسل کا مال دیکھا اصلی سونے کی ٹکر کی چیز ہے میں خود بھی حیران ہوں ... ایک زیور خرید لیا ہے۔ یہ نقلی سونا کسوٹی پر کسنے کا رنگ دیتا ہے اصل سونے کی طرح پگھلایا اور ڈھالا جا سکتا ہے اصلی سونے کے ساتھ ملا کر بھی استعمال کیا جاتا ہے نمونہ حاصل کرو صرف تین روپیہ بارہ آنہ خرچ ... تین تولہ کے خریدار سے صرف دس روپیہ محصول ڈاک معاف ... ایک سو روپیہ ... منگوانے سے پہلے ایک یا تین تولہ ... پھر ... اور ... سے نقلی مال ... روپیہ کے انعام بھیج کر اپنی قیمت نکالیں۔

جرمن ناولٹی اسٹور پوسٹ بکس [illegible] نئی دہلی [illegible]

تحفۂ محبت

اگر آپ دولت، عزت و رسوخ، محبت کے حصول اور متواتر کوششوں کے باوجود ابھی تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے تو ... مستفید ہو سکتی ہیں جیسے ہمارا تعویذ محبت منگا کر اس کی روحانی برکت سے فیضیاب ہوں۔ ضدی سے ضدی معشوق خواہ آپ کی ... سات روز کے اندر اندر شرطیہ آپ سے آملیگا۔ جناب ... ڈی سی ... نواب صاحب ... تحریر فرماتے ہیں تعویذ ملا اسکی سریع التاثیری دیکھکر اس مادی زمانہ میں بھی روحانی قوت کا اعتراف کرنا پڑا" ہدیہ صرف ... علاوہ محصول ڈاک۔ ... قیمت واپس ... کیلئے صرف تین روپیہ محصول ڈاک معاف

منیجر موہنی بھنڈار ۲۵ دہلی [illegible]

بغیر آپریشن فوطہ بڑھ جانیکا علاج

اگر فوطے میں آنت اتر آئی ہو یا پانی آگیا ہے تو اس کی حیرت انگیز دوا اکسیر ... (رجسٹرڈ) استعمال کیجئے خواہ کتنا ہی پرانا مرض ہو ایک ہفتہ میں مستقل طور پر فائدہ ہو سکتا ہے اس خطرناک بیماری کے لیے نہایت مجرب دوا ہے ... (رجسٹرڈ) کی مالش سے پسینہ کے ذریعہ مادہ خارج ہو کر فوطے اصلی حالت پر آجائیں گے۔ آپریشن کرانے کی ضرورت نہیں مکمل فائدہ کے لئے ایک ... کی قیمت ... اور نمونہ کی شیشی ... علاوہ محصول ڈاک۔ جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ پتہ جام کوثر آفس (رجسٹرڈ) دہلی [illegible]

ایک دلہن کی سنسنی خیز آپ بیتی

مجموعہ ... سے ... رجسٹری شدہ

پہلی رات کس طرح گذاری؟

دلچسپ اور ... والی سچی کہانی جس کو پڑھ کر ساٹھ سال بوڑھے بھی جذبات کو قابو میں نہیں رکھ سکتے ... ناول ... نہیں ... وہ اس کتاب کو ... اور پھر بار بار پڑھتے ہیں ... ہیں ... کی ... اور ... پوشیدہ ہیں ... تصاویر ... قیمت صرف ... علاوہ محصول ڈاک۔ ملنے کا پتہ:- جام کوثر آفس (رجسٹرڈ) دہلی

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

ماہنامہ اضطراب

لکھنؤ

چندہ سالانہ
معاونین سے عمر
خریداروں سے پہ

اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء

جلد ۱ — شمارہ ۲

ادارہ
نسیم سندیلوی بی اے آنرز
مسعود اختر جمال

رجسٹرڈ نمبر ا ۔ ۶۶۲

صفحہ	مضمون	مضمون نگار
۲	مشاہدات	شوق کھنڈوی
۳	الفاظی تنقید	صفیر احمد بنارس
۹	آئینہ حقیقت	خواجہ عزیز الحسن مجذوب
۱۰	آرزو لکھنوی	سید خورشید احمد بی اے
۱۶	محسوسات	نشتر سندیلوی
۱۷	ہماری شاعری	شور شاہجہانپوری
۲۰	جوہر سیماب	سروش عسکری طباطبائی
۲۱	نجف سے بغداد تک	ماہر القادری
۲۳	ساقی	یحیی اعظم گڈھ
۲۴	رنگ تغزل	سید آل رضا۔ رضا
۲۴	نغمہ احساس	حسن یاور نقوی۔ یاور
۲۵	فریب انتظار	سید ارتضی علی۔ نقوی
۲۷	کون؟	سلام مچھلی شہری
۲۸	جذب تصور	نسیم سندیلوی
۲۹	ہوائی چھاتے	سید محتشم حسین زیدی
۳۲	شعاع امید	اہ صمدت بنارس
۳۳	نقوش ماضی	آمنہ برجیس
۳۴	زینت	اختر انصاری
۴۰	فردوس محبت	نذیر احمد۔ نذیر
۴۱	لیان ٹراٹسکی	حبیب الرحمن صاحب بی اے
۴۳	بزم خیال	فضل الرحمن (مدیر)
۴۳	داستان زندگی	نیرہ خاتون
۴۴	نغمہ محبت	شفیق بانو شفق
۴۸	آرٹ اور علم	عادل رشید میئوی
۵۲	چین کے مسلمان	ثریا خاتون علی گڑھ
۵۳	اضطراب عالم	عشرت علی صدیقی

دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرمائیے۔ ورنہ تعمیل نہ ہو سکے گی — منیجر

ماہنامہ
اضطراب لکھنؤ

جلد نمبر ۱ اکتوبر ۱۹۴۲ء شمارہ نمبر ۴

ہم اور آپ —

ہمارا چوتھا پرچہ ہے جو اس سے پہلے تین پرچوں سے بالکل الگ ہے۔ اب آئندہ ہم پر اسی معیار کو باقی اس سے بھی اچھا پرچہ آپ کے پڑھنے کو دینگے

ہماری افسانوی تنقید میں نعیم جہاں تو زار و بانو اور بھائی صفیر احمد صاحب نے حصہ لیا۔ بھائی صفیر احمد مقابلہ میں اول آئے۔ ہمارے "دیکھنے والوں" میں نمبر صاحب تاج پوری۔ مسعود انور بال صاحب اور عشرت علی صاحب صدیقی تھے۔

جو مضامین ہمارے پاس آتے ہیں ان میں سے بیشتر سے ہم مطمئن نہیں اور اسی لئے اکثر اصحاب کو ہم سے شکایت ہے کہ ہم نے ان کا مضمون شائع کیوں نہیں کیا۔ لکھنے کے لئے وسیع مطالعہ اور نئے مضمون کی ضرورت ہے مضامین ترتیب دیتے وقت ہم یہ نہیں دیکھتے کہ کس نے لکھا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ کیا لکھا ہے اور کیسا لکھا ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس مرتبہ بھی شذرات میں کوئی علمی بحث نہ چھیڑ سکے جس کی وجہ ہماری مصروفیت اور جگہ کی تنگی کہی جا سکتی ہے۔ ابکی بار ہم کتابوں پر تبصرہ بھی نہ کر سکے ترتیب نئی تھی جس کی کتابت کا اندازہ ہمیں نہ ہو سکا اور اسی وجہ سے اس مرتبہ ہمیں اشتہارات بھی روکنے پڑے۔ آئندہ پرچے میں ان تمام باتوں پر ہماری نگاہ رہیگی۔

ادارہ

مشاہدات

آگ برساتا ہے سورج رفعت افلاک سے
ہوگئے ہیں خشک آنسو دیدۂ غمناک سے
پتہ پتہ دھوپ کی شدت سے مرجھایا ہوا
اف تمازت۔ ہے لبوں پر سب کے دم آیا ہوا
کاروانِ ابر رخصت ہو چکا ہے دہر سے
پگھلی جاتی ہے زمیں موجِ تپش کے قہر سے
ریت کے ذرّوں میں پنہاں ہے سلگتا آفتاب
رہ میں جن پر بدلتی ہے ہوا مثلِ کباب
اور اس جانب سڑک کے ایک پیر ناتواں
ہاتھ میں لیکر کلہاڑی چیرتا ہے لکڑیاں
سر پر کچھ بھی نہیں ہے ایک تہمد کے سوا
جانفشانی کے عرق میں سر بسر ڈوبا ہوا
چند لمحے بھی وہ دم لیتا نہیں آرام سے
جو بھی مطلب نہیں ہے کام اپنے کام سے
دوسری جانب محل کے رہنے والے شاد ہیں
دامنِ زر میں ہزاروں جنتیں آباد ہیں
رنگ کتنا جانفزا عشرت کے پیمانوں کا ہے
کسقدر پر لطف موسم انکے خس خانوں کا ہے
شوق انکی زندگی میں غم کی جانسوزی کہاں
یہ سمجھتے ہیں کہ ہے ان کی خدائی میں جہاں
اب مگر بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
حال کے ہاتھوں میں مستقبل کا رنگیں ساز ہے

(شوق کھنڈوی)

"انعامی تنقید"

جگر کی شاعری پر ایک نظر

صغیر احمد

جگر کی ابتدائی تعلیم پرانے طریقے پر ہوئی فارسی کی چند کتابیں پڑھیں۔ کچھ عرصہ بعد انٹرنس کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ لیکن بعد میں اپنی خود فراموشی فطرت سے مجبور ہو کر انھیں سلسلۂ تعلیم منقطع کرنا پڑا ان کی نشو و نما جس فضا میں ہوئی وہ سراپا شاعرانہ کیفیت سے معمور تھی خود ان کے والد اور چچا نہایت خوشگو شاعر تھے۔ گھر میں ہر وقت شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ اس ماحول میں جگر کی طبعی جولانی رنگ لائی اور رفتہ رفتہ وہ مجسم شاعر بن گئے۔

چونکہ اُن کا مذاق شاعری فطری تھا اس وجہ سے وہ بارہ تیرہ برس کی عمر سے شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ اصلاح والد سے لیتے۔ والد کے انتقال کے بعد کچھ دنوں غزلیں داغ کو دکھائیں اور استاد کی سلاست، شوخی اور نزاکت کا اثر ان کے کلام پر بہت زیادہ پڑا۔ جو اُن کے کلام میں اب بھی پایا جاتا ہے۔ داغ کے بعد انھوں نے تسلیم اور رسا کو بھی غزلیں دکھائیں شروع زمانے کا شعر ہے۔

یہ سوزِ نہاں نہیں ہے دل میں
جلتا ہے چراغ بیکسی کا

جگر گو رندانہ طرزِ معاشرت کے عادی تھے لیکن اُن کا احساس خودداری مجبور زندگی بسر کرنے سے گریز کرتا۔ ان کے خاندان پر جب تباہیاں آئیں تو وہ فکر معاش میں آگرے گئے۔ یہاں زندگی کی چند رنگین ساعتوں نے ان کے ذوقِ شاعری کو تیز تر کر دیا۔ مے نوشی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ غم میں ایک سُرور کی کیفیت پیدا ہو گئی اور انکی زندگی مجسم پروانہ بنکر فضائے شعر و ادب پر چھا گئی۔

فکر معاش کے سلسلے میں کچھ دنوں کے بعد انھوں نے چشمے کی ایجنسی لے لی۔ اسی سلسلہ میں وہ گونڈہ بھی آئے جہاں اصغر سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات سے جگر کی اخلاقی اور شاعرانہ زندگی میں غیر معمولی انقلاب ظہور پذیر ہوا۔ اصغر مرحوم اُس دور کے کامیاب غزلگو تھے۔ ان کے کلام کی رنگینی، شگفتگی اور لطافت ان کی مجازی شاعری پر اثر انداز ہوئی اور اُن کے اشعار میں بھی اصغر کی طرح تصوف کے لطیف نغمے مچلنے لگے۔ مولانا اصغر نے ان کو اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا سید عبدالغنی منگلوری سے بیعت کرائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جگر کی ذات پر مرشد مذکور کے فیض روحانی سے

مذہبی رنگ غالب ہوگیا جو آج بھی اُن کی شخصیت میں کسی نہ کسی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اسی اثنا میں جگر نے فارسی دواوین کا غائر مطالعہ کیا جس سے اُن کی شاعری میں جان پیدا ہوگئی اور مضامین بلند ہونے لگے شعر ہے:

بلبل ہمہ تن خون شد و گل شد ہمہ تن چاک
اے وائے بہارے اگر اینست بہارے

اس کے بعد جگر مین پوری میں رہنے لگے چونکہ فطرتاً حسن پرست واقع ہوئے تھے اس وجہ سے ان کے اشعار میں جمالیاتی شان جلوہ گر رہی۔ خوب خوب شعر کہے۔ یہی زمانہ ان کی شاعری کا شباب تھا۔ رفتہ رفتہ ان کی شہرت خواص سے عوام تک پہنچی۔ وہ مشاعروں میں بہ اصرار بلائے جاتے۔ انکی بے حد تعظیم و تکریم ہوتی جس وقت مترنم آواز سے پڑھتے لوگوں پر چھا جاتے داد و تحسین کی صدائیں بلند ہوتیں۔ عوام کی بے جا تعریف نے بھی ایک حد تک جگر کو متاثر کیا جس کے باعث تخیل میں عمق کم ہوگیا پہلے وہ کہتے تھے:

عشق میں گم گشتگی شوق راس آئی مجھے
تھی جو میرے دل میں حسرت اب اُسی کے دل میں ہے

اب وہ کہتے ہیں:

چھیڑ ہی رت، وہی ہم تم، وہی تنہائی ہو
پھر محبت کی ہر اک چوٹ اُبھر آئی ہو

بہت دنوں تک دختِ رز نے جگر کو دونوں عالم میں بیگانہ بنائے رکھا۔ لیکن چند ماہ سے وہ تائب ہوگئے ہیں۔ زُہد کو اپنا مسلک قرار دیا ہے۔ اور اصغر مرحوم کی بیوہ سے عقدِ ثانی کرلیا ہے۔

جگر کا اخلاق نہایت وسیع ہے۔ مولانا اصغر سے کمال عقیدت ہے۔ جگر کی عالمگیر شہرت محض اس وجہ سے نہیں کہ وہ مترنم لہجہ میں پڑھکر اہلِ بزم کو اپنے نغمہ سے مسحور کر دیتے ہیں۔ بلکہ اُنکی امتیازی حیثیت کا باعث اُنکی شاعری کا وہ سوز و گداز ہے۔ جو ہر شخص کے دل پر اثر کرتا ہے۔ اور جس کے متعلق غالب مرحوم نے لکھا ہے۔

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

ہر موزوں طبع اس وقت تک "شاعر" کہے جانے کا مجاز نہیں جب تک وہ اپنے شعر کی خود تفسیر نہ بن جائے۔ اس معیار پر جب جگر کو دیکھتے ہیں تو اُنکی شاعرانہ عظمت مسلم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ان کا ہر شعر خود اُن کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔

موسیقی ۔ یوں تو جگر کا کلام گوناگوں خصوصیات کا حامل ہے۔ لیکن سب سے بڑی خوبی ان کی "موسیقی" ہے "موسیقی" سے میری مراد اُس وجدانی کیفیت سے ہے جو نغمات کی مدد سے معنی کی رہبری کرے۔ ان کے اشعار شیریں موسیقیت میں ڈوبے ہوتے ہیں ملاحظہ ہو

ہے یہ حسنِ تصور کا فریب رنگ و بو
میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا

دل کو برباد کر کے بیٹھا ہوں
کچھ خوشی بھی ہے کچھ ملال بھی ہے

مندرجہ بالا اشعار کا ہر لفظ دلآویز موسیقی سے لبریز ہے۔

شعر میں موسیقی نشستِ الفاظ سے پیدا ہوتی ہے۔ درحقیقت ترنم شاعری کی جان ہے۔ جگر کا سب سے بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ الفاظ اس طرح رکھتے ہیں کہ شعر میں شعریت کے دوش بدوش موسیقیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً،

اللہ اللہ یہ مری مشقِ تصور کا کمال
میں ہوں اس محفل میں اور محفل کی محفل دل میں ہے

دیکھئے حسنِ بندش اور شگفتگیِ الفاظ نے کس قدر دلکش ترنم پیدا کر دیا ہے۔ شعر میں جس قدر ترنم زیادہ ہو گا اُسی قدر وہ لطیف اور نازک ہو گا۔ شاعر اور متشاعر کا جوہر یہیں کھلتا ہے۔

جگر کے کلام میں مجموعی حیثیت سے "غالبیت" نہیں ٹپکتی۔ اُن کی زبان نہایت صاف اور شستہ ہے جس سے اشعار میں چار چاند لگ جاتے ہیں مثلاً،

ہم عشق کے ماروں کا اتنا ہی فسانہ ہے
رونے کو نہیں کوئی ہنسنے کو زمانہ ہے

گوشِ مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ
سُن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے

ایجاد و تخلیق۔ جگر کی دوسری بڑی خصوصیت اُنکا تخلیقی آرٹ ہے وہ ہر فرسودہ خیال کو "قوتِ تخیلہ" کے ذریعہ ندرت کا رنگ دیکر پیش کرتے ہیں۔ دورِ حاضر میں اسلوبِ بیان کی حیثیت سے اُنکا کوئی حریف مقابل نہیں۔ شعر ہے،

جا اے فلک نہ خوش ہو برباد کر کے مجھکو
تیرے مزاج میں بھی آشفتگی رہے گی

"اے فلک" کے تخاطب سے شعر کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ خیال ضرور پرانا ہے لیکن طرزِ بیان نے ایک نئی چیز بنا دی ہے دراصل شاعری "ندرتِ بیان" کا نام ہے۔ وہ پامال اور پیش پا افتادہ مضمون کو نرالے انداز سے بیان کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو،

قیدِ ہستی سے کب نجات ملی　　موت آئی اگر حیات گئی

غور کیجئے "ہستی" کا موضوع کسقدر پرانا ہے لیکن پیرایۂ بیان اور جدتِ ادا سے ایک دوسری ہی چیز بن گئی ہے۔

ندرتِ بیان کی ایک مثال اور دیکھئے۔ گو موضوع "بہار" ہے جو نہایت پامال ہے،

بھرے ہوئے ہیں نگاہوں میں حسن کے جلوے
یہ کیا مجال، جہاں میں ہوں اور بہار نہ ہو

متقدمین کے کلام میں طرزِ ادا اور جدتِ بیان کے ساتھ ساتھ "جوش و ولولہ" بہت کم ہے۔ جگر نے اُردو کے قالب میں "جوش و سرمستی" کی نئی روح پھونک دی ہے۔ کہتے ہیں،

نظر ملی ہے تو اُس کو بہار ساز بنا
نظر کو مائلِ رنگینیِ بہار نہ کر

محوِ تسبیح تو سب ہیں مگر ادراک کہاں
زندگی خود ہی عبادت ہے مگر ہوش نہیں

جلووں کو ترے دیکھ کے جی چاہ رہا ہے
آنکھوں میں اُتر آئے مرا کیفِ نظر بھی

مجھ ناتوان عشق کو سمجھا ہے تم نے کیا!
دامن پکڑ لیا تو چھڑایا نہ جائے گا۔

جگر کی "انفرادیت" کا ایک خاص عنصر یعنی "جوش و ولولہ" ہے۔ کلام میں جتنا "درد و جوش" زیادہ ہوگا اتنا ہی کلام موثر ہوگا۔

امثال بالا سے جگر کی وسعت تخیل کے پہلو بہ پہلو جذباتی انداز بیان کا بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا۔

جگر کو کیفیات اور جذبات کی تصویر کشی میں کمال حاصل ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ان کے جاتے ہی یہ حیرت چھا گئی
جس طرف دیکھا کیا، دیکھا کیا

عاشق ضبط کی انتہائی کوشش کرتا ہے لیکن ناکامیاب رہتا ہے اس حالت کا سماں کس نزاکت سے کھینچتے ہیں

کچھ ایسی ٹھیس لگی انتہائے ضبط پہ بھی
ٹپک پڑی مری حسرت مری نگاہوں سے

ہر لفظ پر غور کیجئے، آپ کو خود ہی کیفیت محسوس ہوگی۔ اسی کا نام ہے "محاکات" اور "جذبات و کیفیات کی مصوری"

معشوق کے "خرام رنگیں" کی تصویر نگاہوں میں کس لطافت انداز سے کھینچتے ہیں،

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آرہے ہیں، وہ جا رہے ہیں

معیار۔ جگر سوسائٹی کے معیار تمدن کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں رکیک جذبات نہیں مضامین اور خیالات عامیانہ اور سوقیانہ نہیں ہوتے۔ ان کی شاعری خود اُنکے لطیف جذبات کا پرتو ہے یہی وجہ ہے کہ اہل ذوق ان کا کلام نہایت دلچسپی سے پڑھتے ہیں چند اشعار ملاحظہ کیجئے:۔

ہنسی پھر آرنے لگی عشق کے فسانے کی
نقاب اٹھاؤ، بدل دو فضا زمانے کی

شاید اسی کا نام مقام فنا نہ ہو
نازک سا ہوتا جاتا ہے دل ہر صدا کے بعد

مجھکو وہ لذت ملی احساس مشکل ہوگیا
رہتے رہتے دل میں تیرا درد بھی دل ہوگیا

استعمالِ الفاظ۔ جگر غزلوں میں بہت سے ایسے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جن کو اب تک کسی غزلگو نے نہیں استعمال کیا ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ نامربوط اور غیر مانوس نہیں معلوم ہوتے۔ میرے نزدیک یہ شاعر کا ایک زبردست آرٹ ہے۔ غزل جیسی نازک اور لطیف صنف میں غیر مستعمل الفاظ نہایت خوش اسلوبی سے کھپا دینا ایک ایسا اعجاز ہے جو صرف حضرت جگر مرادآبادی کے حصے میں آیا ہے۔ طوالت مضمون کے خیال سے مثال کے طور پر صرف ایک شعر پیش کرتا ہوں،

ہم عشق مجسم ہیں۔ لب تشنہ و مستسقی
دریا کی طلب کیسی، دریا کو رلاتا ہے

"مستسقی" کا لفظ اس آسانی کے ساتھ استعمال کر جانا جگر ہی کا کام ہے

جگر کا فلسفۂ زندگی۔ ہماری زندگی آجکل اخلاقی جہالت کے باعث نئی نئی اُلجھنوں میں گرفتار ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اب اُن کی نگاہیں رونے والے شاعر پر نہیں ٹھہرتیں۔ اب عوام ایسی شاعری کو پسند

کرنے لگے ہیں جو اُن کے دل کا غم بھلا سکے جس میں زندگی ہو اثر ہو اور سرور آگیں نغمات کے دھارے ہوں۔ جگر ہماری سوسائٹی میں اسی انفرادیت کے باعث مقبول ہیں۔ وہ اپنے غم کو بھی اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والے پر اک کیف آگیں نشہ چھا جاتا ہے اور وہ اپنے آنسوؤں میں بھی ایسا ترنم پیدا کر دیتے ہیں جس میں ایک سرور آگیں لذت پیدا ہو جاتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں،

اشکوں کے تبسم میں، آہوں کے ترنم میں
معصوم محبت کا معصوم فسانہ ہے
جلوہ جو اُن کے رُخ کا مری چشم تر میں ہے
شادابیٔ بہار کا عالم نظر میں ہے

غمِ ہجر کی کیفیت بیان کرتے ہیں،

کٹے گی شبِ غم تری راحتوں سے
تری یاد ہوگی تر ادھیان ہوگا

وہ "دنیا" کو "ایک خواب" نہیں تصور کرتے بلکہ "جائے عمل" اور "کارزارِ حیات" سمجھتے ہیں۔ مزید براں وہ زندگی کو خواب و خیال نہیں بلکہ ایک مستقل جدوجہد سمجھتے ہیں۔ لکھا ہے،

سمجھ سوچ کر پاؤں آگے بڑھانا
حقیقت ہے دنیا کہانی نہیں ہے

جگر صاحب انقلابی اور اجتہادی دل و دماغ لیکر آئے ہیں اور قدامت پرستی سے کوسوں دور ہیں زمانے کے مصائب اُن کے مزاج میں قنوطیت نہیں پیدا کرتے بلکہ وہ ان کا بہادری سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں اور اپنی شاعری میں یہی پیغام بھی دیتے ہیں۔ ذیل کے شعر میں وہ زمانے کے حوادث اور اپنے جذبات میں کتنی لطیف ہم آہنگی پیدا کر دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو،

محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہر تازہ تغیر
میرے لئے بیتاب ہے، معلوم نہیں کیوں

نظریۂ حسن و عشق۔ جگر محبوب کے آستانہ پر جبیں سائی کرنا اور اپنی عاشقانہ عظمت کو مجروح کرنا نہیں پسند کرتے۔ وہ اپنی خودداری کو صدموں سے بچاتے ہیں ان کا عشق حسن کا حریفِ مقابل ہے۔ وہ ایک نیاز مند عاشق نہیں ہیں بلکہ بعض دفعہ خود انکا نیاز عشق ہی مجسم ناز بن جاتا ہے۔

اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں
میرے آغوش کو اب حسرتِ آغوش نہیں
محبت کے جلوے نہیں حسن سے کم
انھیں بھی مرے ساتھ حیرانیاں ہیں
اللہ اللہ عشق کی رعنائیاں
حسن خود لینے لگا انگڑائیاں

اُن کے نزدیک عشق خلاق حسن ہے مگر ساتھ ہی ساتھ "حسن" کی کرمفرمائیوں کے بھی قائل ہیں۔ کہتے ہیں،

پڑا رہ سبزۂ بیگانہ پرتو، صورتِ شبنم
شعاعِ حسن اڑا لیجائیگی خود بال و پر ہو کر

بعض مرتبہ "حسن" کو "عشق" کی کیفیت سے لبریز دیکھتے ہیں

عشق رنگِ حسن سے ہو بے نیاز حسن کیفِ عشق سے خالی نہیں

درحقیقت اسی نظریۂ "حسن و عشق" کی جدت

و انداز بیاں نے جگر کے کلام میں "انفرادیت" کا شوخ رنگ بھر دیا ہے جس شاعر میں "انفرادیت" نہیں وہ صحیح معنوں میں شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ خود جگر کے اشعار گویا ہیں کہ ہمارا خالق "جگر" ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تصویر کے ہر نقش میں خود مصور کی روح جلوہ گر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جگر کا تغزل عصر حاضر میں کامیاب ترین ہے اور ان کا آرٹ ممتاز ترین۔

پرانی شاعری کا اثر پرانی شاعری کے ناخدا جگر سے اس لیے خفا نظر آتے ہیں کہ جگر ان کے فرسودہ رنگ میں شعر کیوں نہیں کہتے اور ان کے کلام میں جدت کیوں ہے نئے دور کو پسند کرنے والے حضرات انھیں اس لیے مورد الزام ٹھہراتے ہیں کہ اپنے انفرادی رنگ کو انھوں نے پرانی شاعری کے دھبوں سے کیوں ناپاک کیا۔ اور خود جگر اس کشاکش میں گرفتار ہیں کہ کس سے دامن بچائیں اور کسے اپنے ساتھ لیں۔ غالباً پرانی شاعری کا اثر جو اُن کے کلام میں نمایاں ہے اُن کے ابتدائی دور کی یادگار ہے جس سے اب نئے دور کے شاعروں کو بچنا چاہیے اور پرانے دور کے شاعروں کو خوش ہونا چاہیے۔ بہرحال میں اب اس بحث سے گریز کر کے جگر کی شاعری کے اُس حصہ کو پیش کرتا ہوں جس میں قدیم "مفروضات" سے آرٹ کو رنگین بنایا گیا ہے۔ لیکن جس میں زندگی کی حقیقت کہیں نظر نہیں آتی۔ یہ شاعری انھیں وراثتاً ملی ہے۔

دیدۂ خونبار ملاحظہ ہو:۔

جب کبھی چھیڑا جنوں نے دیدۂ خونبار کو
بھر دیا پھولوں سے ہم نے دامن کہسار کو

عالم نزع کا تصور :۔

نزع میں ڈھونڈ رہی ہیں آنکھیں
کاش انھیں ایک نظر دیکھوں میں

"جنوں" کی فتنہ سامانیوں کا منظر دیکھیے :۔

داماں و جیب ہو گئے نذر جنوں تمام
باقی کفن کے واسطے اک تار بھی نہیں

"زندہ در گور" شعرا کے پھیکے ترانے سنئے :۔

شانے وقت تو انجام تک نظر نہ گئی
کھڑے ہیں اب مری تربت پہ سر جھکائے ہوئے

غرضیکہ جگر صاحب کے ساز سخن میں اکثر وہی سنے سنائے نغمے گونجنے لگتے ہیں جن میں تاثیر مطلق نہیں ہوتی۔ فرضی روایات کا راگ رقص و مستی کا پیغام دینے سے قطعاً مجبور ہے۔ ترقی پسند طبائع پر پرانی شاعری کی بے رنگ و بے کیف زمزمہ سنجیاں گراں گزرتی ہیں تعجب ہے کہ جو شاعر خود ایک نئے رنگ کا موجد ہو وہ اپنے معاصرین کی غلطیوں میں خود کیوں مبتلا ہوتا ہے؟

فن و زبان۔ علاوہ ازیں جگر کے کلام میں "فن" اور "زبان" کی غلطیاں بھی ہیں جن کو میں "اجتہادِ وقت" خیال کرتا ہوں۔ چونکہ زمانہ کتنی قیود سے آزاد ہو چکا ہے اس وجہ سے اُن کا اعادہ کرنا لاحاصل ہے۔ شاعر کی جزئی فروگذاشت اور عارضی لغزشیں اُس کی زندگی کے بعد ادبیات عالم میں "جواہر پاروں" کا خطاب حاصل کر لیتی ہیں۔

آئینۂ حقیقت

خواجہ عزیز الحسن۔ مجذوب

سر دار ہو کر۔ سر طور ہو کر — ترے پاس آیا بڑی دور ہو کر
نہ پاس آؤ اتنے۔ لو دور ہو کر — میں کچھ اور کہہ دوں نہ منصور ہو کر
گھٹا ہے کہ اُمڈی چلی آرہی ہے — دُعا کس نے کی لٹنے میں چور ہو کر
تصور سلامت۔ تجسّس سلامت — میں بیٹھا ہوں اپنی جگہ طور ہو کر
چھپانے کو ہم تم چھپاتے ہیں دونوں — رہے گا یہ افسانہ مشہور ہو کر
حدیں عشق کی کر رہے ہیں وہ قائم — کبھی پاس آکر کبھی دور ہو کر
تنِ یاسمیں پر لباسِ مُصَفّا! — وہ آئے ہیں نورٌ علیٰ نور ہو کر
نظر کیا کروں اب سوئے جام و مینا — تری مست آنکھوں کا مخمور ہو کر
اب اتنی رعایت تو اے آسماں ہو — نئے غم ملیں پچھلے غم دور ہو کر
میں کہنے کو تھا کچھ کہ چپ کر گئے وہ — زباں رہ گئی دارِ منصور ہو کر

وہ خوش بخت و خوش وقت مجذوب ہم ہیں
غموں میں بھی رہتے ہیں مسرور ہو کر

آرزو لکھنوی

سید خورشید احمد بی اے

حضرت آرزو لکھنوی سے کون واقف نہیں ہے، موجودہ زمانہ کے غزل گویوں میں ان کا درجہ سب سے بلند ہے قبل اس کے کہ ان کے کلام پر تبصرہ کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غزل گوئی سے آج کل جو عام بیزاری پھیلی ہوئی ہے اس کے متعلق کچھ عرض کر دیا جائے ہر زمانہ اپنے رنگ شاعری کے لیے مخصوص ہوتا ہے ایک زمانہ تھا جب غزلوں کا دور تھا، اور عہد جدید کی شاعرانہ پیداوار سے درگذر کر کے ہماری شاعری کا تمامتر سرمایہ غزل ہی میں ملتا ہے، شعرا کے جوہر غزلوں ہی کے ذریعہ پرکھے جاتے تھے مگر اب غزلوں سے ہٹکر نظموں کا دور آگیا ہے، غزلوں کی طرف سے ایک عام بیزاری پھیلی ہوئی ہے، ایک مستقل گروہ پیدا ہوگیا ہے جو اس صنف شاعری ہی کی بیخکنی پر آمادہ ہے، اس جد وجہد کی بنیاد غالب کے زمانہ میں پڑتی ہے اور حقیقی معنوں میں اس کا سنگ بنیاد وہی رکھتے ہیں، کہتے ہیں ؎

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

دراصل غالب نے اس شعر میں اُس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے جس کے خلاف آنے والی نسلیں زبردست صدائے احتجاج بلند کرنے والی تھیں یعنی غزل کو غیر معمولی اہمیت دینے کی جو مخالفت ہم اس بیسویں صدی میں دیکھتے ہیں اس کے بانی غالب تھے، یہ ضرور ہے کہ انہیں موافق فضا نہ مل سکی اس وجہ سے وہ اپنے خیالات کو زیادہ سے زیادہ کامیاب نہ بنا سکے، ان کے بعد سیاسی انقلاب لے دیکا، غالب کے شاگرد حالی کے سپرد کیا اور وہ آزاد کی زبردست حمایت اور پھر رفتار زمانہ کی معاونت میں بہت کچھ کر سکے۔ یہ حقیقت ہے کہ اب حالات بالکل تبدیل ہوگئے ہیں، سیاست معاشرت اور ماحول سب تبدیل ہو چکے ہیں ہمارا ملک ایک زبردست ہنگامی اور مسلسل تبدیلیوں کے دور سے گذر رہا ہے، اس حشر سامانی میں عیش و عشرت کا ذکر اور عشق و محبت کے راگ الاپنا جو غزل کی مخصوص چیز ہے بے معنی ہی نہیں بلکہ غیر فطری بھی ہوگا، سیاسیات عالم کی مسلسل تبدیلیوں کا اثر ناگزیر طور پر ہم پر بھی ہوا جس کے نتیجہ میں ہمارے ماحول بدلے اور ساتھ ساتھ ہمارے خیالات اور رجحانات میں تبدیلی ہوئی، اس تبدیلی نے ہمارے مطالبات میں ہم آہنگی پیدا کی، چونکہ غزل ہمارے ان خیالات اور رجحانات کے

اظہار کے لیے شاعروں کی اس نئی نسل نظموں ہی کی طرف مائل ہوئے اور روز بروز غزلوں کی اہمیت کم اور نظموں کی زیادہ ہوتی گئی یہاں تک کہ غزلوں کی مخالفت نے ایک منظم صورت اختیار کی۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ ہم اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتے کہ موجودہ سیاسی ہنگاموں اور اس کثرت کار کی صدی میں جبکہ بسا اوقات مسلسل نظمیں نامکمل رہ جاتی ہیں یا تازہ کیفیات جن سے شاعر کا دل روزمرہ کسی واقعہ کو سنکر یا کسی حالت کو دیکھکر اثر پذیر ہوتا ہے اس وقت غزل، رباعی یا قطعہ سے بہتر اور کوئی صنف اس کے اظہار کے لیے نہیں ہو سکتی پھر موضوعِ غزل بھی احوال کے ساتھ بدل چکا ہے، اسمیں عشقیہ مضمون کے علاوہ تصوف اخلاق مواعظ اور سیاسیات بھی شامل ہو گئے ہیں، اس صورت میں غزل سے کلیتاً انحراف محض شاعرانہ تعصب ہے، موجودہ دور میں بکثرت ایسی غزلیں ملیں گی جن میں ہماری بے چینی کا اظہار صاف و صریح طور پہ کیا گیا ہے جگر مرادآبادی کہتے ہیں ؎

یہ کیا ہے کہ پہلو میں وہ بھی ہیں لیکن
شبِ ماہ پھر بھی سہانی نہیں ہے

سرمایہ داری کے مظالم اور غربت کی بے بسی کا کیسا دلدوز مرقع آرزو نے اس غزل میں پیش کیا ہے۔

عجب زندگی ہے عجب زندگی ہے
کہ ہے ظلم پر ظلم اور بے بسی ہے
کمائی کسی کی ہے قبضہ کسی کا
جدھر دیکھیے الٹی گنگا بہی ہے
اگر سوز بھی تم تو کیوں دل سے سیجے
انھیں آنسوؤں سے تو کھیتی ہری ہے
غریبوں کا خون آج تک جل رہا ہے
امیروں کے گھر ہر طرف روشنی ہے

حضرت آرزو اُن چند باکمال اساتذہ میں ہیں جنھیں کلام پر ہر طرح کی قدرت حاصل ہے۔ جہاں آرزو فنِ شاعری کے تمام نکتوں پر حاوی ہیں وہاں زبان پر بھی پوری پوری قدرت رکھتے ہیں یہی نہیں بلکہ زباں داں ہیں جس لفظ کو صحیح کہ دیں وہ صحیح ورنہ ٹکسال باہر۔ اسی وجہ سے اُن کی غزلیں عموماً کامیاب رہتی ہیں، وہ مضامین اور زبان کی خوبیوں کے ساتھ مل کر کچھ ایسا اثر کرتی ہیں کہ ہم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

آرزو کی سب سے بڑی خوبی حسیات و جذبات کی مرقع کشی ہے، وہ ماہرِ نفسیات کی طرح انسانی فطرت کی گہرائیوں تک پہونچتے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں اسے محسوس بھی کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اثر اور جذب ان کا حصّہ ہوتا ہے ہر ہر قدم پر داخلی شاعری کا پہلو اُجاگر ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اظہارِ مدعا کے لیے آسرا ہے شرط
جب تک وہ دیکھتے رہے آنسو بہا کئے

قاعدہ ہے کہ جب ہم کسی سے اظہارِ مدعا کرنا چاہتے ہیں تو ایسا عنوان اور ایسا پیرایہ تلاش کرتے ہیں کہ سننے والے پر گراں نہ گذرے، اُس کے لیے طبیعت کی موزونی شرط ہوا کرتی ہے اگر سننے والے کی طبیعت موزوں رہی تو سب کچھ ورنہ کچھ بھی نہیں، پھر معشوق کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے، وہاں ہر آن یہ خطرہ ہوتا ہے کہ نہ معلوم کونسی بات خلافِ مزاج ہو جائے اور بنا بنایا کھیل بگڑ جائے، آرزو نفسیات کے اس راز سے واقف ہیں۔ چنانچہ معشوق کو سامنے پاکے عاشق زبان سے کچھ نہیں کہتا بلکہ آنسو اسکے دل کی ترجمانی

کہتے ہیں۔ اور جو تاثیر یہی ہے کہ ناکامیوں اور مصیبتوں کے وقت بھر رو لینے پر بے اختیار آنسو نکل پڑتے ہیں پھر آزرؔدہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ؎

ہاں میں واقف ہوں تو آنسو ہے دو تیغ آبدار
سنگ دل پن میں اتر جاتی ہے جس کی نرم دھار

ایک جگہ خود کہتے ہیں ؎

ملا کے آنکھ سمجھ لو نہ دوستا یہ مجھ
ابھی ہے دل میں جو حسرت بھری نگاہوں سے

دیگر مجھ سے نہ کہو حال پوچھو بیتے میں اشک تو بہنے دو
میں سے پڑے دل کی بیچینی اسی تسلی رہنے دو

دیگر گرتا جیسے اچانک آنسو ہو ہٹ کے انکا ہنس پڑنا
بوند ذرا سی مٹی پانی کی جس سے بجھتا ہوتا ہے

اس شعر میں اگرچہ اس بات کو صاف صاف نہیں بتایا گیا ہے کہ معشوق اپنی محبت کو پوشیدہ رکھنے میں ناکامیاب رہتا ہے اور عاشق کے رخصت ہونے کے وقت بالکل غیر ارادی طور پر آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں جس کو وہ ہنس کر ٹالنا چاہتا ہے اور اس طرح اس کی محبت کا راز فاش ہو جاتا ہے مگر الفاظ کی ترتیب، بندش اور طرزِ ادا نے اس خلا کو پورا کر دیا ہے، ہماری آنکھوں کے سامنے اس کیفیت کی پوری پوری تصویر کھنچ جاتی ہے جو ایسے موقع پر پیدا ہوتی ہے، حقیقتاً جب بلا ارادہ صرف جذبات سے متاثر ہو کر آنسو نکل پڑتے ہیں تو انسانی فطرت ہے کہ چونک کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے کہ کسی نے دیکھ تو نہیں لیا سمجھ تو نہیں گیا اور فوراً آنسو خشک کر کے ہنس پڑتا ہے مندرجۂ ذیل شعر میں بھی کیفیت جنون کی بہترین تصویر کشی کی گئی ہے ملاحظہ ہو ؎

جوشِ جنوں میں وہ ترے وحشی کا چیخنا
ہنڈا اپنے ہاتھ سے درِ زنداں کئے ہوئے

یا یہ شعر ؎

بے جرم التجا وہ سمجھ لیں گے دل کی بات
ہم یونہی بار بار اگر دیکھتے رہے

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ نئی زمانہ غزل صرف اپنے لغوی معنوں تک محدود نہیں رہ گئی ہے جہاں غزل نازک ترین صنفِ شاعری ہے وہاں اس میں ہر طرح کے مضمون کو بعض وقت نہایت لطیف طریقے پر ادا کیا جا سکتا ہے لیکن جب تک ہم اس کی تہہ میں نہ پہونچیں اس وقت تک معنی کے آبدار موتی ہاتھ نہیں آ سکتے۔ فرماتے ہیں ؎

دل کے ہر ذرہ میں اب ہے پرتوِ برقِ جمال
ایک شیشہ چور ہو کر آئینہ خانہ ہوا

تھا عشقِ مجازی بھی آئینہ حقیقت کا فانوس کے شیشوں سے ٹکرا گئے پروانے

جذبِ کامل کی بدولت مٹ گیا فرقِ دوئی
اب بجائے شمع لو دیتی ہے پروانے کی خاک

غزلیہ شاعری کا جزو اخلاق بھی تسلیم کیا گیا ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ اخلاقی شاعری صد درجہ مشکل بھی ہے اخلاقی شاعری محض واہ واہ میں اڑا دینے کے لیے نہیں ہوتی بلکہ اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ سننے والے اس سے کچھ عمل بھی کریں پند و وعظ سے گریز تقریباً فطرت میں داخل ہے، شاعر کا بڑا کمال ہوتا ہے اگر وہ اخلاق کا درس دیتے ہوئے بھی کامیاب رہے، لوگ دلچسپی سے کلام پڑھیں اور وہ ان پر

ہار نہ ہو، آرزو کے جوہر ہیں پرکھتے ہیں وہ محاسن شعری کے ساتھ درس اخلاق اس طرح دے جاتے ہیں کہ بعض وقت ہمیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا لیکن جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو یہ نکتہ ہماری سمجھ میں آجاتا ہے۔ آرزو کا طرز ادا ایسا سادہ اور انوکھا ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ ہم پر دیرپا اثر چھوڑتا ہے، مثال کے لئے چند شعر پیش کرتا ہوں

سُن لو آرزو لبیوں کی بھی جنکے منھ پر آنکھ نہیں
جانچنے والے جانچ ہی لینگے کیا سچا کیا جھوٹا ہے

بھید کھلتا ہے بھرم جاتا ہے ہوتی ہے ہنسی
جس سے حرف آئے تمھیں پردہ حکایت نہ کہو

مجھے رہنے کو وہ ملا ہے گھر کہ جو آفتوں کی ہے رہگذر
تمھیں خاکساروں کی کیا خبر کبھی نیچے اُترے ہو بام سے

اکثر باکمالوں کی قدر زمانے نے نہیں کی اور وہ اس کے شاکی ہی رہے ہیں آرزو کا شمار بھی انھیں میں ہے اگرچہ انھوں نے کھل کر شکایت نہیں کی لیکن جابجا کلام میں بیدلی کی جھلک موجود ہے، عمر کا بیشتر حصہ پریشانیوں میں گذرا اور آخر وطن کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوئے اور وطن کی ناقدری نے لیجا کر کلکتہ میں بٹھایا ہے یہی وجہ ہے کہ کلام کا زیادہ حصہ سوز و گداز سے بھرا ہے اور اسی چیز نے آرزو کو درد و غم اور یاس و حسرت کا مجسمہ بنا دیا۔ کلام کا انداز بتاتا ہے کہ شاعر نے حساس طبیعت اور درد مند دل پایا ہے۔

آرزو اب اس پھلواری میں بسنے کا سہارا کوئی نہیں
دو سوکھے تنکے لاکے رکھو تو وہ بھی جلائے جاتے ہیں

جل کے میں راکھ بھی ہو جاؤں تو کوئی نہ چھوئے
راکھ بھی آگ ہی ہے ہاتھ جھلس جائے گا

مندرجۂ بالا اشعار میں حضرت آرزو کی اس بیدلی اور شکایت کی طرف اشارہ ہے جو زمانہ کی ناقدری کی وجہ سے انھیں ہو سکتی ہے چند اشعار ایسے بھی ملاحظہ فرمایئے۔ جو یاس و حسرت میں ڈوب کر کہے گئے ہیں جس سے ان کے دردمند دل کا پتہ چلتا ہے۔

تارا ٹوٹتے دیکھا سب نے یہ نہیں دیکھا ایک نے بھی
کس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا کس کا سہارا ٹوٹا ہے

کھِلنے کی آس میں یہاں ڈال گئے تھے اک کلی
رو کے اٹھا رہے ہیں آج نکھڑیاں کلی ڈلی

دورِ مسرت آرزو اپنا کتنا زلزلہ آگیں تھا
ہاتھ سے منھ تک آتے آتے چھوٹ پڑا پیمانہ بھی

اگرچہ آرزو کے کلام میں قنوطیت غالب ہے لیکن رجائیت کے عنصر سے خالی نہیں، ان کے یہاں ہیں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں رجائی جذبہ ابھار اگیا ہے، کچھ بھی ہو جائے مگر وہ آن میں فرق نہیں آنے دیتے اور خودداری کو کسی قیمت پہ بیچنا گوارہ نہیں کر سکتے چنانچہ ان کے کلام میں جابجا خودداری کا سبق ملتا ہے۔

ہاں میری ڈبڈبائی آنکھ دیکھ بندھی رہے یہ دھاک
وہ بھی لگائے جائے آگ تو بھی لگی بجھائے جا

مان لی کس نے اپنی ہار خود یہ تھکن بتائے گی
میں یوں ہی تڑپے جاؤنگا تو یوں ہی مسکرائے جا

آرزو کے یہاں ایک خاص چیز جو ہمیں ملتی ہے وہ اُن کے

ام کا ترنم ہے کہ کوئی شعر کیفیت و ترنم سے خالی نہیں ہوتا، چنانچہ ان کے کلام میں ایسے اشعار ملیں گے جن میں نہ جذبات کی ترجمانی ہے نہ واردات قلبیہ کا تذکرہ، محض شاعری ہی شاعری ہے پھر بھی کیفیت و ترنم کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، مثال کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہوں:-

بنے تھے اس لئے بجلی کہ آ لگو ہمیں یاد دو
دل کے سبب بھی رہتے ہو سامنا کرتے
ہنستے ہو اشک داد پہ یہ سوچتے نہیں
کس کس طرح غریب نے مطلب ادا کئے

دوسری بات جو خاص طور پر ان کے کلام میں نمایاں ہے وہ ان کی انفرادیت ہے، یہ انفرادیت محض جدت ادا ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ جدت خیال و مضامین بھی آرزو کے یہاں ملتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ ہمارے متقدمین نے کون سی بات باقی رکھی ہے جس سے علیحدہ ہو کر کوئی مضمون یا خیال پیش کیا جائے۔ مگر کیا بلحاظ طرز ادا اور کیا بلحاظ تخیل آرزو کی انفرادیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی، مثال کے طور پر چند شعر لکھتا ہوں

اپنی خوشی کے ساتھ مرا غم بھی نباہ دو
اتنا ہنسو کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑیں!
بھری آتے ہی کس نے چپکے سے سسکی
وہ سنتے لگا کر دہیں، مرنے والا
مجھے جس جبیں نے بٹھا لیا مرے حسن ظن میں وہ بت نہ تھا
اسے دل نہ دوں تو کروں میں کیا جو طلب سے تری نام سے
کہ نیاز و رنج نیاز ہم کہ بنے سبب قبول جس سے تو بیزار ہے اس نذر کا شامل مجھے

سلامت روانی، جذب عشق، ترنم، الفاظ کے انتخاب اور انفرادیت کے علاوہ آرزو کا سب سے بڑا کمال اُن کی مضمون آفرینی اور جدت ہے۔ آرزو کی حیثیت دنیائے شاعری میں ایک موجد کی ہے، انہوں نے ہماری شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا جو "خالص اُردو" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، شاعری کے اس نئے رخ میں الفاظ عربی فارسی اور ٹھیٹھ ہندی سے بچ کر ہر شعر خالص اُردو میں کہا گیا ہے پھر بھی روانی باقی اور سلاست موجود ہے، تمام دقتوں کے باوجود اپنی شان گویائی قائم رکھنا آپ کی بہت بڑی کامیابی ہے جس کا استحقاق آپ کو قدرت کی طرف سے عطا ہوا ہے۔

جناب آرزو نے غزلوں کا جو نیا رخ پیدا کیا ہے اسمیں ہندی لفظوں کے سوا عربی فارسی کا کوئی لفظ نہیں ہوتا آپ کی زبان دانی اور قدرت بیان کی کیا تعریف ہو سکتی ہے کہ اس سخت قید کے باوجود ایسی فصیح اور شیریں اُردو میں اپنے خیالات ظاہر کر دیتے ہیں کہ کسی کو اس قید کا علم بھی نہیں ہو سکتا ہے۔

خالص اُردو یعنی ٹھیٹھ ہندی، عربی اور فارسی الفاظ سے مبرا غزلوں کی مشکلات سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر اس سخت قید کے ساتھ حضرت آرزو کی خالص غزلوں کی زبان فصیح لکھنوی اُردو ہوتی ہے۔ اہل نظر حلقوں میں آرزو کی یہ انوکھی چیز بیحد مقبول ہوئی، جو لوگ قدامت پسندی کی دھن میں زمانے کی آواز نہیں سن سکتے وہ ان غزلوں کے بارے میں جو جی چاہے کہیں لیکن جو لوگ زمانہ کی اقتضا پر نظر

رکھتے ہیں اور اُردو ہندی کا جھگڑا چکانے کے لئے بیچین ہیں وہ حضرت آرزو کی اس کوشش کو فال نیک سمجھیں گے اور دل سے اس کی داد دیں گے۔

حضرت آرزو کی خالص اُردو کے قیود انھیں کے عائد کردہ ہیں مختصراً یہ ہیں :-

(۱) غیر ہندی الفاظ استعمال کئے جائیں گے لیکن صرف وہی جو ٹکسالی اُردو کے جزو ہو چکے ہیں

(۲) جو غیر ہندی الفاظ صورتاً یا صوتاً یا دونوں طرح اپنی اصل سے بدل گئے ہیں اُردو کے حکم میں داخل سمجھے جائیں گے

(۳) وہ ہندی الفاظ جو انفراداً اُردو میں داخل نہیں ہیں اور وہ غیر ہندی الفاظ جو اپنی اصل پر قائم ہیں جب کسی محاورہ کا جز ہو جائیں گے تو داخل اُردو سمجھے جائیں گے

(۴) جو الفاظ ہندی اور غیر ہندی میں مشترک ہیں ان سے احتراز نہ کیا جائے گا۔

مندرجۂ بالا قیود کے ساتھ جناب آرزو کے مخصوص طرز کے کلام کا ایک مجموعہ "سریلی بانسری" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، جا بجا سے نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے جس سے انکی شان گویائی، روانی، قدرت، زباں دانی، فصاحت اور شیرینی کا اندازہ ناظرین فرما سکتے ہیں :-

موتی یہ بھرم کا ہے آنسو نہ اسے جانو
آنکھوں نے گرایا تھا پلکوں نے سنبھالا ہے

او جی جلانے والے منہ تمتما اٹھا کیوں
چپ ہو رہا تھا میں تو ایک ٹھنڈی سانس بھر کے

جینا ہے تو دکھ بھی ہیں سکھ بھی ہیں ہنسنا بھی ہے رونا بھی ہے
بین ایک ہی ہوتی ہے جس پر سب راگ بجائے جاتے ہیں

چپ ہیں تو یہ کہ چپ ہو کیوں، بولیں تو وہ ہاں" یہ کیا کہا
بھید ہی بھید تو ہیں سب کس کو بتائیں کیا بتائیں

آخر میں یہ بتانا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود جناب آرزو کا نظریہ شاعری کیا ہے، ان کے زاویہ نگاہ سے عشق کے کیا کیا مدارج ہیں اور عشق کی تکمیل کن کن چیزوں سے ہوتی ہے اور اس کا صحیح مفہوم کیا ہے فرماتے ہیں :-

شاعری کچھ کھیل بچوں کا نہیں جو سبھی جھوم آئیں ہم ارڑ معائیاں
ہو سخن ہے اک نیا پیغام ہے وحی تو ممکن نہیں الہام ہے

شاعر کے متعلق فرماتے ہیں :-

گر دکھائے حسن کی سرمستیاں عشق بھی لینے لگے انگڑائیاں

یہ تو جناب آرزو کا نظریۂ شاعری تھا اب ملاحظہ کیجئے کہ محبت، عشق اور وفا کے متعلق ان کا ایمان کیا ہے :-

محبت نہیں آگ سے کھیلنا ہے
لگانا پڑے گا بجھانا پڑے گا

اُف رے پاس ناز برداری گلا کٹنا قبول
دور ہو سر سے مصیبت یہ دعا ہوتی نہیں

پڑے ہیں گو سوز غم کے پالے نہ کھا کے چرکے کریں گے نالے
حیا کے پابند ضبط والے جلیں گے لیکن دھواں نہ ہو گا

زباں بہ غم دل جو لانا پڑے گا شکایت کا پہلو بچانا پڑے گا

بحر الفت کے شناور ڈوب کر ہوتے ہیں پار
موج جب اُٹھی نظر آنے لگا ساحل مجھے

محسوسات

نشتر سندیلوی

جلوۂ بہاران سے، موسمِ بہار اُن کا　جانِ منتظر انکی، دل امیدوار اُن کا
دم لبوں پہ پھرتی ہے، جانِ بیقرار اُن کا　اور کچھ نہیں حسرت، صرف انتظار اُن کا
لاکھ حسبِ سابق ہو، یو نہیں انتظار اُن کا　کیا کریں، نہیں جاتا، دل سے اعتبار اُن کا
تابعِ نظر نکلا، رنگِ روزگار اُن کا　خار کو بھی گل کر دے حسنِ نو بہار اُن کا
گو مرے تڑپنے پر ہنس دہ دیں تجاہل سے　حال دل کا کہتا ہے، رنگِ بیقرار اُن کا
وہ نگاہِ عشرت خیز، وہ تبسمِ گلریز　اک اشارۂ رنگیں، موسمِ بہار، اُن کا
اے فلک بجواسِ در سے خاک ہو کے لپٹے ہیں　قسمتِ رسا اُن کی بختِ سازگار اُن کا
وہ رُلائیں یا تڑپائیں، خیر یہ خوشی اُن کی　ہم ہیں دل کے قابو میں، دل پہ اختیار اُن کا
ایسی سیکڑوں راتیں کاٹ دی ہیں آنکھوں میں　اور ابھی دکھائے کیا، دیکھیں انتظار اُن کا

گو چھٹے ہوے اُنسے مدتیں ہوئیں نشتر!
ہے مگر خیال ابتک، دلسے ہمکنار اُن کا

ہماری شاعری

سوز شاہجہانپوری

ہماری شاعری آجکل جس دور سے گذر رہی ہے وہ دور نہ صرف شاعری ہی کے لیے پُر آشوب اور قیامت بدوش ہے۔ بلکہ زبان کے لیے بھی تباہ کن ہے۔ اس لیے کہ شاعری اور زبان دونوں لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ یا یوں کہئے کہ ایک ہی شے کے دو نام یا ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ لہٰذا اُن کے معائب اور محاسن کا اثر ایک دوسرے پر پڑنا ضروری ہے۔ یعنی اگر زبان تباہ ہو رہی ہے تو اصولاً شاعری کو بھی تباہ ہونا چاہیے اور اگر شاعری تباہ ہو رہی ہے تو یہ سمجھے ہے کہ زبان بھی دم توڑ رہی ہوگی۔ بمثل مشہور ہے کہ زیادتی ہر چیز کی بُری ہوتی ہے اور حدِ اعتدال سے گذر جانا ہر حال میں مضرت رساں ہے قطع نظر اس سے میرا اپنا بھی یہ ہی خیال ہے کہ جب کسی شے کے پرستاروں کی تعداد اعداد و شمار کی رہینِ منت نہیں رہتی تو یقیناً ایک نہ ایک دن اُن کا وہ مرکز خود انھیں کے ہاتھوں مٹ کر رہ جاتا ہے اور دنیا والے ان نااہلوں کا کچھ دن ماتم کر کے بیٹھ رہتے ہیں چنانچہ یہ طالبانِ ذوق کی اللہ ری تشنہ لبی، کے مصداق۔ نذالنظر بد سے بچائے ہماری شاعری کے پرستار بھی کچھ اسی حدتک پہنچ گئے ہیں۔ اب یہاں اس سے بحث نہیں کہ ان حضرات کی بدولت ادب کو کہاں تک نقصان پہنچ چکا ہے یا غیر مانوس ترکیبوں اور بے معنی الفاظ کی بھرمار سے زبان کی گت بن چکی ہے بلکہ مجھے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ آجکل عرفِ عام میں کس مجموعہ مرکب کا نام شعر ہے اور اس میں کس طرح زبان کی نوک پلک اور بانکپن کو حل کر کے تشنہ کامانِ ادب کو سیراب کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے آپ ان اجزا کو لیجیئے جن سے عام طور پر آجکل کا شعر مرکب ہوتا ہے اجزا سے میری مراد وہ ایسے گنے الفاظ ہیں جو تھوڑی سی ردوبدل کے بعد ہر شعر میں نظر آتے ہیں۔ اس لئے کہ اس قسم کے تمام اشعار ہمیشہ معنی کی لطافتوں سے پاک ہوتے ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ ایک ہی طرح کے تمام الفاظ ہر شعر میں کس طرح نظم کئے جا سکتے ہیں۔ وہ الفاظ یا وہ اجزا یہ ہیں ساز نفس۔ خواب مرگ۔ کیف آور۔ مجاز و حقیقت — جلوہ ہائے حسن۔ جذب نہاں۔ بیخودی شوق۔ جوش بہار حدیث دل۔ ناز آفریں۔ گدائے حسن۔ کیف و خمار مہفت رنگ دل۔ غنچہ شاداب۔ افق کے کنارے۔ کہساروں پر۔ نغمہ بے ہنگام۔ شباب۔ مستی وغیرہ وغیرہ۔

یہ تو ہوئے وہ اجزا جن سے شعر کو مہمل یا الفاظ دیگر بے مطلب بنایا جاتا ہے۔ اب ذرا ان کڑوں پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لیں جن کو برائے بیت استعمال کیا جاتا ہے یا جن سے شعر کی معنویت پہ احسان کیا جاتا ہے مثلاً خوابوں کے جزیرے۔ روح نغمہ۔ رومان ظلمت کے کمیت۔ تنویر مرمریں۔ رباب حسن۔ گمشدہ خواب۔ چمن زار۔ شعاع نور۔ لطافے شاداب۔ محو پرواز۔ نکہت بے شفق اندام۔ خواب نا مکمل وغیرہ وغیرہ۔ بس جناب یہ ہے موجودہ شعر و سخن کی کل کائنات جس کے بل پر بڑے بڑے پہلوان سخن خم ٹھونکتے ہیں۔ ایک بات رہ گئی اور وہ یہ کہ جس طرح اس شاعری کے حرکات سکنات مختلف ہوتے ہیں بالکل اسی طرح اس کے نام بھی مختلف ہیں۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ اب بجائے تضمین مخمس رباعی قطعہ وغیرہ کے "ان سے" "ان کو تنہا دیکھ کر" "دریا کے کنارے" "کمیت کی مینڈ پر" "آغوش تخیل میں" وغیرہ وغیرہ قسم کے عنوانات کے تحت طبع آزمائی کی جاتی ہے۔ اور جس طرح یہ شاعری بجائے خود صنادید عجم کی حیثیت رکھتی ہے ٹھیک اسی طرح اس کی قسمیں بھی عجوبہ روزگار ہیں مثلاً جذباتی شاعری، فطری شاعری، جمالیاتی شاعری، نفسیاتی شاعری اور خدا معلوم کون کون سی شاعری۔ یہاں پر ایک نکتہ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اس بوقلموں شاعری کے زمانے میں سب سے کامیاب شاعر وہی سمجھا جاتا ہے جو مہمل گوئی اور گلے بازی میں ید طولیٰ رکھتا ہو۔

ان حضرات سے قطع نظر کرکے کہ جو غم نفس، محبت سے لفظاً ہی مبتلائے شاعری کے تحت میں آتے ہیں یا جن اور شاعری میں للہ المشرقین والمغربین ہے وہ اعلیٰ نیاز ان ادب بھی جو اپنی ترنم ریزیوں سے لطافے شاعری پر زبردستی چھائے ہوئے ہیں ـــ مہمل گوئی کر جان شاعری جانتے ہیں۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے شعر مہمل سے مہمل تر بنا دیا جائے۔ تشبیہ و استعارات، تناسب الفاظ، رعایت لفظی، الفاظ و معانی میں ربط، عبارت آرائی، یہ اور اسی قسم کی تمام چیزیں آجکل لغو قرار دے دی گئی ہیں۔ رہ گیا فن وہ بیچارہ اس بنا پر مردود الزام ہے کہ اس سے فطری شاعری تباہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اس سے اور شاعری سے کوئی واسطہ نہیں چلئے چھٹی ہو گئی۔ اب باقی کیا رہ گیا چند غیر مربوط الفاظ کو کھینچ تان کر نظم کر دیا جن کی ترکیبیں دور از کار اور جن کا مفہوم دور از قیاس ہو زبان یا تو آدھا تیتر آدھا بٹیر قسم کی ہو یا پھر بازاری۔ اب شعر اگر قطعی مہمل "تعیز" ہوا ہے تو فلسفے کے سر تھوپا جائیگا اور اگر سادہ ہے تو یقینی طور پر ایک لطیف قسم کا کوک شاستر ہو گا۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ جو مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق ہیں۔

ناز سے دامن اٹھانا یاد ہے	دل کا اٹھ کر بیٹھ جانا یاد ہے
اُس مجسم برق حسن ناز کا	سر سے پا تک مسکرانا یاد ہے

دلنشیں ہے کمسنوں کے نرم لہجے کی کھٹک
مست فوارے کے قطروں میں ترنم کی نوا

قید کو توڑ کے نکلا جب اُٹھ کے بگولے ساتھ ہوئے
دشتِ عدم تک جنگل جنگل بھاگ چلا ویرانہ بھی

امنی سارا ہو کے فراہم جس نقطہ پر رہتا ہے
سارا عالم بے سمجھے بھی حال اسی کو کہتا ہے

نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

محبت جب کسی کے جذب دل کو گدگداتی ہے
نہیں کرتی ہے فرقِ شہر دصو ا ماہتاب آ سا
چلی آتی ہے ہر دوشیزہ کے بلیں حجاب آسا
اور آکر ساز کے تاروں کی بہریں مسکراتی ہے
فضا میں موجزن لمحات کا نظارہ ہوتا ہے
اور اک اک نغمہ سوزِ عشق کا گہوارہ ہوتا ہے

تین مصرعہ اور ملاحظہ ہوں

یہ موتی یہ جبیں یا انجم و مہتاب کا عالم
پریشاں خواب کا سا گیسوئے شب تاب کا عالم
چمن زار شعاع نور عکس دلنشیں تیرا

دیکھا آپ نے اس کو کہتے ہیں شاعری جس کو سن کر ایک مرتبہ روح ادب تھرا اٹھتی ہے اور مذاق سلیم دم دبا کر بھاگ جاتا ہے اور لطف تو یہ ہے کہ بیچاری شاعری کا اس طرح کند چھری سے گلا کاٹنے کے عوض ہر مہمل شاعر اپنی جگہ پر "رئیس المہملین" بننے کا آرزو مند ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وقتی سیلاب میں وہ حضرات کیوں بہے جاتے ہیں جن کے دم سے ابھی کچھ نہ کچھ رونق محفل باقی ہے اور جن سے علم و ادب کی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں اب اُسے ادب اُردو کی بدقسمتی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ غیر تو غیر اس کے اپنے بھی غیر ہوتے جا رہے ہیں۔

یہاں پر ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ قارئین کرام کہیں مجھے قدامت پسند نہ سمجھ لیں۔ میں ہرگز قدامت پسند یا لکیر کا فقیر نہیں ہوں۔ میں خود بھی جدّت پسند ہوں مگر ایک حد تک۔ غزل کو اگر زیادہ ضروری نہیں سمجھتا تو اس سے گریز بھی نہیں کرتا۔ اصل میدان میرا بھی نظم ہے۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود بھی میرا نظریہ ذرا مختلف ہے اور اس کو آپ ظریف مرحوم کی زبان سے سنئے۔

رابطہ الفاظ و معانی میں اگر باہم نہیں
قائل ایسی شاعری کے بندہ پرور ہم نہیں

جوہرِ سیماب

سروش عسکری طباطبائی

دُور آلودگیِ خواب ہوئی جاتی ہے
زندگی جوہرِ سیماب ہوئی جاتی ہے

کسی کی کشتی تہِ گرداب ہوئی جاتی ہے
موج خود ماہیِ بے آب ہوئی جاتی ہے

خوابِ الفت کی جو تعبیر نظر آئی تھی
اب وہ تعبیر بھی اک خواب ہوئی جاتی ہے

قُلزمِ عشق کی اللہ رے طوفاں خیزی!
زندگی چشمۂ پایاب ہوئی جاتی ہے

کون ہے مٹتے ہوئے دل کی وفا کا پُرساں؟
یہ وہ دولت ہے کہ نایاب ہوئی جاتی ہے

جام میں سایہ فگن ہے رُخِ رنگیں کس کا؟
پانی پانی جو مئے ناب ہوئی جاتی ہے

جانِ بیتاب ترے شوق میں اے بحرِ کرم
رو کشِ گوہرِ خوش آب ہوئی جاتی ہے

اُف وہ طوفان کہ اُمڈا ہی چلا آتا ہے!
اُف وہ کشتی کہ تہِ آب ہوئی جاتی ہے

ڈوبی جاتی ہے لئے مجھ کو مرے دل کی اُمنگ
یہ ہے وہ موج کہ گرداب ہوئی جاتی ہے

اور ہر جنس ہے بازارِ جہاں میں لیکن
اک محبت ہے کہ نایاب ہوئی جاتی ہے

ہاتھ دکھتے ہوئے پہلو پہ یہ کس نے رکھا؟
فطرتِ درد سکوں یاب ہوئی جاتی ہے

نجف سے بغداد تک!

ماہر القادری

غالب نے کسی حسرت سے کہا تھا کہ:-

زہے روانیِ عمرے کہ در سفر گزرد

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی تمام لذتوں میں طویل ترین لذت "سیر و سیاحت" ہے۔ دنیا کی دوسری لذتوں سے لطف اٹھانے کے بعد آدمی اپنا بہت کچھ کھو دیتا ہے لیکن "سیر و سفر" کی لذت، آدمی کے دامنِ ہوش و تفکر میں اپنی طرف سے کچھ ڈال دیتی ہے۔ سفر، عبرت اور تجربہ کی امتحان گاہ ہے۔

میں نے سنہ ۱۹۵۴ء میں عراق کا سفر کیا تھا، اس بات کو آٹھ سال ہو گئے، مگر مجھے ایک ایک واقعہ اس طرح یاد ہے جیسے یہ کل ہی کی بات تھی، اور میرا تصور جب چاہتا ہے بغداد کی گلیوں اور عراق کے نخلستانوں میں مجھے پہونچا دیتا ہے۔ کاش! تصور اور حقیقت ایک دوسرے میں سمو جا سکتے۔

کوفہ میں میرے سفرنامہ کا یہ ورق جو آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے، اتفاق کی بات ہے کہ نجف اشرف سے شروع ہوتا ہے۔ بمبئی سے بصرے اور بصرے سے بغداد اور وہاں سے نجف اشرف تک پہونچنے کی تفصیل گزشتہ اوراق میں درج ہے۔

ہاں! تو ہم صبح کے وقت ناشتہ کر کے، نجف اشرف سے موٹر کار میں روانہ ہوئے اور تھوڑی سی دیر میں کوفہ آ گئے۔ کوفہ میں حضرت مسلم بن عقیل قاصدِ حضرت سیدنا امام حسین علیہ السلام کے مزار پر فاتحہ پڑھی، اس کے بعد حضرت ہانی بن عروہ کی قبر پر پہونچے جو حضرت مسلم کے مقبرے کے محاذ میں واقع ہے۔ یہاں سے رخصت ہو کر کوفہ کی اس مسجد میں داخل ہوئے جو اسلامی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مسجد کا صحن بہت فراخ اور وسیع ہے صحن سے گذرتے ہوئے، ہم اُس مقام پر پہونچے! جہاں ابنِ ملجم نے حضرت سیدنا مولا علی کرم اللہ وجہہ کو نماز پڑھتے میں شہید کیا تھا، اسی مقام کی محراب پر یہ شعر کندہ ہے:

بسجدہ بود بدرگاہِ خالقِ وہاب
زدند تیغ بہ فرقِ علی درین محراب

قتل گاہِ علی کو دیکھ کر دنیا کی شقاوت اور بدطینتی کا اک منظر نگاہوں کے سامنے پھر گیا۔ وہاں سے باہر آنے کے لئے پلٹے تو ہمارے عراقی گائڈ نے مسجد کے ایک حوض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ طوفانِ نوح اسی تنور سے اُبلا تھا۔ واللہ اعلم

مسجد سے باہر آ کر ہم موٹر پر سوار ہو گئے، اور جعفر لانگ

کے عہد خلافت میں کوفہ آگیا۔ اسلام کے قرون اول میں کوفہ اچھا خاصہ شہر تھا اور علم و فضل کا مرکز اور جائے پناہ تھا۔ اب تو اس کی حیثیت معمولی قصبہ کی رہ گئی ہے۔ آبادی کے آس پاس کھجور کے باغ ہیں، قریب ہی دریائے فرات بہتا ہے۔ موجودہ کوفہ کی بستی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد مسعود کی یادگار ہے۔ اسی خاک سے امام ابوحنیفہ جیسا فاضل اجل پیدا ہوا، جو اسلامی قانون کا "ہیرو" تھا۔

حضرت ذوالکفل کا مزار

کوفہ سے چل کر "ذوالکفل" پہونچے، جہاں پر حضرت ذوالکفل پیغمبر کا مزار مبارک ہے۔ بستی بھی آپ ہی کے نام سے موسوم ہے۔ مزار کے صدر دروازے سے باہر ایک مینار ہے، جس کے طوفان نوح کے بعد کی تعمیر بتایا جاتا ہے۔ یہ مینار کہنگی اور انقلاب زندگی کی آپ ہی اپنی نظیر ہے۔ حضرت ذوالکفل کے مزار کی عمارت بھی بہت قدیم معلوم ہوتی ہے، مقبرے کی اندرونی دیواروں پر عبرانی کتبات منقش ہیں۔ گنبد کے اندر چند یہودی توریت پڑھ رہے تھے اور ساتھ ہی سگرٹ پیتے جاتے تھے۔ اس مزار کی مجاور اور متولی یہودی عورتیں ہیں، بستی میں یہودی بھی آباد ہیں، مکانات کچے پکے دونوں طرح کے ہیں، بازار مسقف ہے، جہاں اچھی خاصی چہل پہل رہتی ہے۔

بابل کے کھنڈروں میں

تقریباً ایک گھنٹہ میں حلہ پہونچے، حلہ بڑی پرفضا بستی ہے، بستی کے اندر دریا بہتا ہے، یہ ضلع کا صدر مقام ہے۔ یہاں کے حاکم اعلیٰ کو "متصرف" کہتے ہیں۔ تجارت کی منڈی بھی حلہ میں ہے، اس لیے یہ شہر خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ ہم نے حلہ کے ہوٹل میں بیٹھ کر شربت پیا۔ نگاہوں کے سامنے دریا بہہ رہا تھا، اور ہم مزے لے لیکر ٹھنڈا اور مزیدار شربت پیتے جاتے تھے، تکان نے بدن کو چور چور کر دیا تھا، شربت کے چند گھونٹوں نے آب حیات کا کام دیا اور ہم پھر تازہ دم ہو گئے۔

حلہ سے روانہ ہو کر بابل کے کھنڈروں میں پہونچے، ایک عراقی جوان نے "گائڈ" کے فرائض انجام دیے۔ بابل کے تمدن و تہذیب کے متعلق بہت کچھ کتابوں میں پڑھا تھا، مگر انقلابات نے اس شہر کو جسے یونان کے مشہور مورخ ہیرو ڈوٹس نے "تعمیر کا معجزہ" کہا تھا، خاک کے تودوں کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ بابل اب چند ٹوٹی، پھوٹی دیواروں، ریت کے تودوں اور گہرے غاروں کی صورت میں باقی رہ گیا ہے۔ معلق باغوں (　　　) کے چند ستون شاہی قصر کی عظمت کا کچھ اتا پتا دے رہے ہیں، ورنہ ا—

خاک کے کچھ ڈھیر ہیں باقی خدا کا نام ہے

بغداد واپس

بابل کے کھنڈروں میں بہت دیر تک گھومنے کے بعد موٹر پر سوار ہونے کے لیے واپس ہوئے تو ہم پسینہ میں شرابور تھے دھوپ کافی تیز تھی، ڈرائیور نے موٹر اسٹارٹ کرتے ہی جو اڑان بھری ہے، تو ہوا اور ریت کے دھوئیں اڑا دیے، راستہ میں عراقی قریوں سے گذرنا پڑا بعض

قریوں میں چھوٹے چھوٹے قہوہ خانے نظر آئے جہاں لوگ قہوہ پی رہے تھے۔ راستہ میں اونٹوں کی قطاریں نخلستان اور خس پوش مکانات کو دیکھکر قدیم عربی تمدن کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ موٹر تیزی کے ساتھ مسلسل چلتی رہی، یہاں تک کہ بغداد شریف کے مکانات نظر آنے لگے، اور دجلہ کے پل پر ہوا کے نم آلود جھونکوں نے بدن کو گدگدا کر کہہ دیا کہ "منزل آگئی" اب ہم بغداد کے خوشنما بازاروں سے گذر رہے تھے۔ باب الشیخ پر پہنچ کر موٹر رکی، اور جب ہم موٹر سے اترے ہیں، تو پنیر اور کھجور بیچنے والے آوازیں لگا رہے تھے۔

ساقی

یحییٰ اعظم گڈھی

ادھر بھی بخش دے اک جرعۂ کیف آفریں ساقی
تری مخمور آنکھوں پر فدا دنیا و دیں ساقی

مئے رنگیں سے اب چھلکا دے تو بھی ساغرِ رنگیں ساقی
گھٹاؤں سے برستی ہے شرابِ آتشیں ساقی

ہر اک موجِ صبا اب موجِ صہبا بن کے آتی ہے
فضائیں بن گئی ہیں میکدہ کی سرزمیں ساقی

برستا ہے زمیں پر آبِ حیواں ابرِ باراں سے
بہا دے تو بھی اٹھکر جوئے شیر و انگبیں ساقی

گھٹائیں جھوم کر اٹھیں تو میکش یہ پکار اٹھے
کسی نے کھولدی ہے اپنی زلفِ عنبریں ساقی

تخیل تیرے جلووں کا تصور تیری آنکھوں کا
یہ عالم ہے کہ ہے اب رقص میں جانِ حزیں ساقی

تجلی ہر طرف ہے بزم میں یہ جامِ رنگیں کی
فروغ انگیز ہے یا تیری تابندہ جبیں ساقی

ترے ساغر سے جس دم ریزشِ انوار ہوتی ہے
فلک کیا جھومتا ہے کیف میں عرشِ بریں ساقی

تجلی کا وہ عالم اور وہ دستِ ناز میں ساغر
کہاں یہ تاب رندوں میں کہوں تیرے قریں ساقی

رنگِ تغزّل

سید آلِ رضا۔ رضاؔ

جی لبھایا۔ آنکھ کے تارے ہوئے — حسن والے۔ اور بھی پیارے ہوئے
جی چکے اب چاہ کے مارے ہوئے — دل کے دشمن۔ جان سے پیارے ہوئے
التفاتِ شوقِ چشمِ نیم باز — رات کیسے کیسے نظّارے ہوئے
اشک ٹپکے اور دامن میں کھِلے — ٹوٹے تارے اور مہ پارے ہوئے
امتحانِ عہد دل کا رُخ بدل — جیتے جاتے ہیں۔ زباں ہارے ہوئے
حسن کا جلوہ ادب کی چھاؤں میں — دیکھتے ہی رہیئے جی ہارے ہوئے

باغ میں یاد آتا ہے کیا کیا رضاؔ
پھول بھی قسمت سے انگارے ہوئے

نغمۂ احساس

حسن یاور نقوی۔ یاورؔ

رُک رُک کے دل نے اپنی تباہی کا سانحا — اُسکو بھی آج سازِ نفس پر سُنا دیا
دل کی جراحتوں کے تبسّم میں ہے مزا — تجھ کو ترے ستم کی قسم مسکرائے جا
چھینٹوں سے میں نے خونِ تمنّا کے جابجا — رومانِ حسن و عشق کو رنگیں بنا دیا
پیغمبرِ سکونِ محبت ہے تیرا غم — ممکن نہیں ہے دل کے لئے تجھکو بھولنا
معصومیت سے تیری شکایت ضرور ہے — شکوہ نہیں ترے عدمِ التفات کا

یقین ہو گئی ہے فضاؤں کی شعریت
یاورؔ اس اہتمام سے اپنی غزل نہ گا

فریبِ انتظار

سید مرتضیٰ علی نقوی - بی اے

(۱)

دور سڑک پر ایک موٹر کی آواز —— جیسے آ کے موٹر ٹھہر گیا ہو۔ خاموش لیکن چاند سے منور فضا میں — قدموں کی آہٹ — دل کہتا ہے وہ آ گئے — احساسات میں امید کا تبسم —— نگاہوں میں کیفِ انتظار۔ نہیں غمِ انتظار —— کمرے کے باہر کوئی نہ تھا۔ مایوسی —— مایوس ہونے پر بھی — خلشِ انتظار

کتنا ستم پرور گمان —— ہے

(۲)

ساون کا مہینہ آیا۔ دھواں دھار گھٹائیں آسمان پر چھانے لگیں۔ روح افزا ہوائیں مستانہ وار چلنے لگیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار پڑنے لگی۔ باغوں میں سہیلیوں نے جھولے ڈالے —— ملہاروں کی تانیں اُڑنے لگیں ؎

پھر شگوفے مسکرائے پھر چھپی سینے میں سانس
بوئے یادِ یار پھر بے اختیار آنے لگی

کتنا خوشگوار موسم ہے —— جس کی رعنائیوں میں لمحہ بہ لمحہ ڈوبتی جا رہی ہوں۔ کسی نے پیچھے سے آنکھیں بند کر لیں۔ میں سہم گئی وہ ہنس پڑے —— عجب انداز سے میری طرف دیکھنے لگے —— میری آنکھیں نیچی ہو گئیں۔ انھوں نے پھولوں کا ایک خوشنما ہار میرے گلے میں ڈال دیا۔ وہ محبت سے کچھ کہہ رہے تھے کہ یکایک بڑی زور سے بجلی کڑکی میں چونک پڑی۔ میری آنکھیں کھلی تھیں لیکن ان کی صورت نظروں سے اوجھل ہو گئی —— کیا میں نے خواب دیکھا تھا؟ دل کی آس ٹوٹ گئی۔ آنسوؤں کے جھرنے بہہ نکلے

'پی کہاں' ! 'پی کہاں'، آہ نادان پپیہے تو نے بھی ہوئی آگ بھڑکا دی۔ تن بدن پھونک دیا —— پُروائی کا جھونکا آیا —— سُلگتے ہوئے انگارے دہک اٹھے۔ دل کی چوٹیں تازہ ہو گئیں —— خبردار اب کوئی جھونکا ادھر نہ آئے۔

اے بادل۔ بس اب نہ گرج —— جلد جلد جا اس دیس سے گذر جا۔

(۳)

جھٹ پٹا وقت ہو گیا۔ پھول کملائے چہرکا ہوں کا رنگ پھیکا ہو گیا۔ دریا کی مضطرب لہریں سکون پذیر ہو چلیں۔ ساحل پر افسردگی چھا گئی۔ پرندوں کے غول

کے غول باغوں کی طرف بسیرے کے لیے چل دیئے شفق آسمان پر رنگ بدلنے لگی۔ تارے بھی چمکنے لگے بن سائیں سائیں کرنے لگا۔ اس وقت میری نگاہیں تمہاری منتظر تھیں۔ یکایک نظر مشرق کی طرف گئی۔ ایک اٹھتا ہوا اجالا دکھائی دیا۔ میں سمجھی تم آ رہے ہو۔ مشتاق نگاہیں استقبال کے لیے بڑھیں لیکن نہیں۔ تم نہیں آئے۔ یہ تو چاند نکل رہا ہے — کتنا رنگین فریب ہے

(۴)

چاند نصف شب کی مسافت طے کر چکا ہے۔ درخت دم بخود ایک سنتری کی طرح اپنی جگہ پر کھڑے ہیں دور تک سناٹے کی حکمرانی ہے۔ گویا وقت کی رفتار بھی مدھم ہو گئی ہے۔ ساری دنیا گہری اور میٹھی نیند سو رہی ہے لیکن میں تمہارے انتظار میں بےچین۔ ہجر کی ماری جوانی کو سلانے کے لیے کروٹیں بدل رہی ہوں۔ دفعتاً زاغ کی صدائے بے ہنگم نے خوابیدہ دنیا کا سکوت توڑا۔ میری تخیل کی روانی میں بھی خلل ہوا۔ لیکن میں ایک آہ بھر کے اپنے خیالوں میں کھو گئی یکایک ایک تیز روشنی کی جھلک کا احساس ہوا جیسے بجلی چمک گئی ہو۔ دل بول اٹھا "تو وہ آ گئے یہ انہیں کی تابش کی روشنی ہے" لیکن آہ میں نے کیا دیکھا کہ سامنے آسمان پہ ایک روشن ستارہ ٹوٹ رہا ہے جس کے نقش قدم کی ایک لکیر باقی ہے۔ یہی لکیر میرے دل میں نشتر کا کام کر گئی۔ مشتاق آنکھیں خون رو دیں میری امید کا ستارہ ٹوٹ گیا۔ کیا وہ اب بھی نہ آئیں گے۔

(۵)

افق مشرق کی لو تھرتھرانے لگی۔ ستارۂ صبح کی رسیلی آنکھ جھپکنے لگی۔ عروسانِ چمن دھانی پوشاک میں ملبوس ہیں۔ نسیم سحر انکو جھولا جھلا رہی ہے۔ بزم سحر کے مطرب نغمہ زن ہیں۔ قمریاں رقص کر رہی ہیں۔ کلیاں اس عالم کو دیکھکر مسکرا دیتی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم آ رہے ہو

کھٹک کیوں دل میں ہو چلی پھر چٹکتی کلیو! ذرا ٹھہرنا
ہوائے گلشن کی نرم روی میں کسی کی آواز آ رہی ہے

اب زمین و آسمان روشن ہونے لگے۔ دل کہتا ہے کہ تم ضرور آ رہے ہو لیکن آہ کیا دیکھتی ہوں کہ آفتاب کی درخشاں کرنیں جلوہ ریز ہیں اور تم نہیں آئے۔

کون؟

سلام کی اس نظم میں اسلوب نگارش کی جدت آپ اپنی مثال ہے ممکن ہے ہمارے بعض بزرگ اس شوخی کو برداشت کر سکیں لیکن جدت طبع اور شگفتگی بیان کی داد تو دینی ہی پڑے گی۔

اس دور میں مے اور ہے۔ جام اور ہے جم اور ہے ساقی نے بنا کی روش لطف و کرم اور۔ اقبال　"مدیر"

کون؟

ہاں، یار نہ کیجے مری دیواروں کو:
آپ تو بڑھتے ہی آتے ہی ادھر ہی رہیے!
کیا مزا آپ کو دی جائے یہ خود ہی کہیے!
دیکھیے یوں نہ مرے حسن کے نظاروں کو!
ہے نگہباں کی نظر
آپ کی اس جرأت پر!
میں قسم ہے اسے برداشت نہیں کر سکتی!

کون؟

پھلواری میں کیوں آپ چلے آتے ہیں؟
آپ تو بڑھتے ہی آتے ہیں ذرا رک جائیں
خود ہی تجویز خطاؤں کی سزا فرمائیں!
کیوں مرے جھیلی کی طرف جاتے ہیں؟
باغباں بھی ہے کھڑا
دیکھ کے وہ سوچے گا کیا؟
میں قسم ہے اسے برداشت نہیں کر سکتی!

کون؟

اندر نہ قدم رکھیے عنایت ہو گی
آپ رکتے ہی نہیں ہوش میں ہیں یا کہ نہیں؟
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ غصہ مجھے آ جائے کہیں!
کیا مرے پردے کو بھی چھونے کی جرأت ہو گی؟
کمرے کے پیچھے وہاں
جیسے ملازم ہے عیاں!
میں قسم ہے اسے برداشت نہیں کر سکتی!

کون؟

کمرے میں در آ جانے کی جرأت کیجے!
آپ رکتے ہی نہیں، کیا کوئی سودائی ہیں؟
آپ اب میرے لئے باعث رسوائی ہیں!
میرے گلدستے کو چھونے کی نہ رغبت کیجے!
خادمہ آ جو گئی؟
آپکو وہ پا جو گئی؟
میں قسم ہے اسے برداشت نہیں کر سکتی!

کون؟

اب وقت نہ یوں کیجئے بیکار مرا!
ماتھے ہی میں بڑھتے ہی چلے آتے ہیں!
آپ اٹھتے ہی یہ غمزے کسے دکھلاتے ہیں!
ہاں یہ کیوں چھوتے ہیں جو ہے یہ کسیں بار مرا!
مسکراتی ہے کلی
یا سہیلی وہ مری!
میں قسم ہے اسے برداشت نہیں کر سکتی!

کون؟

کیوں کرتے ہیں اسطرح پریشان مجھے
آپ کیا ٹھان کے آئے ہیں ارادہ کیا ہے؟
کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ منشا کیا ہے!
دیکھئے اتنو نہ یوں کیجئے حیران مجھے!
کیا کہے گا یہ جہاں!
اور میں جاؤنگی کہاں؟
میں قسم ہے اسے برداشت نہیں کر سکتی!

سلام مچھلی شہری

جذب تصور

وسیم سندیلی

آ! کہ اب اشکبار ہے کوئی — ہمہ تن انتظار ہے کوئی
اے محبت! اشکوں کے پردے میں — کس قدر بیقرار ہے کوئی
یہ بناوٹ کی ہے ہنسی، ورنہ — غم کا آئینہ دار ہے کوئی
ہاں نہ چھیڑ، اے نسیم صبح! نہ چھیڑ — آج خود اشکبار ہے کوئی
اور کا اس جہاں میں ذکر تو کیا — اپنی ہستی پہ بار ہے کوئی
بنکے دیوانہ، کیا تماشہ ہے! — رونق کوئے یار ہے کوئی
پارۂ برق و پارۂ سیماب — دل سے بے اختیار ہے کوئی

اے وسیم اہل دل ہیں قدر شناس
یوں تو مٹ کر غبار ہے کوئی!

ہوائی چھاتے (پیراشوٹ)

سید محتشم حسین زیدی (پائلٹ)

محتشم صاحب ایک اچھے ہواباز ہیں۔ اور ساتھ ہی مضمون نگار بھی۔ ہم آپکی قلمی معاونت کے ممنون ہیں۔ ہندوستان میں بھی یہ موضوع بالکل نیا ہے اور خاص کر اُردو میں تو ابھی ہوابازی پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ مضمون ہمارے پڑھنے والوں کے لیے دلچسپ ثابت ہوگا۔ اگلے صفحہ پر آپکی تصویر بھی شائع کی جا رہی ہے ——— مدیر

آج کل بیاہ برات میں اکثر رنگ برنگ کے غبارے آسمان پر اُڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو ان جہازوں کی ابتدائی درجہ بدرجہ ترقی اور اس ترقی کے موجودہ نتائج پر غور کرتے ہوں گے۔ کون اس بات پر دھیان دیتا ہے کہ یہی غبارے ترقی کرکے ہوائی جہاز بن گئے ہیں۔ آج کل اگر ان غباروں کو زمین سے اُٹھتے وقت دیکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں روشنی جلائی جاتی ہے جس کی وجہ سے گیس پیدا ہوتی ہے اور جب گیس غبارے میں بھر جاتی ہے تو وہ اُس کے زور سے اوپر اٹھنے لگتا ہے۔ ہوائی جہاز کی ایجاد سے پہلے لوگ انہی غباروں میں اڑتے تھے اور اترنے کے لئے بڑے بڑے چھاتے (پیراشوٹ) استعمال ہوتے تھے۔

پیراشوٹ کا خیال اگرچہ بہت پرانا ہے اور یورپ کے پرانے قصوں اور ایشیا کی مشہور کہانیوں اور داستانوں میں بھی اسکا ذکر ملتا ہے لیکن اٹھارھویں صدی کے ختم تک اس کا استعمال صرف یہیں تک محدود تھا کہ آدمی کسی اونچی عمارت مینار یا پل پر چڑھ جاتا اور وہاں سے بڑے بڑے چھاتے لیکر پھاند پڑتا۔ ایک طرف زمین کی کشش اسے اپنے طرف کھینچتی اور دوسری طرف نیچے سے اوپر اٹھتی ہوئی ہوا چھاتے اور اس کے ساتھ اس آدمی کو ہوا سے لئے ہوئے اڑنے کی کوشش کرتی۔ چونکہ آدمی کا وزن اور زمین کی کشش میں ہوا سے زیادہ طاقت ہوتی ہے اس لئے آدمی نیچے ہی کی طرف آتا ہے چھاتے میں بھری ہوئی ہوا ایک طرف سے بریک کا کام کرتی اور اس لیے وہ ایک دم سے گرنے کے بجائے آہستہ آہستہ اترتا ہے

سب سے پہلے ۱۷۹۷ء میں فرانس آینڈری گارنرین نامی ایک شخص چھاتے کی مدد سے ایک غبارہ سے پھاندا تھا۔ ۱۸۰۲ء میں اس نے انگلستان آکر اپنے کرتب کا مظاہرہ کیا۔ گارنرین نے اپنے ابتدائی تجربوں میں جو چھاتے استعمال کئے اسمیں چوٹی پر ایک سوراخ

ہوتا تھا کہ اترتے وقت آدمی ہچکولے نہ کھائے لیکن بعد کو اس نے سوراخ کرنا چھوڑ دیا۔ مگر اس کے بیس دنوں بعد ہوا بازوں کے تجربہ نے سوراخ کی اہمیت دوبارہ ثابت کردی اور پرانا طریقہ پھر رائج ہو گیا۔ گارزن کے زمانہ میں چھاتے غباروں میں لگے رہتے تھے۔ [illegible] میں ان کو الگ رکھکر بھی تجربہ کیا گیا۔

ان تجربہ کرنے والوں میں میجر ٹامس بالڈون نامی ایک امریکن کا نام بہت مشہور ہے اسی نے سوراخ والے چھاتوں کو رائج کیا۔ ایک دفعہ بالڈون اپنے کرتب کا مظاہرہ کرنے کے لئے ایک غبارہ سے چھاتا لے کر کودا۔ ہوا چھاتے کے اندر بھر گئی اور جب اسے اوپر نکاسی نہیں ملی تو چھاتا ہچکولے کھانے لگا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی جناتنگ کے تعبے پر بیٹھکر پینگ لیتا ہے۔ اس سے بالڈون کو پتہ چلا کہ اگر ہوا کو نکاسی کے لئے راستہ مل جائے تو یہ ہچکولے کم ہو جائیں گے۔ چنانچہ وہ گارزن کے پرانے طریقے پر کاربند ہو گیا۔

ہوائی جہازوں کی ایجاد کے بعد سے اگرچہ پرواز آسان ہو گئی مگر چھتری بازوں کے لیے ہوائی جہاز سے اترنا بہت مشکل تھا لیکن متعدد تجربوں کے بعد لوگوں نے اس کی بھی صورت نکال لی۔ سب سے پہلا کامیاب تجربہ لیسلی۔ ایل۔ اروِن نامی ایک شخص نے ۱۹۱۹ء میں کیا۔ اس نے اپنا چھاتا لپیٹ کر (واضح رہے کہ ان چھاتوں میں ہماری دھوپ اور پانی سے بچانے والی چھتریوں کی طرح دستہ اور تیلیاں وغیرہ نہیں ہوتیں بلکہ صرف ایک بڑا سا اور بہت مضبوط کپڑا اور اتنی ہی مضبوط ڈوریاں ہوتی ہیں جن کی مدد سے وہ کپڑا پیراشوٹ آدمی کے بدن پر باندھ دیا جاتا ہے) ایک بورے میں کر کے ہوائی جہاز پر رکھ لیا اور ایک ڈوری سے اسے اپنے بدن کے ساتھ باندھ لیا۔ جب وہ ہوائی جہاز پر سے پھاندا تو اس کا چھاتا بورے میں سے نکل کر ہوا میں پھیل گیا۔ انگلستان میں سب سے پہلے ۱۹۱۲ء میں ولیم نیول نامی ایک شخص چھاتے کی مدد سے ہوائی جہاز سے اترا تھا۔ اس پرانے طریقہ میں اب ایک جدید اصلاح یہ ہوئی ہے کہ جب آدمی ہوائی جہاز سے پھاندتا ہے تو تھوڑی دور تک اس کا چھاتا نہیں کھلتا بلکہ ایک اس سے چھوٹا چھاتا نکلتا ہے جو تھوڑی دور پہونچکر اپنے کھینچاؤ سے بڑے چھاتے کو بھی کھول دیتا ہے۔ اس طرح اس بات کا کوئی خطرہ نہیں رہتا کہ چھاتا ہوائی جہاز سے پھنس جائیگا۔ جو چھاتے باز زیادہ ماہر ہوتے ہیں وہ بہت دور تک بغیر چھاتا کھولے چلے آتے ہیں اور جب زمین سے ہزار فٹ کے قریب رہجاتے ہیں تب چھاتا کھول دیتے ہیں۔

چھاتے کی مدد سے پھاندنا اور زمین پر صحیح وسلامت پہنچ جانا کوئی آسان کام نہیں۔ اگر اترتے وقت بدن کا توازن ذرا بھی بگڑ جائے یا پہلو ذرا بھی غلط ہو جائے تو سخت سے سخت چوٹ آجانے کا اندیشہ رہتا ہے اور اکثر اوقات ہوا باز زندگی بھر کے لیے بیکار ہو جاتا ہے اسی لیے اس فن میں ٹریننگ پر خاص دھیان دیا جاتا ہے۔ روس اور جرمنی میں چھاتے بازوں کی ٹریننگ کا بہت اچھا انتظام ہے اور ان ہی دونوں ملکوں نے اس

فن میں سب سے زیادہ ترقی کی ہے۔ روس کے بنئے سوویٹ نظام میں اس کو صرف سیر و تفریح کے لیے نہیں رکھا گیا ہے بلکہ ملکی حفاظت اور فوجی طاقت میں اضافہ کرنے کے لیے بھی اس سے کام لیا گیا ہے۔ جرمنی نے جو کچھ حاصل کر لیا ہے۔ اس کا نمونہ تو ہمیں موجودہ لڑائی ہی میں دکھائی دے رہا ہے۔ روس میں خاص طور پر اس فن کو بہت مقبولیت حاصل ہے۔ وہاں کے ایک شہر لینن گراڈ میں ایک پبلک پارک میں نوجوانوں کو اس طرف رجوع کرنے کے لیے عام مظاہرے کئے جاتے ہیں اور ایک جدید ترین مشین کی مدد سے کام بھی سکھایا جاتا ہے اس مشین میں پنکھے لگے ہیں جو بہت تیزی سے اوپر کی طرف ہوا پھینکتے ہیں نیچی جاتے ہیں۔ ایک آگے کی طرف نکلے ہوئے پلیٹ فارم پر کھڑا ہوتا ہے۔ نیچے مشین چلتی ہے اور ہوا باز ہوا کے زور سے ایک دم ڈھائی سو فیٹ اونچا چلا جاتا ہے وہاں سے وہ ہوا میں پیرتا ہوا آہستہ آہستہ اترتا ہے۔

پچھلی جنگ عظیم میں اس فن کا کوئی خاص مظاہرہ نہیں ہوا تھا۔ اور اس سے زیادہ سے زیادہ یہ کام لیا جاتا تھا کہ خندقوں میں پھنسی ہوئی سپاہ کو رسد یا معمولی سامان جنگی سامان پہنچا دیا جائے۔ اور اس کے بعد بھی ۱۹۳۵ء تک ہوا باز پیراشوٹ کو ہوائی جہاز خراب ہو جانے پر صرف اپنی جان بچانے کے لیے استعمال کرتے تھے لیکن اس کے برخلاف آجکل کی لڑائی میں پیراشوٹ کا یہ استعمال بہت محدود ہے اس لیے کہ جنگی ہوائی جہازوں کی مشینیں اتنی اچھی اور اتنی مضبوط ہوتی ہیں کہ ان کے خراب ہونے کا امکان ہی نہیں ہوتا اور ہوائی جہاز شکن توپ یا جنگی ہوائی جہاز کی مشین گن کی گولی کھا کر ہوا باز کے ہوش ہی اتنے باختہ ہو جاتے ہیں کہ اسے پیراشوٹ کھولنے اور پہننے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ لیکن اس کے علاوہ پیراشوٹ کے استعمال کی اور بھی بہت سی نئی نئی ترکیبیں نکل آئی ہیں مثلاً اکثر اس کی مدد سے ہلکی ہلکی توپیں اور مشین گنیں میدان جنگ میں اتار دی جاتی ہیں۔ اور اگر پیراشوٹ غیر معمولی طور پر مضبوط اور بڑا ہو تو چھوٹے چھوٹے ٹینک بھی اتارے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ پیراشوٹ کا ایک جدید ترین استعمال یہ ہے کہ بہت چھوٹے چھوٹے پیراشوٹ جنہیں ڈوری کی جگہ تار لگا ہوتا ہے ایک بڑے سے گولے میں رکھ دیئے جاتے ہیں۔ اور گولہ اوپر پھینکا جاتا ہے جہاں اس کے پھٹتے ہی اندر سے چھوٹے چھوٹے پیراشوٹ نکل پڑتے ہیں اور ہوا میں تیرنے لگتے ہیں، ان سے ہوائی جہازوں کے حملے کو روکنے میں مدد ملتی ہے اس لئے کہ ان کا تار ہوائی جہاز میں پھنس کر اس کو بیکار کر دیتا ہے۔

پیراشوٹ کا سب سے زیادہ حیرت انگیز استعمال جرمنی نے کیا ہے وہ ۱۹۳۵ء ہی سے اپنی چھتری باز فوج تیار کر رہا تھا۔ شروع میں نازیوں کے جاسوسی ہوائی دستے میں صرف ایک بٹالین چھتری بازوں کی بنائی گئی تھی لیکن رفتہ رفتہ تعداد بڑھتی گئی اور اب کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس چھتری بازوں کا ایک پورا ڈویژن یعنی تین رجمنٹ موجود ہیں۔ چھاتے بازوں کے زیادہ تر

دو کام ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اچانک پہنچ کر دشمن کے ہوائی مستقر پر قبضہ کر لیتے ہیں تاکہ پیچھے سے باربردار ہوائی جہاز یا وہ فوج لاکر اتار سکیں۔ اٹلی نے البانیہ اور جرمنی نے ناروے اور ہالینڈ میں یہی ترکیب چلی۔ ان کا دوسرا اور بہت بڑا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ دشمن کے ملک میں جاکر بے ترتیبی پھیلا دیتے ہیں اور دشمن کی فوج کو رسد اور سامان جنگ پہنچنے کے راستے بند کر دیتے ہیں۔ ہالینڈ، ڈنمارک اور ناروے میں جرمنی اسکا بھی مظاہرہ کر چکا ہے۔

چھتری باز کو جس ملک میں جانا ہوتا ہے اسے اس کے مخصوص ہتھیاروں کا استعمال، وہاں کی زبان، طرز معاشرت، اور تفصیلی جغرافیہ بھی سکھایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اترتے ہی ہر چیز سے پوری طرح مانوس ہو جاتا ہے۔ ہالینڈ پر جرمنی کے اتنی جلد قبضہ کر لینے کا سہرا دراصل اس کی چھتری باز دستوں کے سر ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے پہلے سے پہنچکر جرمن جاسوسوں اور اپنے خفیہ کارندوں سے مل کر ملک میں ایک عام بے چینی پھیلا دی اور وہاں کے سمندری بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا۔ ظاہر ہے اگر ان ہوابازوں کو ہالینڈ کے جغرافیہ میں اچھی مہارت نہ ہوتی تو وہ اتنی جلدی سمندری بندرگاہوں کو بیکار نہیں کر سکتے تھے۔ دوڑنے بھاگنے کے لئے چھتری باز المونیم کی بنی ہوئی ہلکی اور فولڈ کی بائیسکل لے جاتا ہے۔ ایک موٹر سائیکل بھی ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ وہ پوری طرح مسلح ہوتا ہے اور پستول اور خنجر کے علاوہ اکثر چھوٹی مشین گن بھی لیکر اترتا ہے۔

پیراشوٹ کو نوع انسان کے فلاح اور بھلائی کے کاموں میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور کہیں کہیں استعمال کیا بھی جاتا ہے۔ مثلاً روس میں اسکی مدد سے دور دراز کی جنگلی اور دشوار گذار بستیوں میں جہاں آمد و رفت کے کوئی ذرائع نہیں ہیں طبی امداد پہنچائی جاتی ہے لیکن آجکل کی دنیا میں جبکہ پاگل حکمران اپنی لوٹ کھسوٹ کو برقرار رکھنے اور بڑھانے کی فکر میں دنیا کی ہر چیز اور ساری دولت کو اپنے نجی فائدے کی خاطر ضبط کر دینے کو تیار ہیں اس قسم کی باتیں محض خواب و خیال ہیں۔

شعاع امید

کائنات کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جو زبردست نغمہ گونج رہا ہے اسے آج میرے بربطِ دل پر بجانے کی سعی میں کیوں مشغول ہو؟
کیا میرے بربطِ دل کے تار اس زبردست نغمہ کے متحمل ہو سکیں گے؟
اے نادان! اس کا بھی تو خیال کیا ہوتا —— !
لیکن ان تاروں کو توڑ کر پھینک دوں! یہ بھی تو میرے نازک دل سے ممکن نہیں — کیونکہ ابھی یہ امید زائل نہیں ہوئی ہے کہ دنیا میں میری یہ منتشر پنکھڑیاں بہار لانے میں کامیاب ہوں گی —— !!

م۔ طلعت بنارس — ترجمہ ٹیگور۔

نقوشِ ماضی

آمنہ جبیں

مجھے آجتک یاد ہے وہ زمانہ — گذرتی تھی جب زندگی والہانہ
فضاؤں میں رقصاں مسرت کی لہریں — محبت میں ڈوبا ہوا تھا زمانہ
ہر اک بات تھی دلنوازی کے شایاں — ہر اک فکر تھی نکتۂ شاعرانہ
ہر اک ذوقِ باطن میں اک شوقِ پنہاں — وفا کی حقیقت - جنوں کا فسانہ
نظر روحِ سرشار کا اک تبسم — نفس بربطِ عشق کا اک ترانہ
منانا کہوں یا بگڑنا کہوں میں — خفا ہو کے وہ دردِ سر کا بہانہ
کبھی نرم لہجوں میں رنگیں شکایت — کبھی دشمنی میں کرم کا فسانہ
کبھی شوخ و رنگیں جوانی کی باتیں — مذاقِ محبت کبھی عارفانہ
کبھی روح پرور ادائیں تمہاری — کبھی برہمی بھی سخن گسترانہ
تغافل کے پردے میں دلکی لگاوٹ — تجاہل، محبت کا رنگیں بہانہ

مگر اب وہ پر کیف باتیں نہیں ہیں
وہ دن اب نہیں ہیں۔ وہ ناتیں نہیں ہیں

زینت

اختر انصاری

محبت ایک خوب صورت، رنگین، پرکیف اور دلآویز!

ہم محبت کرتے ہیں تو کس کس طرح اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں! تخیلات کے محل بناتے ہیں تصورات کی جنتیں تعمیر کرتے ہیں۔ ایک نئی دنیا بساتے ہیں، ایسی دنیا جو حقیقت اور واقعیت سے دور ہوتی ہے ہماری اصلی زندگی کے مکروہات اور معمولات سے بہت پرے! ایسی دنیا جس میں غم روزگار کی کثافتیں بار نہیں پاتیں، جہاں محبت اور محبت کی حلاوتوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

گرمیوں کی ایک سہ پہر ہے۔ گرم، سنسان اور طویل! وقت ہے کہ کاٹے نہیں کٹتا۔ چائے پی رہا ہوں اور رومال سے پسینہ خشک کرتا جاتا ہوں کسی فلمی گانے کا ایک بول زبان پر ہے۔ دھیمے دھیمے سروں میں الاپ رہا ہوں۔ یکایک کمرے کا دروازہ کھلتا ہے، اور نعیم صاحب مسکراتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔

یہ میرے نئے دوست ہیں۔ پڑوس میں جو ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اُن کے چھوٹے بھائی! علیگڈھ میں قانون پڑھتے ہیں اور آج کل گرمیوں کی تعطیل میں گھر آئے ہوئے ہیں۔

"آئیے نعیم صاحب! تشریف لائیے۔ چائے پیجیے — ارے عنایت! ایک پیالی اور لاؤ"۔

"جی نہیں، میں چائے نہیں پیوں گا" نعیم صاحب کہتے ہیں، "میں تو آپ کا گانا سننے کی غرض سے آیا ہوں"

"گانا؟ میں گانا کب جانتا ہوں؟" میں حیرت کے ساتھ سوال کرتا ہوں۔

"اور یہ ابھی کون گا رہا تھا؟ میں بہت دیر سے آپکے گانے کی آواز سن رہا تھا۔ آپ تو اکثر گایا کرتے ہیں"۔

"آپ اس کو گانا کہتے ہیں؟" میں ہنسکر جواب دیتا ہوں'

"مجھے تو صرف گنگنانا آتا ہے۔ ایک عادت سی ہوگئی ہے، ہر وقت گنگنایا کرتا ہوں"۔

"خیر وہ گنگنانا ہو یا گانا، آواز آپ کی بہت خوب ہے"۔ نعیم صاحب کہتے ہیں۔

میں اُن کی تعریف کو نظرانداز کرتے ہوئے جواب دیتا ہوں، "اصل میں مجھے تنہائی بہت ستاتی ہے۔ اور تنہائی کا علاج میرے پاس اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ سگریٹ پیتا رہوں یا گنگناتا رہوں"۔

نعیم صاحب کی آنکھیں جھکنے لگتی ہیں، اور وہ بیمار اور سنجیدہ ہو کر فرماتے ہیں "تنہائی کا جو اصلی علاج ہے وہ آپ کیوں نہیں کرتے"؟

"وہ کیا؟"

"شادی" وہ یوں مسکرا کر کہتے ہیں گویا کوئی بہت ہی شوخی آمیز بات کہہ رہے ہوں، "تنہائی کی مصیبت سے بچنے کا بہترین ذریعہ ہے شادی!"

میں بھی اس طرح مسکراتا ہوں گویا انکی بات سنکر بہت محظوظ ہوا ہوں۔

"ہاں، بات تو ٹھیک ہے"، میں جواب دیتا ہوں، "مگر میں فی الحال شادی نہیں کر سکتا"۔

"کیوں؟ کیا تامل ہے"؟

"تامل یہی ہے کہ میں ابھی روزگار کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ میری پریکٹس ابھی ایسی نہیں ہے کہ......"

نعیم صاحب زور سے ہنستے ہیں، "جہاں تک میں نے دیکھا ہے وکیل لوگ اپنی آمدنی بڑھا چڑھا کر بتایا کرتے ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے آپ کی روش بالکل اسکے برعکس ہے۔ آپ......"

"نہیں، یہ بات ہرگز نہیں"، میں جواب دیتا ہوں، "میری آمدنی فی الحقیقت اتنی معمولی ہے کہ خود میرے اخراجات کے لیے بمشکل کافی ہوتی ہے"

نعیم صاحب پھر ہنستے ہیں، اور کہتے ہیں، "یہ محض آپکا خیال ہے وکیل صاحب! آپ کی پریکٹس بہت اچھی ہے اور آپ یقیناً ایک بیوی کا بار اُٹھا سکتے ہیں"۔

"بار تو بیشک اٹھا سکتا ہوں۔ اور بار جب پڑتا ہے اٹھایا ہی جاتا ہے مگر میرا مطلب یہ ہے کہ...... یعنی ...... ازدواجی زندگی کا جو معیار میرے ذہن میں ہے میں سمجھتا ہوں اس کے مطابق میں زندگی بسر نہ کر سکونگا"

"تو اس کے معنی ہیں کہ آپ نے ازدواجی زندگی کا جو معیار قائم کیا ہے وہ بہت ہی بلند ہے"۔

"ممکن ہے بلند ہو — ضرورت سے زیادہ بلند! مگر فی الحال میں شادی کے مسئلے پر اسی طرح غور کیا کرتا ہوں"

شام کا وقت ہے۔ میں اپنے پڑوسی، ڈاکٹر صاحب سے بحیثیت ایک پڑوسی کے ملنے آیا ہوں۔ پُرتکلف ڈرائنگ روم ہے، ڈاکٹر صاحب ہیں، اُن کے چھوٹے بھائی نعیم ہیں، اور میں ہوں۔ ریڈیو کی دلنواز موسیقی کمرے میں گونج رہی ہے — دہلی سے مس چٹرجی کا گانا نشر ہو رہا ہے۔

تھوڑی دیر میں گانا ختم ہوتا ہے، اور اعلان کیا جاتا ہے،

"......اب مسز روت علی تقریر فرمائیں گی۔ تقریر کا موضوع ہے — ہندوستانی سماج میں عورت کا درجہ!"

اعلان سنتے ہی ڈاکٹر صاحب اپنے بھائی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں،

"نعیم ذرا زینت کو بلا لو۔ وہ اس تقریر کو سننا چاہتی تھی"

نعیم صاحب، میری طرف دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اُن کا مطلب سمجھ جاتے ہیں اور فرماتے ہیں، "بلا لو، کیا ہرج

ہے، وکیل صاحب تو اپنے ہی آدمی ہیں!"

نعیم صاحب مسکرا اندر چلے جاتے ہیں۔ اب ڈاکٹر صاحب مجھ سے مخاطب ہوتے ہیں "یہ پردہ بھی کتنی مہمل چیز ہے۔ لاحول ولا قوۃ"!

میں خاموش رہتا ہوں اور کوئی جواب نہیں دیتا۔ مسز رؤف علی اپنی تقریر شروع کر چکی ہیں۔ اُدھر کان لگا دیتا ہوں۔

ایک لمحے کے بعد نعیم صاحب واپس آکر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور مجھے احساس ہوتا ہے کہ ان کے پیچھے پیچھے کوئی اور بھی آیا ہے۔ ایک اُچٹتی ہوئی اور بے پروا نظر زینت پر ڈالتا ہوں، یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ کسی عورت کا کمرے میں اچانک آ جانا میرے لئے سراسیمگی کا باعث نہیں ہوتا، اور یہ کہ زینت سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے، نہ ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد تقریر سننے میں محو ہو جاتا ہوں، یعنی یہ ظاہر کرتا ہوں کہ تقریر سننے میں محو ہوں۔ جب مسز رؤف علی کوئی پتے کی بات کہتی ہیں تو مسکرا کر ڈاکٹر صاحب، یا نعیم صاحب کی طرف دیکھتا ہوں۔ زینت کی طرف بالکل نہیں دیکھتا، گویا اس کی موجودگی سے قطعی بے خبر ہوں۔ مگر یہ سب کچھ دکھاوا ہی دکھاوا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ایک پیکرِ ناز و زیبائی کے قرب کا احساس جیسا کچھ ایک نوجوان کے دل میں ہونا چاہئے میرے دل میں بھی ہے۔ مجھے اس وقت دنیا ایک حسین تر اور رنگین تر جگہ معلوم ہو رہی ہے۔ روح کی گہرائیوں میں کوئی چیز کروٹ لیکر بیدار ہو رہی ہے۔ کان اگرچہ مسز رؤف علی کی آواز پر لگے ہوئے ہیں، لیکن ذہن اُن کے بیشتر الفاظ کو معنی کا جامہ پہنانے سے انکار کر رہا ہے۔ وہ یہ بتا رہی ہیں کہ ہندوستانی سماج میں عورت کا کیا درجہ ہے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میرے دل میں عورت کی کتنی محبت ہے اور ہو سکتی ہے۔

تقریر ختم ہو جاتی ہے۔

"اچھی تقریر ہے"، ڈاکٹر صاحب تبصرہ فرماتے ہیں۔

"جی ہاں، خوب ہے" میں اُن کی رائے سے اتفاق کا اظہار کرتا ہوں۔

"کہو زینت! تمھاری کیا رائے ہے؟" ڈاکٹر صاحب اپنی لڑکی سے پوچھتے ہیں۔

وہ جواب میں صرف نظریں جھکا کر مسکراتی ہے لیکن مجھے اُس پر ایک بھرپور نظر ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے، اور میں اس موقع سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔ ایک ہی نظر میں اُس کے حسن کی تمام رنگینیوں کو سمیٹ لیتا ہوں، اور پھر کمال بے نیازی سے سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو جاتا ہوں۔

مسز رؤف علی کی تقریر کے بعد موسیقی کا پروگرام پھر شروع ہو گیا ہے۔ کوئی پیشہ ور مغنی اپنے فن کے اظہار میں گلے کا سارا زور صرف کر رہا ہے۔ ہم یعنی ڈاکٹر صاحب، نعیم صاحب اور میں، متفقہ طور پر فیصلہ کرتے ہیں کہ ریڈیو بند کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ کمرے میں یک لخت سکون ہو جاتا ہے، ایسا سکون جو اکثر ریلوے اسٹیشن پر گاڑی گزر جانے کے بعد محسوس ہوتا ہے

"اچھا بیٹی، تو تم اب جاؤ" ڈاکٹر صاحب زینت سے کہتے ہیں۔

وہ خاموشی سے اُٹھکر چلی جاتی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کمرے میں شام ہوگئی۔

آج میں ڈاکٹر صاحب کے ہاں شب کے کھانے پر مدعو ہوں۔

ڈاکٹر صاحب ایک تیسرے شخص کے ذریعہ مجھے اپنی فرزندی میں لینے کی خواہش ظاہر کر چکے ہیں۔ میں نے اپنی رضامندی ظاہر نہیں کی ہے لیکن کوئی مایوس کن جواب بھی نہیں دیا ہے۔ میں آجکل اس مسئلے پر غور کر رہا ہوں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب مجھے محظوظ کرنے اور اپنی محبت و شفقت جتانے کے لیے ہر ممکن ذریعے سے کام لے رہے ہیں۔ آج کا ڈنر بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ کھانے کی میز پر ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب کی بیگم، اور نعیم صاحب کے علاوہ زینت بھی موجود ہے۔ وہ میرے سامنے ہی بیٹھی ہے اُس کی نظریں اس طرح جھکی ہوئی ہیں گویا اُس نے مجھے دیکھنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ میں بھی اُس کو بیباکانہ دیکھنے سے اجتناب کر رہا ہوں۔ مگر موقع پاتا ہوں۔ تو دیکھ ہی لیتا ہوں۔ اپنی نظریں اُس کے چہرے پر جما دیتا ہوں۔ وہ میری گرمیٔ نگاہ کو محسوس کرتی ہے اور اُسکے حسن میں شرمگینی کی ایک اور جھلک پیدا ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی چھوٹی بچی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ سب بیک وقت اُس سے مخاطب ہو جاتے ہیں اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگتے ہیں۔

"اب تک تم کہاں تھیں شوکت"؟

"تم نے کھانا کھا لیا بیٹی"؟

"اور کھاؤگی"؟

"یہ پھل رکھے ہیں، لوگی"؟

میں یہ دیکھکر کہ سب کی توجہ شوکت کی طرف ہے، خود زینت کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ بریانی کی ایک قاب میز کے بیچ میں، میرے اور اُس کے درمیان رکھی ہوئی ہے۔ وہ اس میں سے بریانی لے رہی ہے۔ میں قاب کو اپنی طرف گھسیٹ لیتا ہوں اور چمچا اُس کے ہاتھ میں رہ جاتا ہے۔ شرم کی سُرخی سے اُس کا چہرہ گلاب کا پھول بن جاتا ہے۔

"ذرا وہ چمچہ دیجئے" میں سنجیدہ منھ بنا کر اُس سے کہتا ہوں۔

وہ ایک دلفریب ادا کے ساتھ چمچہ میری جانب بڑھا دیتی ہے۔

"آپ نے یہ نہیں لیا" ڈاکٹر صاحب ایک مخصوص کھانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہتے ہیں "یہ زینت کا تیار کیا ہوا ہے۔ اِن کے سوا ہمارے ہاں اس چیز کو اور کوئی نہیں پکا سکتا"۔

"اچھا! بہت خوب"! میں جواب دیتا ہوں "تو اِن کو وقت مل جاتا ہے ان کاموں کے لیے بھی"؟

"ہاں ہاں کیوں نہیں"! ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں، "لکھنے پڑھنے سے جو وقت بچتا ہے وہ انھیں کاموں میں

صرف ہوتا ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں وکیل صاحب! جو اپنی لڑکیوں کو گھر کے کام کاج سے بالکل بے بہرہ رکھتے ہیں۔ لطف تو یہی ہے کہ لڑکی تعلیم بھی حاصل کرے اور گھر کے کام میں بھی ماہر ہو۔ اب یہ زینت ہیں! ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتی ہیں اور کھانے پکانے، سینے پرونے میں بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کی بیگم اپنے شوہر کی بات کاٹ دیتی ہیں، اور زینت کے خانگی کمالات پر روشنی ڈالنے لگتی ہیں۔ نعیم صاحب حتی الامکان اُن کی مدد کرتے ہیں۔ جب یہ دونوں بول چکتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب دوبارہ اپنے خیالات کا اظہار شروع کرتے ہیں۔ غرضکہ زینت کی خوبیوں کا بیان مسلسل جاری رہتا ہے۔

میں سب کچھ سنتا ہوں اور تحسین آمیز نظروں سے بار بار زینت کو دیکھتا ہوں۔ اُس کی صندلی پیکر کا حسن میری نظروں میں کھبا جا رہا ہے۔

"اچھا بتاؤ تم نے آپا سے وہ بات کہہ دی تھی؟" میں شوکت سے سوال کرتا ہوں۔

وہ مسکراتی ہے اور سر کی جنبش سے اثبات میں جواب دیتی ہے۔

"کیا کہا تھا؟"

وہ خاموش رہتی ہے اور شرما کر سر جھکا لیتی ہے۔ میں ایک ہاتھ اُس کے شانہ پر رکھتا ہوں اور دوسرے ہاتھ سے ٹھوڑی پکڑ کر اُس کا چہرہ اوپر اٹھاتا ہوں۔

"کیوں بتاؤ شوکت! کیا کہا تھا تم نے اپنی آپا سے؟"

"ہم نے کہا تھا ——" وہ پھر شرما کر رہ جاتی ہے۔

"ہاں کیا کہا تھا؟"

"ہم نے کہا تھا کہ وکیل صاحب نے کہا ہے کہ ہم تمہیں پڑھانے آیا کریں۔"

"تم نے کہا تھا یہی؟" میں شوق بھرے لہجے میں اس سے پوچھتا ہوں۔

"ہاں۔" وہ جواب دیتی ہے۔

"سچ کہتی ہو؟"

"ہاں۔" وہ پھر جواب دیتی ہے۔

"اچھا پھر کیا کہا تمہاری آپا نے یہ سن کر؟"

"کچھ نہیں۔"

"کچھ تو کہا ہی ہوگا؟"

"کچھ بھی نہیں کہا۔"

"تو اس کے معنی ہیں کہ تم نے ہماری بات کہی ہی نہیں اپنی آپا سے۔"

"کہی تو تھی۔" وہ قدرے برہم ہو کر جواب دیتی ہے۔

میں فرطِ خوشی سے اُس کو گود میں اٹھا لیتا ہوں اور اُس کی پیشانی چومتا ہوں۔

برسات کے موسم کی ایک شام ہے، اور میری ازدواجی زندگی کی صبح!

ہم دونوں —— میں اور زینت —— زندگی کی ایک نئی شاہراہ پر گامزن ہو رہے ہیں۔ ہمارے سفر کی ابتدا ریل کے سفر سے ہوتی ہے ہم اپنا ماہِ عسل گزارنے کے لئے پہاڑ پر جا رہے ہیں۔

انجن سیٹی دیتا ہے گاڑی چھوٹتی ہے اور آن کی آن میں اسٹیشن سے نکل جاتی ہے [illegible] الوداع کہنے والے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

ریل کا ڈبہ ہے۔ زینت ہے اور میں ہوں!

اس وقت میری ساری زندگی سمٹ کر زینت میں مرکوز ہو گئی ہے۔ میں اس کے برابر بیٹھ جاتا ہوں، اور اس کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ باتوں کا سلسلہ شروع کرتا ہوں جو سفر کے آخر تک قائم رہتا ہے

ہم نینی تال کی سرد اور پرسکون بلندیوں پر مقیم ہیں۔ مجھے یہ اطلاع ملتی ہے کہ میرا پرانا دوست اور کالج کا ساتھی زبیر بھی آجکل یہیں ہے۔ میں اس سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کرتا ہوں۔

ایک دن فون پر اس سے گفتگو ہوتی ہے۔ وہ نینی تال میں میری موجودگی کی خبر سنکر خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے، "مجھ سے فوراً آکر ملو، یا اپنا پتہ بتاؤ کہ میں آسکوں"

میں جواب دیتا ہوں "نہیں میں خود تم سے آج سہ پہر کو ملوں گا اور تمھارے ساتھ چائے پیونگا۔ اور ہاں۔ ایک بات اور ہے، میری بیوی بھی میرے ساتھ ہوں گی"۔

"اچھا"! زبیر چلا اٹھتا ہے "تو کب سے؟ گویا چپ چاپ شادی کرلی اور ہمیں خبر بھی نہ کی"

"اب یہ سب باتیں ملاقات کے وقت ہونگی" میں جواب دیتا ہوں۔

"اچھی بات ہے۔ تو آج چار بجے آؤ۔ میں انتظار کروں گا"

سہ پہر کے قریب ہم زبیر سے ملنے کے لئے روانہ ہوتے ہیں

میں دل ہی دل میں یہ سوچکر خوش ہو رہا ہوں کہ زبیر میری [illegible] مرعوب ہوگا۔ وہ تو شاید یہ سمجھ رہا ہوگا کہ اسکی بیوی ہوگی۔ کوئی برقع میں لپٹی لپٹائی عورت جو ایک گٹھری کی طرح لڑھکتی پھڑکتی، میری طرف دیکھے بغیر گھر میں گھس جائیگی اور بیگم صاحبہ کے پاس جا بیٹھے گی۔ مگر بچا کے ہوش ٹھکانے آجائینگے جب وہ دیکھیں گے کہ یہ تو ایک تعلیم یافتہ عورت ہے بیسویں صدی کی ایک مہذب خاتون!

ہم زبیر کے مکان پر پہنچتے ہیں۔ وہ زینت کو دیکھکر واقعی گھبرا سا جاتا ہے۔ یقیناً وہ ایسی ملاقات کے لئے تیار نہ تھا۔

"میری شریک حیات زینت"! میں زبیر سے اپنی بیوی کا تعارف کراتا ہوں۔

وہ بدحواس ہو جاتا ہے۔ میں اس کی سراسیمگی سے بے انتہا لطف حاصل کرتا ہوں۔

بلا سے وہ اپنے آپکو سنبھالتا ہے، اور دو چار لفظوں میں اپنی مسرت کا رسمی اظہار کرتا ہے۔ اسکے بعد ہم اسکے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہیں اور بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرنے لگتے ہیں۔

یہ وہ خواب ہیں جو میں شب و روز دیکھا کرتا ہوں

جی ہاں، یہ سب خواب ہیں۔

اور حقیقت؟

حقیقت صرف اسقدر ہے کہ میں نے زینت کو۔ یعنی اس لڑکی کو جسکا نام میں نے زینت رکھدیا ہے ۔۔۔ دو تین مرتبہ موٹر سے اترتے یا موٹر پر سوار ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ آہ! جوانی کی خود فریبیاں اور محبت کی فریبکاریاں!

فردوسِ محبت

نذیر احمد — نذیر

خیالِ محبت میں کچھ غم نہیں ہے
جو سب کا ہے وہ میرا عالم نہیں ہے
مرے دل کی دنیا میں ماتم نہیں ہے
مرا غم مسرت سے کچھ کم نہیں ہے
محبت ہے جنت جہنم نہیں ہے

وہ الفت کہ جس میں ہے رونا جفا کا
جہاں زندگی ہے فسانہ ریا کا
جہاں کوئی پرساں نہیں ہے وفا کا
وہ رشتہ محبت کا محکم نہیں ہے
محبت ہے جنت جہنم نہیں ہے

مرے آنسوؤں میں ہے اُن کا تبسم
نگاہوں میں رقصاں ہیں مہتاب و انجم
یہ شیریں بیانی - یہ رنگیں تکلم
یہاں دکھ نہیں ہے. یہاں غم نہیں ہے
محبت ہے جنت جہنم نہیں ہے

نرالا ہے عالم مری چشمِ تر کا
مجھے دل کا رونا نہ رونا جگر کا
کرم چاہتا ہوں بس اُن کی نظر کا
مرا زخم محتاج مرہم نہیں ہے
محبت ہے جنت جہنم نہیں ہے

تصور میں راتوں کو آتا ہے کوئی
بصد ناز یوں مسکراتا ہے کوئی
کہ ہر اک غم بھول جاتا ہے کوئی
یہاں آرزوؤں کا ماتم نہیں ہے
محبت ہے جنت جہنم نہیں ہے

نہیں کرتے شکوہ محبت کے بندے
ذرا شکر بھی او شکایت کے بندے
یہی کہتے آئے ہیں الفت کے بندے
نہیں ہے ارے ابنِ آدم نہیں ہے
محبت ہے جنت جہنم نہیں ہے

لیان ٹراٹسکی!

حبیب الرحمٰن بی۔اے

۲۲ر اگست ۱۹۴۰ء کو میکسیکو سے یہ خبر آئی ہے کہ ٹراٹسکی پر ایک یہودی نے ہتھوڑے سے حملہ کیا۔ زخم اس قدر کاری لگا کہ وہ اس سے جانبر نہ ہو سکا۔ اور چند گھنٹوں میں اُس کا خاتمہ ہو گیا۔ ٹراٹسکی کی موت انقلابی دنیا میں ایک ایسے دلچسپ اور رنگین باب کا خاتمہ ہے۔ جس کی شاید کوئی اور مثال نہ مل سکے۔

ٹراٹسکی ۱۸۷۹ء میں روس کے صوبہ اوڈیسا میں پیدا ہوا اُس کے والدین متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور مذہباً یہودی تھے۔ اُس کا اصلی نام برانسٹیں تھا۔ اُس کی تعلیم اوڈیسا کے اسکول اور یونیورسٹی ہی میں ہوئی۔ وہ بچپن ہی سے انتہائی منچلا اور ذہین واقع ہوا تھا۔ اسکول اور یونیورسٹی میں باوجود ایک اچھے طالب علم ہونے کے پروفیسروں سے اُس کی کبھی نہیں بنی۔ ابھی اُس کی تعلیم ختم نہ ہوئی تھی کہ روس میں بے چینی پھیلنا شروع ہو گئی۔ عوام زار روس اور عیاش نوابوں کے ظلم سے تنگ آ چکے تھے اور ایسی ظالم حکومت سے کسی نہ کسی طرح نجات حاصل کرنا چاہتے تھے ٹراٹسکی اِن حالات سے بہت متاثر ہوا اور اُس نے حکومت کے خلاف سازشوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۹۸ء میں جب کہ اُس کی عمر ۱۹ سال کی تھی وہ سائبیریا جلا وطن کر دیا گیا۔ مگر ٹراٹسکی بے چین فطرت نے اُسے نچلا نہ بیٹھنے دیا۔ چنانچہ چار سال کی جلا وطنی کے بعد ۱۹۰۲ء میں وہ سائبیریا سے بھاگ نکلا۔ اور ٹراٹسکی کے جعلی نام سے وہ انگلینڈ پہنچا۔ انگلستان میں پہلی مرتبہ وہ مشہور انقلابی لیڈر لینن سے ملا۔ اور اس کے ساتھ اِسکرا (چنگاری) نامی انقلابی اخبار میں کام کرتا رہا۔ اس زمانہ میں ٹراٹسکی کو یورپ کے بیشتر انقلابیوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ اُس نے اپنی حسن قابلیت سے اِن تمام لوگوں پر اپنی ذہانت و ذکاوت کا سکہ بٹھا دیا ۱۹۰۵ء میں وہ روس پھر واپس آیا۔ اس وقت روس میں انقلابی تحریک کافی طور پر نمایاں ہو چکی تھی ٹراٹسکی سینٹ پیٹرزبرگ میں مزدوروں کی مجلس کا صدر منتخب ہوا۔ اُس وقت تک ٹراٹسکی بالشویک پارٹی کے ساتھ نہ تھا۔ لیکن اُس کی ہمدردی بالشویک پارٹی سے زیادہ تھی۔ ۱۹۰۵ء کا انقلاب ناکامیاب رہا۔ ٹراٹسکی معہ کمیٹی کے گرفتار کر لیا گیا۔ اور دوسری مرتبہ سائبیریا بھیج دیا گیا۔ وہاں سے پھر ایک مرتبہ بھاگ کر

وہ ویانا پہنچا۔ وہاں پراودا (جو آجکل روس میں کمیونسٹ پارٹی کا اخبار ہے) اور دوسرے انقلابی اخباروں میں ایڈیٹر یا نامہ نگار کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ ۱۹۱۲ء میں وہ نامہ نگار کے طور پر قسطنطنیہ گیا اور ۱۹۱۴ء میں وہ زیورچ اور پیرس کے مختلف انقلابی اخباروں کے لیے کام کرتا رہا۔ اسی زمانہ میں اس نے جنگ عظیم پر جرمن زبان میں ایک کتاب لکھی جس پر حکومت جرمنی نے اسے آٹھ ماہ کی سزا دے دی۔ سزا بھگتنے کے بعد وہ فرانس پہنچا۔ اور وہاں بھی جنگ کی مخالفت شروع کردی جس کی وجہ سے وہ فرانس سے نکالا گیا۔ اب وہ بلا پاسپورٹ اسپین پہنچا وہاں کی گورنمنٹ نے اسے گرفتار کر لیا مگر اس کی درخواست پر اسکو امریکہ جانے کی اجازت دے دی گئی۔ امریکہ میں بھی اس نے اپنا انقلابی پروپیگنڈا جاری رکھا۔ مارچ ۱۹۱۷ء میں جب کہ تمام روس انقلابی شعلوں سے بھڑک رہا تھا۔ ٹراٹسکی امریکہ سے روس کے لیے روانہ ہوا۔ مگر انگلینڈ میں گرفتار کر لیا گیا۔ اور روسی گورنمنٹ کی کافی کوششوں کے بعد اس کو رہائی ملی۔ وہ روس پہنچا اور انقلابی تحریک میں کافی زور و شور کے ساتھ حصہ لیتا رہا۔ مگر ابھی تک وہ بالشویک پارٹی کا ممبر نہ تھا۔ جولائی ۱۹۱۷ء میں وہ بالشویک پارٹی میں شامل ہوا۔ اور نہایت ہی سرگرمی کے ساتھ پارٹی کے نظام و قیام اور انقلابی تحریک میں حصہ لیتا رہا۔ سوویٹ گورنمنٹ قائم ہونے کے بعد وہ وزیر خارجہ مقرر کیا گیا۔ مگر اس کی پالیسی جرمنی سے معاہدہ برسٹ لیٹوسک کے موقع پر ناکامیاب ثابت ہوئی۔ اس لیے وہ وہاں سے ہٹا کر وزیر جنگ مقرر کیا گیا۔ اس نے اپنے زمانہ وزارت میں باوجود مخالفت نہایت قابلیت کے ساتھ سرخ افواج کو منظم کیا۔ پھر ریلوے لائن کو کافی ترقی دی۔ تاکہ افواج کو منتقل کرنے میں دقت نہ ہو۔

لینن کی زندگی میں ۱۹۲۴ء تک ٹراٹسکی سوویٹ روس کے لیے نہایت انہماک سے کام کرتا رہا۔ اس کی عالی دماغی۔ تدبر اور علمی قابلیت کی دھاک صرف روس ہی نہیں بلکہ تمام یورپ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر ۱۹۲۴ء میں لینن کی موت کے بعد ٹراٹسکی اور اسٹالن میں برسر اقتدار ہونے کی کشمکش شروع ہو گئی۔ پہلے کچھ اصولی اختلافات ضرور تھے مگر ٹراٹسکی کو جب اپنی تنہا پسندی اور غرور کی وجہ سے شکست ہوئی۔ تو اس نے کمیونسٹ پارٹی کے خلاف سازشیں شروع کردیں۔ اور اب وہ ہر بات کی مخالفت کرنے لگا۔ ۱۹۲۷ء میں اس کو کمیونسٹ پارٹی سے نکال دیا گیا مگر اس کی ریشہ دوانیاں بڑھتی ہی گئیں۔ ۱۹۲۸ء میں اسے ورنی اور وہاں سے ۱۹۲۹ء میں قسطنطنیہ جلاوطن کر دیا گیا۔ وہ تیسری بار جلاوطن کیا جا رہا تھا۔ مگر اس مرتبہ اسے وہ حکومت بن باس دے رہی تھی جس کو اس نے خود مضبوط بنایا تھا۔ ترکی حکومت نے اسے قسطنطنیہ میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی۔ یورپ بھر میں سوائے ناروے کے اور کسی ملک۔

ایسی خطرناک ہستی کو پناہ دینا منظور نہ کیا۔ مگر ناروے میں بھی وہ زیادہ عرصہ تک نہ رہ سکا۔ اور سوویٹ گورنمنٹ کی درخواست پر وہ ناروے سے نکالا گیا۔ اس مرتبہ اُسے میکسیکو نے پناہ دی۔ جہاں وہ اپنی عمر کے آخری لمحوں تک رہا۔ اور اپنی عمر کا آخری حصہ اُس انقلاب اور سوویٹ روس کو کمزور بنانے میں صرف کیا۔ جس کو اُس نے خود اپنی زندگی کا بڑا حصہ صرف کر کے طاقتور بنایا تھا۔ اُس نے تیسری انٹرنیشنل کے خلاف چوتھی انٹرنیشنل قائم کی۔ اور اُس کے ذریعہ سے اپنے خیالات کا پروپیگنڈا کرتا رہا۔ اُس کی تصانیف اُسکی قابلیت اور ذہانت کا نمونہ ہیں۔ ٹراٹسکی کی زندگی پر کئی حملے کئے گئے۔ جس کا نتیجہ۔ اس آخری حملہ کی شکل میں اُس کی موت ہوئی۔

بزمِ خیال

فضل الرحمٰن ندوی

ساقیٔ دلنواز دیکھ ابر بھی ہے بہار بھی ۔۔۔ فکر نہ کر پلائے جا چھوڑ مآلِ کار بھی
جب بھی ہوں بزمِ عیش بھی دل بھی ہے حسنِ یار بھی ۔۔۔ حاصلِ دید ہے مرا عالمِ انتظار بھی
دل کی تڑپ کے ساتھ ساتھ لذت خوشگوار بھی ۔۔۔ تیرا خیال جاں نواز مُم تبی ہے غمگسار بھی
لالہ و یاسمن کھلے پھول کھلے چمن سے کھلے ۔۔۔ دل کی کلی نہ کھل سکی بیت گئی بہار بھی
میرے خدایہ آج پھر چھیڑا ہے کس نے سازِ غم ۔۔۔ روح بھی ہے بھرا اُٹھی ہل گئے دل کے تار بھی

داستانِ زندگی!

نیرہ خاتون

گم ہوا ہے اس طرح کچھ کاروانِ زندگی ۔۔۔ مر کے ہی شاید ملے اب تو نشانِ زندگی
کسقدر پر لطف تھی شرحِ بیانِ زندگی ۔۔۔ سو گیا خود سننے والا داستانِ زندگی
سجدۂ دیر و حرم سے مجھکو نسبت ہی نہیں ۔۔۔ خود مرا نقشِ جبیں ہے آستانِ زندگی
ذوقِ پژمردہ کی یہ جدت طرازی دیکھنا ۔۔۔ کر دیا شاداب غم سے گلستانِ زندگی

چھا گئی ہیں موت کی نیندیں فضائے دہر پر
نیرہ اب کیا کہوں میں داستانِ زندگی

تشنۂ محبت

شفیق بانو

میں تو اسے جانتی تھی اس وقت سے جبکہ وہ کالج میں [illegible] کا پہلا سال پورا کر رہی تھی گو کوئی [illegible] ہوئے تھے لیکن اس کی خود فراموش فطرت کو میں کبھی نہ بھول سکی [illegible] اس کی بخشش لئے والیوں سے محبت [illegible] وہ عجیب طبیعت کی لڑکی تھی [illegible] میں ہر وقت کھوئی رہتی ہے اور [illegible] تو کچھ ایسا جنون [illegible] مطالعہ کرانے تو اس میں [illegible] رہتی ـــ مجھے یہ معلوم کر کے بہت دکھ ہوا [illegible] کہ اس کا اب آخری سال ہے اور [illegible] جب وہ اپنے وطن واپس چلی جائیگی اس [illegible] میں اب اس کے پاس روزانہ جانے لگی کبھی تو صبح ہی صبح سات بجتے ہی جا پہونچتی اور "شمی کیا میں آ سکتی ہوں" کہتی ہوئی کمرے کے اندر داخل ہو جاتی۔ [illegible] آرام کرسی پر لیٹی کتابیں پڑھتی ہوئی ملتی اور سامنے میز پر چار کتابیں ہوتیں [illegible] اور کبھی "شمی! میں ابھی پی کر آئی ہوں" لیکن اس کے اصرار سے مجبور ہو جاتی ـــ عجیب عادت تھی کسی چیز کو ہاتھ لگا کر کہو کہ یہ پسند ہے فوراً مصر ہو جاتی۔ زبردستی سر مڑھ دیتی ـــ کھانے کی۔ پہننے کی۔ نمائش کی روپیہ پیسہ غرض کسی چیز کے دینے میں اُسے عار نہ تھا خود ایسا لباس پہنتی کہ میں اکثر مذاق سے کہتی "ایم اے کی اسٹوڈنٹ ہو کر ذرا کپڑے تو ڈھنگ کے پہن لیا کرو۔ لیکن وہ ہنس کر ٹال دیتی "کیا ہوا میرے کپڑوں کو اچھے خاصے تو ہیں"

"ہوں ذرا دیکھو تو آٹھ دس آنے کی چپل ـــ ایک پانچ روپے کی ساڑی۔ کھدر کا بلاؤز۔ موٹے کپڑے کا پیٹی کوٹ ـــ بھلا یہ تمہارے قابل کپڑے ہیں؟"

"کھدر تو آجکل عزت کا لباس ہے چپل بھی آرام دہ ہیں" میں جب بحث کرتے کرتے تھک جاتی تو خود ہی خاموش ہو جاتی۔

ایک دن شام کو دل گھبرایا ـــ سیدھی اس کے کمرے میں جا پہونچی میرے اور اس کے کمرے میں تین کمروں کا فرق تھا۔ ہوسٹل میں کل دو سو کمرے تھے اور وہاں سے کوئی دو فرلانگ پر کالج تھا ـــ اپنی عادت کے مطابق وہ لیٹی کتاب پڑھ رہی تھی ـــ میں نے شانے ہلاتے ہوئے کہا "شمی جب دیکھو کتاب ـــ کیا مصیبت ہے ہاں کسی وقت تو تفریح بھی کرنی چاہئے ہر وقت دماغ تھکانے سے کیا حاصل ـــ"

"میری کہیں آنے جانے کو طبیعت نہیں چاہتی کیا کروں"

دیکھوں طبیعت کو کیا ہوا؟ اگر یہی حالت رہی تو تمھیں آگرہ بھیجنا پڑے گا۔"

"اچھا ہی ہوگا۔ میں پاگلوں کو اور پاگل بنا ڈالونگی۔ تم آئیں اور چیخنا شروع کردیا۔ اچھا یہ بتاؤ جائیں کہاں؟ — یہاں ہوسٹل کے کمروں میں جھانکنے کی مجھے عادت نہیں — بہت جی گھبرایا تو تمھارے کمرے تک چلی آتی ہوں"

میں نے اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ تو آنکھیں ایسی معلوم ہوئیں جیسے کہ ابھی آنسو خشک کئے ہیں۔ رونے سے آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں میں نے کہا "ہیں شمی! کیا تم روئیں تھیں"؟

"نہیں تو — جب پڑھتے پڑھتے میری آنکھیں تھک جاتی ہیں تو دوا ڈال لیتی ہوں اسی لیے آنکھیں سُرخ ہونگی شاید"

میں ایک ٹھنڈا سانس لیکر خاموش ہوگئی۔ وہ بات ٹالنا چاہتی تھی آنکھوں سے مایوسیوں کی جھلک صاف نمایاں تھی۔ میٹرن کا سخت حکم تھا کہ کوئی ایک دوسرے کے کمروں میں دس بجے کے بعد نہ جائے اور نہ لائٹ ہو۔ لیکن شمی اسکی پابندی نہ کرتی اور اکثر یا تو مجھے بُلا کر لیجاتی یا خود آجاتی — کبھی کبھی وہ میرے بستر پر ہی سو جاتی — رات بھر میرا لحاف اپنی طرف گھسیٹتی رہتی اور سوتے میں بلی کی طرح نرم نرم ہاتھ میرے بالوں پر — میری گردن پر — اور میری آنکھوں پر رکھدیتی — میں مذاق کرتے ہوئے کہتی، "شمی! اگر میں مرد ہوتی تو تمھارے ساتھ شادی کرتی"، "وہ ہنستے ہوئے کہتی "چھی رام رام میں تو آپ سے کبھی نہ کرتی — آپ بڑی گندی ہیں گوشت کھاتی ہیں" میں ہنسنے لگتی "شمی تم روز دیکھتی ہو میں صرف ترکاریاں کھاتی ہوں"

"میں گوشت نہیں کھاتی — میری سب ملنے والیوں سے پوچھ لو۔"

ہوسٹل کی ایک لڑکی نے کہا "شمی لامذہب ہے اور خدا تک کو بُرا کہتی ہے آپ اُس سے نہ بولا کیجئے" میں نے کہا "میرے سامنے تو کبھی اُس نے ایسا نہیں کہا"!

اس لڑکی نے مجھے یقین دلانے کے لیے شمی سے مذہبی باتیں شروع کردیں۔ شمی نے جھنجھلا کر اُلٹے سیدھے جواب دیے جو منہ میں آیا بک گئی۔ میں نے دونوں کو سمجھایا۔ شمی کو چپ کیا "شمی کیا واہیات بات ہے۔ مذہب کو بُرا نہیں کہتے۔"

"تو آخر مجھ سے یہ ہمیشہ کیوں مذہب! مذہب! کرتی رہتی ہیں"!

آج میں نے دیکھا کہ شمی کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں — میں نے بالوں پر ہاتھ پیار سے پھیرتے ہوئے "شمی" کہا اُس نے ہاتھ ہٹا دیے۔ دیکھا تو آنسو رخساروں سے ڈھلک کر اُس کے دامن کو تر کر رہے ہیں۔

"ہائیں شمی! یہ کیا؟ تم رو رہی ہو"

"مجھے رونے دو — میرا دل گھبرا رہا ہے"!

"میں تو تمھیں رونے نہ دوں گی"۔

"آپ مجھ سے [illegible] پوچھئے"

بہت [illegible] وہ جھلیاں لیتی ہوئی شکایت کرنے لگی

"ہوسٹل کی بعض لڑکیوں سے میں بالکل تنگ [illegible] رہتی ہوں لیکن وہ مجھ سے بھی بہت چھیڑتی رہتی ہیں [illegible] کتنی [illegible] اور بے اعتبار ہو گیا۔ برسوں سے میں [illegible] کو بالکل بھول گئی — [illegible] ہاں الحمد [illegible] تو ہے [illegible] نہیں [illegible] میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے میں [illegible] اللہ [illegible] مجھ سے کیوں چھین [illegible] اس نے رخساروں کے آنسو پونچھے اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ "بچپن میں مجھے ماں کا پیار بھی نہیں ملا۔ [illegible] ماں اور [illegible] میں [illegible] تھیں اس لئے کبھی مجھے خوشی نہیں ہوئی۔ میں خود ہی [illegible] کر ماں سے لپٹ کر پیار کرتی وہ جھڑک دیتیں کہ بہت کام کرنے ہے۔ ذرا بڑی ہوئی کہ مر گئیں۔ باپ ہمیشہ باہر رہتے تھے انھوں نے مجھے اٹھا کر بورڈنگ میں پھینک دیا جہاں محبت کا ذکر ہی فضول ہے ایک لڑکی تھی میری سہیلی خورشید وہ بھی شادی کے بعد اپنے گھر چلی گئی اور اب خط تک نہیں لکھتی لیکن میں اپنے دل سے مجبور ہوں جب جی گھبراتا ہے تو اس کی تصویر دیکھ کر دو آنسو گرا دیتی ہوں۔ چھٹیوں میں جب گھر جاتی ہوں تو باپ اجنبی کی طرح مزاج پوچھ لیتے ہیں۔ میں ان میں بھی محبت نہیں پاتی۔ خرچ البتہ بھیج دیتے ہیں اور لڑکیوں کے ماں باپ ان سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ میرے باپ کے پاس جتنے پیغام شادی کے خط آئے ان سب میں کسی نے میری تعلیم کا خیال نہ کیا۔ سب میری صورت پر [illegible] گئے۔ انھیں میری طبیعت سے زیادہ پتا کی دولت کی کھوج ہے۔ لیکن میں نہیں چاہتی کہ روپیہ کی لالچ میں کوئی مجھ سے شادی کرے۔ مجھے اپنی تعلیم کا گھمنڈ نہیں بلکہ افسوس ہے کہ تعلیم سے احساس میں زیادتی ہو گئی — چھوٹے [illegible] میں وہ صرف مجھ سے فرمائش کرنا جانتے ہیں۔ کبھی سوچتی ہوں اگر چھوٹی بہن ہوتی تو شاید محبت کر سکتی — میں اپنی بہلنے والی بہن سے پوچھتی ہوں کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ لیکن دل کو یقین نہیں آتا۔ سب مجھے دھوکا دیتی ہیں۔ کہنے کو کہہ دیتی ہیں کہ ہاں ہم محبت کرتے ہیں لیکن [illegible] سے کیسے پریم ہو سکتا ہے اب تو من میں کسی کی بات نہیں بھاتی۔ اب رونا اور پڑھنا یہی دو کام میرے لئے رہ گئے ہیں۔" سلمیٰ کی آنکھوں میں [illegible] آنسو بھر آئے تھے میری طرف آنکھیں اٹھائیں اور کہا "کیا آپ بھی مجھے دھوکا دے رہی ہیں۔ کیا آپ بھی مجھ سے ایسی ہی باتیں کرتی ہیں جیسی کہ دنیا کی اور ہستیاں؟ میں حسین نہ سہی لیکن میرا دل حسن آفریں ہے — اچھا! تم بھی مجھے ستا لو۔ دھوکے میں رکھو مجھے تم سے کوئی شکایت نہ ہوگی" یہ کہتے کہتے وہ رو پڑی اور میرے ہاتھوں پر سر رکھ دیا میں اس کے دلی جذبات سے متاثر ہو کر تڑپ گئی اور بے اختیار گلے میں ہاتھ ڈال دیے "میری سلمیٰ میں تمھیں دھوکا

نہیں دے رہی ـــــ میرے دل میں واقعی تمہاری محبت ہے۔ مجھے تمہاری صورت کی ضرورت نہیں میں تمہاری سیرت کی شیفتہ ہوں ـــ خدا نے چاہا تو تمہاری شادی کسی اچھے آدمی سے ہوگی یہ میری دعا ہے ـــ شمی بچوں کی طرح میرے شانوں پر سر رکھے دیر تک ہچکیاں لیتی رہی ـــ

کتنی معصوم ـــ محبت کرنے والی ہے میری شمی!!

لوگ کہتے ہیں مصیبت کا بدلہ ملتا ہے۔ صبر کا پھل ملتا ہے لیکن میں، شاید اس عقیدہ کی قائل نہیں رہی۔

شمی کی شادی ہوئی۔ خط آیا۔ گر میں اپنی زندگی کی الجھنوں میں کچھ اس طرح گرفتار رہی کہ باوجود کوشش کے اُسے دیکھنے نہ جا سکی ایک سال بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ مجھے تار کے ذریعہ اُس کی علالت کی خبر ملی ـــ جلدی جلدی میں نے اپنا سامان سفر درست کیا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اُس کے گھر پہونچی۔

اُس کی طبیعت خراب تھی میں دیکھکر حیران رہ گئی کہ اتنی جلدی اُس کی یہ حالت کیونکر ہو گئی ـــ وہ مجھے دیکھکر مسکرائی ـــ اُس کی فسردہ نگاہوں میں زندگی کی آس دم توڑتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

بیماری میں بھی فوراً چار کا تقاضا ہوا۔ چاء پینے کے بعد میں اُس کی تیمارداری میں مصروف ہو گئی ـــ اُسے کھانسی آنے لگی۔ شوہر کہیں تیار ہوکر جا رہے تھے بولی "دیکھئے وہ کھانسی کی دوا لیتے آیئے گا"

"ہاں اگر ڈاکٹر کی دکان کی طرف گیا تب ـــ اس وقت تو میں دوسرے کاموں سے جا رہا ہوں"

شمی کی سانس سینے میں گھٹ کر رہ گئی ـــ شوہر چلا گیا تو مجھ سے مخاطب ہوکر بولی، دیکھا تم نے میری زندگی۔ اب بھلا دنیا میں اور کہاں محبت کی بھیک مانگنے جاؤں جس پر سہارا تھا۔ اس کی بے رخی کا یہ حال ہے ـــ اور آج کیا شروع دن سے ـــ اب تک شاید تمہیں دیکھنے کے لئے میں زندہ تھی ـــ یہ کمرہ ہے اور میں ہوں۔ جب تک اچھی تھی تو خیر کسی وقت ہنس بول بھی لیتے تھے اور اب تو میرے سایہ سے بھی بچتے ہیں۔ الگ کمرے میں سوتے ہیں۔ کیونکہ میری ہائے ہائے سے آنکھ کھل جاتی ہے

میری زندگی آس پر قائم تھی ـــ اب ختم ہوگئی۔ دنیا میں اچھا دل لیکر آئی تھی پر کسی نے سمجھا نہیں ـــ محبت مانگتی رہی۔ اور محبت مجھے کسی قیمت پر بھی نہ مل سکی میں اپنا بنانے کی آرزو میں مٹی میں مل گئی لیکن کسی نے مجھے اپنا نہ کہا!!

شاید دنیا کی یہی ریت ہو۔ یہی فلسفہ ہو کہ برباد کو برباد کیا جائے ـــ کم سخن کو کچلا جائے۔ بے بس کو تاراج کیا جائے۔

میری آشا ختم ہو چکی۔ اب میں بھی ختم ہو رہی ہوں۔

مجھے اسکی ساری زندگی معصومیت کی ایک دردناک داستان معلوم ہوتی تھی اسکی باتیں بالکل بچوں کی سی تھیں تمام عمر وہ دنیا کو محبت کا ایک کھلونا سمجھتی رہی۔ لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ یہاں ہر ہر قدم پہ دل پامال کئے جاتے ہیں ـــ اُس وقت جبکہ وہ بستر غم پر پڑی ہوئی دم توڑ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے فریب کے پردے اُٹھ چکے تھے ـــ اور میں اس کی طرف اس بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے قیدی پرند قفس کی تیلیوں کو ـــ !!

آرٹ اور فلم

عادل رشید میوتی ایڈیٹر شاہد ویکلی - بمبئی

آرٹ اس قدر دلکش اور عام فہم لفظ معلوم ہوتا ہے۔ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی اپنی دانست میں آرٹ کے معنی اچھی طرح سمجھتا اور جانتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر اس چیز کو جو اسے اچھی معلوم ہو آرٹ کا خطاب دے دیتا ہے۔

"یہ تصویر مجسم آرٹ ہے"۔ "فلاں فلم فن آرٹ کی زندہ تصویر ہے"۔ "یہ منظر آرٹ کا آئینہ ہے" وغیرہ۔ اسی طرح کے مختلف نعرے مختلف جگہ مختلف موقع اور محل پر استعمال کئے جاتے ہیں۔

ہمارے بزرگ، ایسے حضرات جو پرانی وضع قطع کے پیرو اور نئی تہذیب و تمدن کے سخت خلاف ہیں اور ہمارے وہ بزرگ بھی جو باوجود اس نئی تہذیب کے مخالف ہونے کے اس سے وقتاً فوقتاً استفادہ حاصل کرنے اور اس سے لطف اندوز ہونے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی نیم عریاں تصویر کو دیکھکر بیساختہ چیخ اٹھتے ہیں "لعنت ہو اس تصویر پر، لاحول ولا قوۃ"، "یہ ہے آجکل کے نوجوانوں کا آرٹ، اسے آرٹ کہتے ہیں۔ یہ عریاں تصویر آرٹ ہے واہ! خوب! یہ بیسویں صدی ہے مجالی خدا جو نہ دکھائے تھوڑا ہے" وغیرہ وغیرہ۔

کاش وہ آرٹ کے صحیح مفہوم کو سمجھے ہوتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ حقیقتاً نیم عریاں تصاویر نیم آرٹ اور بالکل عریاں تصاویر مکمل آرٹ ہوتی ہیں۔ خواہ وہ تہذیب نیز شرم و حیا سے بغاوت ہی کیوں نہ کرتی ہوں حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ ہو چھپائی نہیں جا سکتی۔

کوئی صاحب جو نئی تہذیب و تمدن کے دلدادہ ہیں تم بمبئی کے سو فیصدی واحد ذمہ دار، کوٹ پتلون ہیٹ اور ٹائی کے عادی اسپینان جہاں کے والا اور شیدائی، لپ اسٹک، پاؤڈر اور گیسو بریدہ کے سچے قدردان سچے حامی، اکثر فلم میں بڑے بڑے سٹنگز دیکھکر سنیما حال ہی میں چیخ اٹھتے ہیں What an art مارولس Marvellous سنیما حال سے باہر نکلکر وہ ہر شخص سے محض اپنی قابلیت کا لوہا منوانے کے لئے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ "بھئی واہ کیا آرٹ پیش کیا گیا ہے فلاں تصویر میں"، "یہ فلم تو آرٹ کا مکمل نمونہ ہے اگر آرٹ کا مکمل نمونہ دیکھنا ہو تو یہ فلم ضرور دیکھو"

غرضیکہ آجکل کا ہر فرد آرٹ کا والہ اور شیدائی ہے اپنی دانست میں، اپنے وہم و خیال میں ہر فرد آرٹ کا سو فیصدی ماہر اور اس کے معنی و مفہوم کا صحیح جاننے اور پرکھنے والا ہے۔

مگر کیا آرٹ کے شیدائیوں میں سبھی اس آرٹ کو اچھی طرح سمجھتے اور جانتے ہیں؟ ایسا ہرگز نہیں ہے یہ ایک تلخ حقیقت ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ ان آرٹ! آرٹ!! کے چیخنے والوں میں تقریباً نوے فیصدی ایسے افراد ہیں جو آرٹ کا صحیح مفہوم، اس کے صحیح معنی آجتک نہیں سمجھ سکے۔ وہ نہیں جانتے انکو علم ہی نہیں کہ آرٹ ہے کیا بلا، بس جو چیز طبیعت کو بھلی معلوم ہوئی، جس کو دل نے چاہا وہ آرٹ بنکر رہ گیا

فلم کو مجسم آرٹ ہونا چاہیے اور ایک کامیاب فلم ہوتا ہی مجسم آرٹ ہے اس لئے کہ فلم کی بنیاد ہی آرٹ پر رکھی گئی ہے، اور وہی فلم ناکام ہیں تھرڈ کلاس تصور کئے جاتے ہیں جن میں آرٹ کا فقدان ہوتا ہے جن میں ڈائرکٹر اپنی عدم واقفیت اور ناتجربہ کاری کی بنا پر آرٹ کا خون کر دیتا ہے ایسی ہی تصاویر جب آپ کے سامنے آتی ہیں تو آپ انھیں عزت نہیں بلکہ نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں ان کی سرپرستی آپ اپنی کسر شان سمجھتے ہیں اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فلم فیل ہو جاتی ہے۔

اب آپ کے دل میں سوال یہ پیدا ہو رہا ہوگا کہ آخر آرٹ ہے کیا بلا؟ آرٹ کہتے کسے ہیں؟

دنیا کی ہر وہ چیز آرٹ ہے جسے عین ماحول، اس کی عین فطرت کے مطابق پیش کر دیا جائے اسکو مزید واضح کرنے کے لئے یوں سمجھ لیجئے کہ فلم میں وہی سین آرٹ کا مکمل نمونہ کہا جا سکے گا جو اپنے صحیح ماحول کا مضحکہ نہ اڑا رہا ہو۔ فرض کیجئے کہ ایک فلم میں ڈائرکٹر نے دیہاتی بازار کا منظر پیش کیا ہے مگر وہ اپنی ناواقفیت اور جہالت کی بنا پر اس بازار کے سین میں بڑی بڑی عالیشان دوکانیں، دوکانداروں کے صاف ستھرے قیمتی لباس، اور انھیں شہری رنگ میں رنگا ہوا پیش کرے یہی نہیں بلکہ بازار میں خرید و فروخت کرنے والے بھی سب کے سب شہری لباس میں ہوں اکثر و بیشتر حضرات مکمل سوٹ میں نظر آئیں بس یہی خون ہے آرٹ کا، یہیں پر ڈائرکٹر نے فلم کی قدر و قیمت میں کمی پیدا کر دی بیچارے کو اس کا علم ہی نہیں کہ دیہاتی بازار ہوتے کیسے ہیں، وہ دیہاتیوں کی طرز معاشرت سے نابلد محض ہے یہ آرٹ نہیں ہے بلکہ آرٹ کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے اس جگہ، ہاں اگر یہی سین دیہاتی بازار کا مکمل نمونہ ہوتا، اس میں وہی چیزیں ہوتیں جو کہ دیہاتی بازاروں میں عموماً پائی جاتی ہیں تو یہ سین آرٹ کا مکمل نمونہ ہوتا، اور ہم فخر کے ساتھ بلا خوف و خطر کہہ دیتے کہ یہ سین آرٹ کا زندہ جاوید مرقع ہے۔

اب آپ میرا مطلب اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے اور آپ نے آرٹ کی صحیح تعریف بھی سمجھ لی ہوگی کسی فلم کے "کاسٹیوم" اور اس کے اعلیٰ سٹنگ آرٹ کے علمبردار نہیں ہوتے بلکہ فلم کا ماحول! ہمارے سامنے اس کی پیش کی ہوئی طرز معاشرت، دراصل مستحق ہے آرٹ کا خطاب پانے کی۔

چونکہ فلمیں ہمارے سامنے نمونہ پیش کرتی ہیں ہماری طرز معاشرت کا، وہ عکس کامل ہوتی ہیں ہماری

تہذیب دکھلائی جائے تو فلم کو مجسم آرٹ ہونا چاہیے اور اور اگر وہ اس میں سو فیصدی کامیاب نہیں ہیں تو وہ یقیناً صف دوم پر رہتی ہیں فن اور آرٹ کا ایک نمایاں مظہر ہیں ہماری طرزِ معاشرت پر

فلموں میں مناظر کے ترتیب دینے والے اور ماحول کو اصلی رنگت دینے والے کو آرٹ ڈائرکٹر کہتے ہیں ایسا ڈائرکٹر جو ماہر ہو آرٹ کا، جو دنیا کی تمام تہذیب و تمدن سے کما حقہ واقف ہو، جو ہر مذہب و ملت کے رسم و رواج کو اچھی طرح سے جانتا اور سمجھتا ہو، جو دنیا کی ہزاروں، لاکھوں سال کی پرانی تہذیب سے آشنا ہو، جو جانتا ہو کہ آج سے دو ہزار سال پہلے دنیا میں کیا تھا، اس وقت کا ماحول طرزِ معاشرت اور تہذیب، تمدن کیا تھی۔ غرضیکہ ایک کامیاب آرٹ ڈائرکٹر وہی ہوتا ہے جو ان تمام مناظر سے گزر چکا ہو۔

[illegible] ہندوستان کی ایک ایسی تصویر ہے — جسے ہم آرٹ کا مکمل نمونہ کہہ سکتے ہیں اور اس کا سہرا ہندوستان کے آرٹ ڈائرکٹر مسٹر روس... کے بنکر کے سر ہے جن کو بہت کم لوگ جانتے ہوں گے مغلوں کی طرزِ معاشرت، ان کے باغات، محلات نیز ان کے دربار اور رسم و رواج کا صحیح نقشہ فلم میں مسٹر روس... کے بنکر نے ہی ترتیب دیا تھا۔

اسی طرح "اچھوت کنیا" بھی دیہاتی طرزِ معاشرت کی ایک مکمل تصویر تھی، اور اسی لئے اسے بھی آرٹ کا مکمل نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

یہ تو ہوا فلم کے ان لوازمات کا ذکر جنہیں ایک سین میں ترتیب دینے کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً محلات باغات، مکانات، جھونپڑیاں اور شہر، چھوٹے چھوٹے معمولی دیہات، دربار، جیل وغیرہ وغیرہ اور ان چیزوں کا تعلق زیادہ تر آرٹ ڈائرکٹر سے ہوتا ہے اور وہی ان چیزوں کی صحیح ترتیب و آرائش کا سو فیصدی ذمہ دار ہے۔

علاوہ تعمیری ماحول کے فلم میں ایک اور بھی سب سے بڑا اور اہم ماحول پیش کرنا ہوتا ہے جس کی ذمہ داری آرٹ ڈائرکٹر پر نہیں بلکہ سو فیصدی فلم ڈائرکٹر پر عائد ہوتی ہے اور یہ ہی ایک ایسا ٹیڑھا مسئلہ ہے جس کے حل میں ہندوستان کے ۹۵ فی صدی فلم ڈائرکٹر ٹھوکر کھاتے ہیں وہ مسئلہ ہے زبان نیز لب و لہجہ کا۔

مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک دیہاتی سین ہے، دیہاتی جمع ہیں آپس میں کسی مسئلہ پر پُرجوش بحث ہو رہی ہے مگر اس بحث میں مثالیں دی جا رہی ہیں امریکہ اور یورپ کی، زبان نہایت ہی صاف اور شہری استعمال ہو رہی ہے، موقعہ ہے نہایت ہی نرم لہجہ میں سمجھا کر بات کرنے کا اور ڈائرکٹر صاحب اس جگہ آرٹسٹ پر زور دے رہے ہیں کہ وہ چیخ چیخ کر غصے کے لہجے میں بات کرے۔ غرضیکہ اس قسم کے مختلف سین جو بلحاظ مکالمے اور جذبات نگاری بالکل غیر فطری ہوتے ہیں بار بار گزرتے ہیں تو آپ کی قوت سامعہ اور قوت باصرہ پر اور آپ اکتا جاتے ہیں، ایسی فلموں سے آپ کو بجائے دلچسپی کے کوفت ہونے لگتی ہے یہ بھی خون ہے آرٹ کا

اس جگہ بھی آرٹ کا خون ہوا ہے مگر آرٹ ڈائرکٹر کے ہاتھوں نہیں بلکہ ایک ناتجربہ کار اور نالائق ڈائرکٹر کے ہاتھوں۔

ہماری ہندوستانی خلقت فلم سازی نے کافی سے زیادہ ترقی حاصل کرلی ہے مگر ہنوز یہاں فلموں میں آرٹ کا خون نہایت ہی دیدہ دلیری سے نااہل ڈائرکٹرز کے ہاتھوں ہوتا رہتا ہے۔ ہندوستان کا کوئی ڈائرکٹر ایسا نہیں ہے جس نے اپنی تصاویر میں کم وبیش آرٹ کا خون نہ بہایا ہو۔ ماسوا ہندوستان کے دو قابل فخر ڈائرکٹر مسٹر شانتارام اور مسٹر بروا کے

مسٹر شانتارام کی تصویر "آدمی" آرٹ کی زندہ جاوید تصویر ہے ایک ایسی تصویر جسے آرٹ کا مکمل نمونہ کہا جاسکتا ہے "آدمی" کا ہر سین مکمل عین ماحول کے مطابق اور انسانی فطرت کا صحیح آئینہ دار ہے مسٹر شانتارام نے ایک ایسے مسئلہ کو ہاتھ میں لیا تھا جس کا حل سوا ان کے ہندوستان کے کسی ڈائرکٹر کے پاس نہ تھا ایک تھرڈ کلاس طوائف کا کیرکٹر ایک پولیسمین کا مزاج، اس کے عادات واطوار ایک شریف گھرانے کا کیرکٹر، زبان، لہجہ، طرز گفتگو، ان سبھوں کی طرز معاشرت غرضیکہ شانتارام نے کہیں بھی ٹھوکر نہیں کھائی انھوں نے آرٹ کا خون اپنی تصویر میں نہیں ہونے دیا۔

اسی طرح مسٹر بروا کی تصویریں "دیوداس" اور "ادھیکار" آرٹ کا مکمل نمونہ تھیں۔ اسٹیجی ڈھنگ نہیں بلکہ گھریلو بات چیت اور گھریلو طرز معاشرت کا مکمل نمونہ آرٹ کی کامیاب ترین تصاویر۔ اور نہ صرف دیوداس واد ھیکار بلکہ مسٹر بروا کی ہر تصویر فن آرٹ کی جیتی جاگتی تصویر ہے ۔۔ "آرٹ کیا ہے" میرا خیال ہے کہ اب آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہونگے کہ کسی تصویر میں اصلی صحیح ماحول، صحیح طرز معاشرت اور صحیح لب ولہجہ جو کہ عین اسی ماحول کے مطابق ہو ایک آرٹ ہے نہ کہ فلم کے لمبے چوڑے شاندار سنگر اور زرق برق لباس کی بھاگ دوڑ جو کہ اپنے اصلی ماحول سے کوسوں دور ہو۔

فلم ایک ایسا فعل ہے جس کی بنیاد آرٹ پر رکھی گئی ہے جو مجسم آرٹ ہے !!!

ضروری اطلاع۔ ہمارے پاس اس مرتبہ حسب ذیل کتابیں تبصرہ کیلئے آئی ہیں لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم ان میں سے کسی پر بھی اظہار خیال نہ کرسکے۔ آئندہ اشاعت میں ہم ان تمام کتابوں پر مفصل لکھیں گے۔ ہم ان اصحاب سے جنھوں نے ہمیں کتابیں بھیجی ہیں اس بار معذرت چاہتے ہیں

پس پردہ (مکتبہ جامعہ) ہندوستانی (مکتبہ جامعہ) مضامین محمد علی (مکتبہ جامعہ) مغلوں کا مدوجزر (مکتبہ جامعہ) بی بی عائشہ (مکتبہ جامعہ) انگلستان کا طریقہ حکومت (مکتبہ جامعہ) اسلام کیسے شروع ہوا (مکتبہ جامعہ) فرہنگ عامرہ (مکتبہ جامعہ) حفیظ جونپوری (کتاب گھر جونپور) ماہر القادری کے سو شعر (مکتبہ علمیہ حیدرآباد۔ دکن) ظہور قدسی (مکتبہ علمیہ۔ حیدرآباد۔ دکن)

اسی سلسلہ میں ہم یہ بتادینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ کی وہ کتابیں جن پر ہم تبصرہ کرتے ہیں۔ اور جو اوپر درج ہیں یہ سب دفتر ماہنامہ اضطراب۔ لکھنؤ کے پتہ سے بھی منگائی جاسکتی ہیں۔ ڈاک خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔ (ادارہ)

"چین کے مسلمان"

قریہ خاتون

تقریباً ایک صدی کی مسلسل کوششوں کے بعد چیانگ کائی شیک نے جمعیتہ اسلامیہ نے اپنے تعمیری مقاصد کے ماتحت، چین میں دو کروڑ مسلمانوں کا اضافہ کیا ہے عقائد اور رسومات کے لحاظ سے چین میں صرف دو مذہب ہیں۔ عیسائیت اور اسلام کنفوشیت کو مذہب کے بجائے اگر صرف اصول فلسفہ کہا جائے تو بہتر ہے۔ حکیم لاؤتزے کا مذہب جس کا تقریباً پانچ سو برس قبل مسیح آغاز ہوا اور جو مذہب تاؤ کے نام سے موسوم ہے اب زوال پذیر ہے۔ یہی حالت بدھ مذہب کی بھی ہے۔ حالانکہ اس وقت بھی بدھ مذہب کے پیرو اس ملک میں کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں لیکن رفتہ رفتہ وہ کم ہوتے جا رہے ہیں۔ روسی سرحد پر جہاں اشتراکی خیال کے لوگ زیادہ ہیں کہیں کہیں ایک حد تک دہریت بھی پھیل رہی ہے

چینی مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ محمد صلعم کے زمانے ہی سے یہاں اسلام کی اشاعت شروع ہو گئی تھی اور اس کے آثار تقریباً ہر صوبے میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن آزاد چین میں اس کا زیادہ عروج ہے۔ سردست اگر ہم اس عقیدے سے بحث نہ کریں تب بھی یہ کامل یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی ابتدا یہاں ۷۱۱ بعد مسیح سے ہوئی جبکہ عرب تجار ترکستان کی طرف سے خشکی کا سفر طے کر کے یہاں پہنچے۔ ۸۰۰ بعد مسیح ایک دوسرا گروہ بحری طرف سے بحری سفر کے ذریعہ مغربی ساحل پر اترا۔ اور لوگوں کو دین نبوی کی تلقین کی۔

گو کہ اسلام کی ترویج و اشاعت کے لیے کافی نمایاں نہیں ہم پہنچ سکی ہیں لیکن رفتہ رفتہ مسلمانوں کے قدامت پرست طبقہ سے جہالت اور تاریکی دور ہوتی جا رہی ہے اور خصوصاً جاپانیوں کے موجودہ حملے نے انھیں اور بھی بیدار کر دیا ہے ابتک حکومت کے دستور و نظام میں عیسائیوں کا بہت غلبہ ہے مگر پھر بھی جنرل پائی چیانگ سی جو کانگسی کے نام سے مشہور ہیں۔ مسلمانوں کے ان چند سپہ سالاروں میں سے ہیں۔ جن کے کارنامے کسی طرح بھی صفحۂ تاریخ سے مٹائے نہیں جا سکتے۔ عیسائیوں میں چیانگ کائی شیک بہت مشہور ہیں اس کے علاوہ حکومت کے معین و مددگار سونگ خاندان کے بہت سے اور بھی افراد ہیں۔ جن میں سے ڈاکٹر ایچ۔ ایچ۔ کنگ وزیر مالیات۔ جو سونگ خاندان کی تینوں بہنوں

میں سے سب سے بڑی بہن کے شوہر ہیں۔ اور ڈاکٹر ہانگشن سوزیر دفتر خارجہ و محکمۂ اشاعت۔ زیادہ نمایاں ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے عیسائی حکومت کے دفاتر میں ذمہ دار عہدوں پر فائض ہیں۔

چین کے مسلمان حکومت جمہوریہ سے قبل بہت رجعت پسند اور قدامت پرست تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ پچھلی حکومت اپنے مفاد کے لحاظ سے مسلمانوں کو آلۂ کار بنا کر انہیں دوسرے مذہب کے پیروؤں سے لڑاتی رہتی تھی۔ اس طرح اُس نے تنگ نظری کو فروغ دے کر تعصب کی بیجا آگ کو بھڑکا دیا تھا لیکن آزاد چین میں اب ایک خوشگوار فضا پیدا ہو گئی ہے۔ اور مسلمانوں کو آگے بڑھنے کے زیادہ مواقع ہیں۔ اب یہاں نہ فرقہ وارانہ فساد ہوتے ہیں اور نہ مذہب کے نام پر یہاں ایک انسان دوسرے انسان کا خون بہاتا ہے۔ اس آزاد حکومت میں تمام مذاہب کے لوگ ایک عالمگیر برادری کی شکل میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ جہالت اور افلاس کے بادل چھٹ گئے ہیں۔ اور مسلمان روز بروز ترقی کی رفعتوں پر پہونچتے جا رہے ہیں خصوصاً اب جاپان کے حملے کی وجہ سے ان میں اور زیادہ اتحاد پیدا ہو گیا ہے۔

اضطراب عالم

عشرت علی صدیقی

جنگ کی برسی | یکم ستمبر کو یورپ نے جنگ کی پہلی برسی منائی۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ ابھی اسے کتنی برسیاں اور منانا پڑیں گی اس لئے کہ ابھی تک ان مسئلوں کے حل کی کوئی صورت نظر نہیں آتی جن کے اُلجھاؤ نے یورپ کے سر یہ بلا نازل کی ہے۔ فریقین کے تھک جانے یا ایک فریق کے غالب آجانے کے بعد بھی یہ مسئلے بدستور رہیں گے۔ یہ لاوا یونہی پکتا رہیگا اور جب پکتے پکتے ایک حد تک پہنچ جائے گا تو پھٹ کر اپنے زہر سے دنیا میں پھر وہی بربادی اور تباہی برپا کر دے گا جو آج سال بھر سے برپا ہے اور اس سے پہلے ۱۹۱۴-۱۸ء میں برپا ہو چکی ہے۔ جب تک یہ لوٹ کھسوٹ کا نظام قائم ہے اور ایک ملک دوسرے ملک پر قبضہ جمانا اپنے ملکی اور قومی مفاد کے لیے ضروری سمجھتا ہے اس وقت تک دنیا کو امن نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہر ملک کو برابر کی آزادی حاصل ہو۔ اسلحہ بندی کی ہوڑ ختم ہو جائے اور ایک قوم دوسری قوم کو ہڑپ کرنے کا ارادہ ترک کر دے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ ہر ملک میں صحیح معنوں میں قومی حکومت قائم ہو اور اس پر عوام کا قبضہ ہو نہ کہ اوپر کے لالچی طبقوں کا جو اپنے

مطابق مفاد اور کچھ فائدوں کو ملک اور قوم کی بھلائی اور دنیا کے امن پر ترجیح دیتے ہیں جن کے نزدیک دنیا ان کے لئے ہے نہ کہ وہ دنیا کے لئے۔

یہ چند موٹے موٹے اصول ہیں جو دنیا کے امن پسند طاقتوں کی طرف سے بار بار پیش کئے جا رہے ہیں اور یہاں پر ان کے ذکر کا مقصد صرف جنگ زدہ یورپ کے ساتھ اظہار ہمدردی ہے۔ اس پر تفصیلی بحث کسی آئندہ صحبت میں کی جائے گی۔ البتہ اس شرط کے ساتھ کہ موجودہ زبان بندی کے زمانہ میں اضطراب کے ایڈیٹر صاحب اس کی اجازت دیدیں۔

رومانیہ کی حیثیت

رومانیہ کا حکمران شاہ کیرول اور اس کے حاشیہ نشین کافی عرصہ سے حکومت کر رہے تھے۔ فرانس کی ہار کے بعد بلقان پر سے برطانیہ کا اثر ہٹ جانے پر وہ جرمن دوستی کا جامہ پہنے ہوئے تھے۔ اس پالیسی میں عوام کو کوئی دخل نہیں تھا۔ اسی لئے جب ٹرانسلوانیا کے معاملہ میں جرمنی اور اٹلی نے رومانیہ کو دھوکا دیا تو عوام کی مخالفت نے شاہ کیرول سے اس کا تاج چھین لیا بالکل اسی طرح جیسے کہ فرانس میں لاوال وزیر کی کمزور خارجی پالیسی اور انگلستان کے چیمبرلین کی صلح جوئی نے ان سے حکومت کی باگ چھین لی تھی۔

ہنگری رومانیہ سے اپنا ٹرانسلوانیا کا علاقہ طلب کر رہا تھا اور رومانیہ انکار کر رہا تھا آخر ربن تراپ (جرمن وزیر خارجہ) اور کیانو (اطالوی وزیر خارجہ) نے ان دونوں کے نمائندوں کو جرمنی بلا کر پنچایت کر دی۔ کیرول میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ اس زبردستی کی پنچایت کو نامنظور کر سکتا۔ لیکن عوام اس دھوکہ بازی کو خاموشی سے مان لینے پر نہیں تیار تھے انھوں نے احتجاج کیا اور کیرول کو اپنی ماعل کے بیگتان میں تخت و تاج اپنے بیٹے کو سپرد کر کے خود دیس نکالا لینا پڑا۔

رومانیہ کے عوام میں اتنی طاقت تو تھی کہ وہ اپنے غلط کار بادشاہ کو نکال دیں لیکن ان میں کوئی خاص تنظیم نہ تھی کہ وہ حکومت کا کام خود ہی سنبھال لیتے چنانچہ وہاں ڈکٹیٹری راج قائم ہو گیا۔ کیرول کا لڑکا میکائیل نام کو بادشاہ ہے ورنہ دراصل طاقت وزیراعظم انٹونیسکو کے ہاتھ میں ہے۔ اور رومانیہ پھر پرانے ڈھرے پر آگیا ہے یعنی اس نے اتنی بڑی ذلت کے بعد بھی جرمنی کی دوستی کا دم بھرنا شروع کر دیا ہے۔

انگلستان پر حملے

رومانیہ کی طرف سے اطمینان کر کے ہٹلر انگلستان کی طرف پھر پوری توجہ دے رہا ہے۔ جس دن کیرول رومانیہ کے تخت سے دستبردار ہوا اسی دن (۶ ستمبر) کی خبر ہے کہ رات جرمن ہوائی جہازوں کے ایک بہت بڑے جھتے نے انگلستان پر دھاوا کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے پہلے کبھی اتنی تعداد میں ہوائی جہازوں نے ایک ساتھ حملہ نہیں کیا تھا۔ دوسرے دن کے حملہ میں برطانیہ کے چار سو آدمی جان سے مارے گئے اور تیرہ چودہ سو زخمی ہوئے۔ ۱۰ ستمبر کو اور اس کے بعد سے کئی مرتبہ جرمنی کے ہوائی جہاز برطانیہ کے راج محل بکنگھم پیلس پر بھی بمباری کر چکے ہیں۔

اس دوران میں برطانیہ کے شاہی ہوائی بیڑے

نے بھی جرمنی پر حملہ کرکے اچھا خاصہ بدلہ لیا ہے۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ میں یورپ میں جاڑے کا موسم شروع ہونے والا ہے اور جرمنی کی کوشش ہے کہ اس کے شروع ہونے سے پہلے ہی وہ انگلستان پر لشکر کشی کر دے۔ اس کے ہوائی حملے اسی پروگرام کا ایک حصہ خیال کئے جاتے ہیں۔ ان حملوں سے اس کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ برطانیہ کی ہوائی طاقت توڑ دی جائے اور اس کے ساحلی انتظامات کو بیکار کر دیا جائے اور دوسرے یہ کہ اندھا دھند بمباری کرکے لندن والوں کی اخلاقی قوت توڑ دی جائے اور ان کے دلوں میں جرمنی کا ڈر بٹھا دیا جائے۔

حال کی خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی عنقریب ہی لشکر کشی کرنے والا ہے مثلاً خبر ہے کہ ناروے کے ساحل پر جرمنی کی فوجیں جہازوں پر سے اُترنے اور چڑھنے کی مشق کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ کہا جاتا ہے کہ ہالینڈ، بلجیم اور فرانس کے ساحل پر جرمنی کے بہت سے جہاز جمع کر دیے گئے ہیں جن پر سوار ہونے کے لیے بیشمار فوجیں تیار کھڑی ہیں۔

افریقہ کا حال

جنگ کے زمانہ میں خبروں میں کاٹ چھانٹ تو ہوتی ہی رہتی ہے مگر افریقہ کی خبروں کا جو حال ہے اس سے واقعی حیرت ہوتی ہے اول تو خبریں آتی ہی بہت کم ہیں اور جو آتی ہیں ان میں اتنا تضاد ہوتا ہے کہ لاکھ لاکھ کوششیں کرنے پر بھی صحیح صورت حال کا معمولی سا بھی اندازہ نہیں ہونے پاتا۔ اس طرف جو کچھ خبریں آئی ہیں ان سے صرف یہ پتہ چلتا ہے اور شاید خبریں بھیجنے والے ہیں اتنا ہی بتانا بھی چاہتے ہیں کہ اٹلی مصر پر تین طرف سے حملہ کرنے والا ہے۔ ایک تو سولوم سے بڑھکر اسکندریہ پر دوسرے مصر اور سوڈان کی سرحد پر سے دریائے نیل کے علاقہ پر اور تیسرے کسالا کے مغرب کی طرف سے خرطوم پر۔

اٹلی کے اعلان جنگ کے بعد یہ خبر آئی تھی کہ اگرچہ مصر نے ابھی اعلان جنگ نہیں کیا ہے مگر اس نے یہ کہہ دیا ہے کہ اگر اس کے علاقہ پر حملہ ہوا تو وہ فوراً ہی جنگ کا اعلان کر دیگا۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ اٹلی نے مصر کی ساٹھ میل زمین جیت لی ہے۔ اور سولوم پر (جو برطانیہ کے نزدیک کوئی فوجی اہمیت نہیں رکھتا) اپنے اڈے قائم کرکے اسکندریہ پر جھپٹا مار کر سوئز تک پہنچنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ مگر ابھی تک مصر نے اُس کے خلاف اعلان جنگ کیوں نہیں کیا؟ اس سوال کا جواب اگر تلاش کیا جائے تو شاید دو پچھلی خبروں کا تجزیہ کرنے سے مل جائے ایک تو برطانیہ کا اعلان کہ ہم مصر کو اعلانِ جنگ پر مجبور نہیں کر رہے ہیں اور دوسرے مصری وزارت کی تبدیلیوں کی متعدد خبریں۔

امریکہ کا سودا

پچھلے مہینے میں نے شنگھائی کی بین الاقوامی بستی میں برطانوی فوجوں کی جگہ امریکی فوجوں کی آمد پر لکھا تھا کہ امریکہ نے یہ ذمہ داری مفت میں نہیں لی ہوگی اب برطانیہ اور امریکہ کے معاہدے نے اس کی تصدیق کر دی ہے اس

معاہدے کی رو سے امریکہ اپنے ۵۰ پرانے تباہ کن جہاز برطانیہ کو دیئے اور ان کے عوض اسکو بحر کیسربین کے برطانوی مقبوضات اور برطانوی گائنا میں ہوائی اور بحری اڈے قائم کرنے کی اجازت مل گئی اور نیو فاؤنڈ لینڈ کے جنوبی ساحل اور خلیج برمودا کے مشرقی ساحل پر اڈے قائم کرنے کا حق ملا ہے غالباً امریکہ چاہتا تھا کہ ان مقامات میں انگریزی جان و مال کی چوکیداری کرنے کا معاوضہ لے لیجئے۔

امریکہ لڑائی کے زمانہ میں بھی اپنے بنئے پن سے نہ چوکا۔ اس نے یہ پیش بندی بظاہر اس لئے کی ہے کہ اگر لڑائی میں برطانیہ ہار جائے تو اس کے مغربی کرۂ ارض کے مقبوضات کسی دوسرے کے پاس نہ جانے پائیں۔

فرانکو کدھر؟ تجربہ پہ تجربہ کرنا عقلمندوں کا طریقہ نہیں ہے لیکن برطانیہ کے حکام نے اس کہاوت سے سبق نہیں لیا۔ چیمبرلین صاحب اپنی صلح جوئی کی پالیسی کے ماتحت نازی جرمنی کو منہ بھرائی دیتے رہے لیکن اس کی بھوک نہ مٹنا تھی نہ مٹی بلکہ وہ اور مضبوط ہو کر اب سارے یورپ اور خود انگلستان کو بھی ہڑپ کر لینا چاہتا ہے پھر اٹلی کو جرمنی سے الگ کر لینے اور جنگ میں شامل ہونے سے روکنے کے لئے اس کی طرح طرح سے چاپلوسی کی گئی اور بیشمار تجارتی مراعات دی گئیں۔ لیکن وہ اپنی مقررہ راہ سے نہ ٹلا۔ اب ایک دفعہ پھر اسپینی ڈکٹیٹر فرانکو کو موہ لینے کی کوشش ہو رہی ہے اور سر سیموئل ہور خاص اس کام کے لیے اسپین بھیجے گئے ہیں لیکن اسپین اور جرمنی کا ڈانڈا ڈانڈے سے ملتا ہے اور اس کے علاوہ فرانکو جرمنی کا احسان جو اس نے خانہ جنگی کے زمانہ میں کیا تھا بھلا نہیں سکتا۔ اور بھلا دے تو جرمنی کے پڑوس میں رہ کر چین سے حکومت نہیں کر سکتا چنانچہ خبر ہے کہ اسپینی وزیر داخلہ برلن گیا ہوا ہے۔ جہاں وہ ملکی معاملات کے علاوہ دوسری باتوں پر بھی تبادلہ خیال کریگا۔ یہ بھی خبر ہے کہ جرمنی کی بہت سی سپاہ اسپین میں موجود ہے۔ اور اس کی غرض سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتی کہ جبرالٹر کو انگریزوں سے چھین لیا جائے۔

جاپان کا الٹیمیٹم فرانسیسی انڈوچین اور جاپان میں اس مہینہ بھر بات چیت ہوتی رہی اور اب یہ بات چیت بلا کسی نتیجہ پہنچے ختم ہو گئی ہے تازہ ترین (۲۱ ستمبر کی) خبر ہے کہ جاپان نے انڈوچین کو الٹیمیٹم دے دیا ہے کہ وہ ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر جاپان کو اس راستے فوجیں لیجانے اور اڈے قائم کرنے کا حق دیدے ورنہ جاپان زبردستی یہ حق حاصل کر لے گا۔

—— آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

نسیم سندیلوی بی۔ اے آنرز ایڈیٹر و پبلشر نے خاص پریس میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ انقلاب جاپلنگ مارٹ۔ نظیر آباد لکھنؤ سے شائع کیا

ماہنامہ اضطراب لکھنؤ

دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء

ہمارے افسانہ نمبر کے لکھنے والے

افسانے:— علی عباس حسینی
اختر انصاری
چودھری محمد علی
سید احتشام حسین رضوی
حیات اللہ انصاری
تارا شنکر ناشاد
مسیح الحسن رضوی
شفیق بانو شفق

ڈرامے:— اختر لکھنوی
وجاہت سندیلوی

نظمیں:— جوش ملیح آبادی
جگر مرادآبادی
روش صدیقی
دور ہاشمی
مجاز
علی سردار جعفری
مسعود علی ذوقی
آمنہ برجیس
سوز شاہجہاں پوری

کتب خانہ جامعہ ملیہ دہلی

ادارہ:—
نسیم سندیلوی
مسعود اختر جمال

رجسٹرڈ نمبر
جلد نمبر ۱
شمارہ نمبر ۶

فہرست مضامین

۲	اشارے	ادارہ
۳	آسمان	مسعود اختر جمال
۵	آئینۂ روزگار	خان بہادر نواب جعفر علی خاں اثر
۶	کیفِ بہاراں	سید نواب علی گوہر۔ ایم۔ اے
۱۰	غزل	خواجہ عبد الحسن مجذوب
۱۱	فلسفۂ حیات غالب کی نظر میں	سید سجاد علی مہر اکبرآبادی
۱۵	عالمِ مایوسی	احمد مجتبیٰ ایم اے ایل ایل بی
۱۶	افیونی	چودھری محمد علی
۲۱	کلام سائل	نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی
۲۲	کارل مارکس کی رومانی زندگی	سلمان اللہ رشید فاروقی
۲۵	غزل	منظور حسن منظر ایم اے ایل ایل بی
۲۵	سوزِ ناتمام	ابرالقادری
۲۶	عورت	حکیم چودھری سراج احمد دیابادی
۲۹	طلبگاریاں	یکتا حقانی امروہوی
۲۹	لطیف نظم	لطیف قریشی
۳۰	تاریخ ہندوستان کا ایک گمشدہ ورق	چودھری عبدالرؤف عباسی لکھنوی
۳۳	تجدید شوق	شوق کھنڈوی
۳۳	اضطراب	یحییٰ اعظمی اعظم گڈھ
۳۴	توبہ	شفیق بانو
۴۲	حسنِ اتفاق	خالد حسن قادری
۴۶	اضطرابِ عالم	عشرت علی صدیقی

ہمارا افسانہ نمبر ضرور پڑھئے
جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

ماہنامہ اضطراب لکھنؤ

جلد ۱ | دسمبر ۱۹۴۰ء | شمارہ ۶

ہم اور آپ

دسمبر کا پرچہ اس سال کا آخری تحفہ ہے۔ موجودہ جنگ کی گراں بازاری نے تمام سال کی اشاعت میں بہت دشواریاں حائل کر دی ہیں۔ مگر اس کے باوجود "اضطراب" نے نہایت استقلال کے ساتھ ایک سال کی کٹھن مسافت طے کر لی۔ نئے سال کے خیر مقدم کے لیے ہم آپ کی خدمت میں اگلا ماہنامہ نمبر پیش کریں گے۔

ابتک ہم نے رسالہ کا کوئی خاص معیار مقرر نہیں کیا تھا اور نہ کوئی پالیسی معین تھی۔ جو مضامین آتے تھے ان کا جز یا انتخاب شائع ہو جاتا تھا۔ مگر جنوری سے ہمارا پرچہ ایک خاص ادبی معیار کے ساتھ شائع ہوگا۔ پرچہ کی نگرانی حضرت جگر مراد آبادی نے قبول فرمالی ہے۔ ادارہ اُن کے اس ادبی ایثار کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اُن کی نگرانی میں اضطراب روز بروز ترقی کرتا جائیگا۔

نئے سال سے آپ اضطراب میں ملک کے مشہور و منتخب اہل قلم حضرات کے مضامین پڑھیں گے۔

رسالے کا ادبی معیار کیا ہے؟

یہ سوال لوگوں سے بار بار پوچھا گیا ہے۔ ابتک اسمیں شک نہیں کہ اضطراب کسی خاص پالیسی پر کاربند نہیں تھا لیکن آئندہ سے ہمارے سامنے ایک متعینہ پالیسی ہوگی۔ اور ادارہ نہایت سختی سے اُس پر کاربند ہوگا۔ ادبی معیار سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اضطراب میں ہم علمی اور فنی تحقیق و تدوین شروع کر دینگے بلکہ اس سے مراد وہ تعمیری ادب ہے جس سے عوام میں بھی پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا کیا جا سکے اور جس کے ذریعہ سے ذوقِ سلیم کی رہنمائی کی جائے جو زندگی کی تگ و دو میں ایک کامیاب انسان بنا سکے

کیا دنیائے ادب کے وہ درخشندہ ستارے جو آج وقت شعر و ادب کی لامحدود فضاؤں پر چھائے ہوئے ہیں ہمارے مقاصد کی تکمیل کے لیے کوشش کریں گے اور کیا ہم اپنے ارادوں میں کامیاب ہو سکیں گے اس سوال کا جواب زمانے کے متبسم چہرے سے ہمیں خود بخود مل جائے گا۔

ہم اس چھ ماہ کے عرصہ میں اکثر ممتاز اہل قلم حضرات سے ملے۔ جنھوں نے قلمی معاونت کا وعدہ کیا ہے۔

پرچہ کی ترویج و اشاعت کے لئے ہمارے نمائندہ خصوصی یو۔پی میں دورہ کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اضطراب کے بہی خواہ اس سلسلہ میں ان کی ہر ممکن امداد کریں گے۔ بالتفصیل پروگرام دفتر سے معلوم کر لیجئے

ڈاک سے پرچہ غائب ہونے کی اکثر شکایتیں آتی رہتی ہیں۔ اس مہینے سے ہم نے اس کی تحقیق شروع کر دی ہے جن حضرات کو رسالہ وقت مقررہ پر نہ ملے انھیں چاہیے کہ فوراً دفتر کو مطلع کریں تاکہ ہم اس کا جلد از جلد انسداد کر سکیں۔

اس پرچہ کے ساتھ خریداری نمبر میں کچھ فرق ہوا ہے۔ اکثر حضرات کے خریداری نمبر بدل گئے ہیں۔ اس کی صورت ہمیں دفتر کی چند دشواریوں کی وجہ سے پیش آئی۔ اب آئندہ ہر ایک خریداری نمبر وہی رہیگا جو اس مرتبہ پتہ کے ساتھ بائیں جانب تحریر ہے۔ ہمارے خریدار نوٹ فرمالیں۔

(ادارہ)

مشاہدات :—

آسماں

آسماں ظلمت ادراک و نظر ہے شاید
ایک نادیدہ حقیقت کی خبر ہے شاید
یہی آماجگہِ شام و سحر ہے شاید
چھا گیا ہے جو فضاؤں پہ وہ سیلاب ہے یہ
بس گیا ہے جو نگاہوں میں وہی خواب ہے یہ
شبستاں کے گہر پاش نظارے اسمیں
انجستاں کے سحر خیز شرارے اسمیں
کوثرستاں کے شب آثار کنارے اسمیں
لوگ کہتے ہیں یہ وہ سقفِ گرانمایہ ہے
جس کا دامن مہ و خورشید کا ہمسایہ ہے
جہل پہ ناز کیا کرتی ہے تقدیر یہاں
خواب ہستی کی ملا کرتی ہے تعبیر یہاں
کھینچ لیتی ہے نظر خلد کی تصویر یہاں
اس کی تاریک فضاؤں کی نہ حد ہے نہ حساب
بحرِ فطرت نے عطا کی ہے اسے شکلِ حباب
ڈوب جاتی ہے یہاں عالمِ حیرت میں نظر
بے حقیقت ہیں یہاں علم و ہنر کے دفتر
تھرتھراتے ہیں یہاں وہم کے سایے اکثر
الہیت اس سے عقائد میں ہوئی ہے تبدیل
اسی تخئیل نے کھولی ہے عرفاں کی سبیل

مستیِ کوثر و تسنیم چھلکتی ہے یہیں
روحِ آوارۂ جذبات بھٹکتی ہے یہیں
برقِ عرفانِ سرِ طور چمکتی ہے یہیں
نوعِ انساں کو ملا تاج یہیں پر شاید
طے ہوئی منزلِ معراج یہیں پر شاید
اسی وادی میں کہیں صبحِ ازل ہے روپوش
اسی وادی میں کہیں شامِ ابد ہے روپوش
اسی وادی میں کہیں رحمتِ یزداں خاموش
ہوتی رہتی ہیں بلائیں بھی یہیں سے نازل
یہیں ہوتی ہیں ہر اک دل کی مرادیں حاصل
لامکاں کے اسی وادی میں نہاں ہیں جلوے
اسی وادی میں جہنم کے بھڑکتے شعلے
اسی وادی میں فرشتوں نے کئے تھے سجدے
یہیں مقبول اسیروں کی دعا ہوتی ہے
اور تقدیر غریبوں کی یہیں سوتی ہے
یہیں آدم بھی گناہوں کے سزاوار ہوئے
دامِ تزویرِ محبت میں گرفتار ہوئے
یہیں دنیائے حقیقت سے خبردار ہوئے
یہیں ابلیس کا پندارِ عبادت ٹوٹا
زہد کے ہاتھ سے تقدیس کا دامن چھوٹا

یہ بھی جب رات کو چھا جاتی ہے خاموشی سی
بند ہو جاتی ہے جب ذہن کی سرگوشی بھی
اور پھر — ٹوٹ کے گرتا ہے جو تارا کوئی
ایک شعلہ سا فضاؤں میں بھڑک اٹھتا ہے
قلبِ گیتی میں بھی احساس دھڑک اٹھتا ہے
یاد آ جاتا ہے ہستی کا فسانہ پھر
دل ہر اک قید سے ہو جاتا ہے بیگانہ پھر
لوٹ جاتا ہے تخیل کا صنم خانہ پھر
یک بیک عقدۂ اوہام بکھر جاتا ہے
ڈوب کر بحرِ صداقت میں نکھر جاتا ہے

ہر طرف پھر نظر آتی ہے فضا لامحدود
جس کی ظلمت میں — رہِ عقل و خرد ہے مسدود
جلوۂ ہوش ٹھہرتا ہے جہاں پر مردود
چشمِ خورشید مگر باز یہاں رہتی ہے
زندگی مائلِ پرواز یہاں رہتی ہے
مہ و انجم کے سفر سے یہی ہوتا ہے گماں
ہے بعد شوق رواں کشتیٔ انوار یہاں
زندگی ہے — بحرِ آثار یہاں سیر کناں
آسماں کچھ بھی نہیں — وسعتِ بے پایاں ہے
یہی تاریک خلا — مرکزِ نورستاں ہے

مسعود اختر۔ جمال

سہارا

شفیق بانو

شفیق بانو کے افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے

جس میں روزمرہ کی عام فہم اور سلیس زبان میں ہماری خانگی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے ایک مرتبہ شروع کر دیجئے پھر آپ کی طبیعت ہرگز نہیں اکتائے گی اور آپ بہت جلد محسوس کرنے لگیں گے کہ جیسے یہ آپ ہی کی داستان ہے اس میں محبت کے کانٹے بھی ہیں اور لطافت کے پھول بھی اس کے نہ پڑھنے سے آپ کے نفسیاتی مطالعہ میں بہت بڑی کمی رہ جائے گی قیمت عہ ملنے کا پتہ :- شفیق بانو۔ جامع مسجد نجیب آباد۔ ضلع بجنور

پیغام

ہفت روزہ

یوپی کا ہر دلعزیز ہفت روزہ اخبار جو برابر دس سال سے زیر ادارت چودھری نور الحسن صاحب اختر پابندیٔ وقت سے شائع ہو رہا ہے موجودہ کاغذ کی گرانی بھی اس کے پائے استقلال کو جنبش نہ دے سکی۔ چندہ سالانہ بذریعہ ...

[illegible] ۱۹۴۷ء

عنقریب شائع ہو رہے ہیں

(ادیبِ انقلاب ملک سلمان الارشد فاروقی)

کے چودہ افسانے کتابی صورت میں

آرڈر جلد رجسٹر کرائیے

مکتبہ ریحانہ قصر التحریر۔ بھوپال

آئینۂ فن‌کار

خان بہادر نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

اے فلک یہ کیا تری نیرنگیوں کا رنگ ہے
خرمیِ مفقود جس کو دیکھئے دل تنگ ہے

دل گرفتہ ہیں شگوفے، پھول مرجھائے ہوئے
نالۂ فریاد و شیون مرغِ خوش آہنگ ہے

آنکھ کھلتے ہی ہوا بادِ مخالف سے دوچار
جامۂ ہستی تنِ گل پر بہیا غنک تنگ ہے

جن کے سینوں میں کبھی تھا جوشِ زن حبِّ وطن
پست اُن کے حوصلے ہیں پائے ہمت لنگ ہے

طرحِ میخانہ ہے جنسے خونِ دل پیتے ہیں وہ
اور کم ظرفوں کی خاطر بادہ گلرنگ ہے

صاحبِ مقدور جو تھے آج ہیں ایسے ذلیل
خاک ہے ان کا بچھونا اور بالش سنگ ہے

ناکسوں کا قدرداں ہے، دشمنِ اہلِ کمال
تیری کج رفتاریوں سے عقل میری دنگ ہے

بوالہوس جتنے ہیں ان کو عشق کا سودا ہوا
نام سے اہلِ وفا کے دلبروں کو ننگ ہے

بغض و کینہ دوستوں میں، آشنا ناآشنا
باپ بیٹوں میں عداوت بھائیوں میں جنگ ہے

یاد آیا میکہ تھا احباب میں باہم خلوص
اب صفائے قلب کے بدلے دلوں میں زنگ ہے

دور کر جانے لگے کوئے ضلالت کی طرف
اور راہِ حق میں اک اک گام سنگِ ہسنگ ہے

دل کے بدلے ملک پر ہے حکمرانی کا خیال
فکر ہے جاہ و حشم کی حسرت اورنگ ہے

سعیِ آزادی میں جب شامل ہوا ذاتی مفاد
بے تکلف خوابِ آزادی خیالِ بنگ ہے

خودنمائی۔ خودفروشی کا رواج ایسا ہوا
راستی خاموش، نیکی سازِ بے آہنگ ہے

قابلِ الزام خود۔ لیکن گلہ تقدیر کا
فعل میں وہ کچھ اثر گفتار کا یہ ڈھنگ ہے

کیفِ بہاراں

سید نواب علی خاں گوہر۔ ایم اے، ال ٹی

حضرت آثر لکھنوی کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کا کلام دنیائے ادب میں کافی شہرت و مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

آپ نے غزل، قصیدہ، نظم، رباعی، قطعہ، مسدس تضمین، تمام اصناف سخن میں طبیعت کے جوہر دکھائے ہیں لیکن غزل کا میدان آپ کا خاص جولانگاہ رہا ہے جیسا کہ خود فرماتے ہیں ؎

کیوں نہ دلدادۂ انداز غزل ہوں کہ آثر
کون شیوہ ہے جو اس کا ذہن میں نہیں

ہم بھی اس مختصر مقالے میں صرف "آثر کے تغزل" سے بحث کریں گے۔

کلام آثر کی خصوصیت تنوع مضامین اور خیال کی گوناگونی ہے "بہاراں" ایسا گلزار ہے جس میں ہر رنگ اور ہر طرح کی لطیف خوشبو کے تازہ اور شاداب پھول بکثرت پائے جاتے ہیں اور

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

اس کے علاوہ ہر غزل میں اچھے اشعار کی تعداد کی زیادتی میں وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ اس دعوے کے ثبوت میں ہم کوئی خاص غزل پیش نہیں کرتے جس کو شک ہو وہ "بہاراں" کا مطالعہ کرلے ہمیں یقین کامل ہے کہ ہر غزل میں اچھے اشعار کافی تعداد میں ملیں گے اور زیادہ تر غزلیں از مطلع تا مقطع مرصع پائی جائیں گی۔

آثر کی غزل میں ندرت خیال، رفعت تخیل، نزاکت تمثیل، جدت ادا، سلاست و روانی، درد و اثر، سوز و مستی اور جوش و خروش بدرجۂ اتم موجود ہے مغربی ادب میں دستگاہ رکھنے کی وجہ سے آپ کے کلام میں مغربی اثر کی کافی جھلک پائی جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مقامی رنگ کا سررشتہ بھی چھوٹنے نہیں پاتا۔

"بہاراں" میں واردات حسن و عشق، جذبات نگاری، رندی، محاکات، مناظر فطرت کی مصوری، تصوف، فلسفہ اور سائنس کے مسائل، حب وطن، اور سیاست حاضرہ سب ہی کچھ موجود ہے۔ اور اسی سے ہر مذاق اور ہر طبیعت کا انسان اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

جہانتک حسن و عشق کا تعلق ہے آثر کا حسن اور عشق دونوں معیاری ہیں جیسا کہ مندرجۂ ذیل اشعار سے واضح ہوتا ہے ؎

فطرت کا رازدار کیا جب سے عشق نے ٭ جز حسن کوئی میری نظر میں حسیں نہیں
کم و بیش کو ہوا دخل اگر تو دلیل نقص ہے بیخبر
وہی عشق ہے جو نہ بڑھ سکے وہی حسن ہے جو سوا نہ ہو

نازاں ہوں طبیعت پہ کہ اب دردِ محبت
کم بھی نہیں ہوتا اگر افزوں نہیں ہوتا

ظاہر ہے کہ ایسے معیاری عشق میں آرزو کا گزر کہاں

کس طرف تیرا دھیان ہے اے دل
عشق میں آرزو کو دخل نہیں

اور اگر کوئی تمنا ہوئی بھی تو ایسی جس کا بر آنا اس آدمی دنیا میں ممکن نہیں تمنا بھی محبت کی طرح معیاری ہوگی

شیفتہ ہوں اُسی تمنا کا خواب میں بھی جو بر نہیں آتی

جب محبوب معصوم فطرت ہوگا تو اُس کی یہ حالت ہونا لازمی اور ضروری ہے ؎

جو عرض کیجئے فوراً پذیرا عصمت کی ضامن خود بیحجابی

ایسے معشوق کو عاشق سے بدگمانی نہیں ہو سکتی اگر وہ کسی وقت خاموش رہے تو اس کا سبب، حیا ہوگی نہ کہ بدگمانی ؎

حیا پہ حسن کی نہ جا، نظر سے آشکار ہے
کہ عشق پاکباز کا اُسے بھی اعتبار ہے

عاشق کا خیال معصوم خیال ہوگا، نگاہ معصوم نگاہ ہوگی۔ اس میں کسی طرح کی لوث کا شائبہ بھی نہ ہوگا یہاں تک کہ وصل میں بھی یہ شانِ معصومیت قائم رہیگی۔

مذاقِ عشق ہے کامل تو صورتِ شبنم
کنارِ گل میں رہے، اور پاکباز رہے

معیارِ وصل ؎

دیکھی عشرت، ہوتا پھر مدہوشی میخوار کی سی
شوق نے ختم ہیں پہ کیا پر لطف ملا قاتوں کو

یہ پاکبازی اسقدر نادر و نایاب چیز ہے جس پر خود عاشق کو بھی حیرت ہوتی ہے ؎

کہیں کا اس نگہ مست نے نہ رکھا تھا + یہ معجزہ ہے محبت کا پاکباز رہے

اسی سلسلے میں عصمت خیال اور عصمت نگاہ کے متعلق چند اشعار اور سن لیجئے۔

بھولے سے نامِ عشق نہ لینا تھا بوالہوس
جب عصمتِ خیال کا دل پاسباں نہ تھا

ہوس کاری کا اک پہلو نکلتا تھا محبت میں
حیا نے تیری سکھلایا نگہبانِ نظر ہونا

حیا شیوۂ حسن، ادب شرطِ الفت
ملے بھی تو آپس میں پردہ رہیگا

پھول ہو، یا کوئی حسیں، دیکھ لے، شاد ہو، گزر
غیرتِ پاک مشربی دستِ ہوس بڑھائے کیوں

پاکبازانِ محبت ہیں یہاں تک محتاط
گل پہ بھی دیدۂ شبنم سے نظر کرتے ہیں

اختر کا محبوب: فارسی شاعری کے تتبع میں اُردو شعراء نے بھی اکثر ایسے اشعار نظم کئے جن سے محبوب کا مرد ہونا ظاہر ہوتا ہے متقدمین میں یہ وبا عام تھی، موجودہ عہد کے اکثر شعراء نے بھی اکثر اشعار ایسے کہے ہیں جن سے یہ بدنما داغ اُردو شاعری کے دامن پر اور نمایاں ہوگیا۔ لیکن اختر کے تمام دیوان میں کوئی شعر (متصوفانہ اشعار سے قطع نظر کر کے) ایسا نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ اختر کا محبوب مرد ہے برخلاف اس کے ایسے اشعار بکثرت پائے جاتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اختر کی محبوبہ عورت ہے مثلاً

تو حور سے کہتا ہے اسے زاہد خوش خو
اصنام کی فہرست میں نام نہیں ہے

ظاہر ہے کہ حورِ جنت کی عورت ہے غلمان نہیں ہے

نہ اس کے حسن فلک سے گل نہ کھلنے کی یہ باتیں ہیں

ابھی تک چٹکیوں کے نیل ہیں رخسار سوسن پر

چٹکیاں لینا خاص عورتوں کی فطرت ہے، مرد چٹکیاں نہیں لیتے، اس سے ضمناً معشوق کا عورت ہونا واضح ہوتا ہے

کسی کی چشم فسوں ساز کا ہوں دیوانہ
نظر کے ساتھ لئے پھرتا ہوں پری خانہ

عاشق چشم فسوں ساز کے ساتھ پری خانہ لئے پھرتا ہے اگر محبوب صنف نازک سے نہ ہوتا تو بجائے پری خانہ کچھ اور ہی لئے پھرتا ؎

جنوں کو سکھاتا ہے ادا جامہ دری کی
انگڑائی بہانہ ہے، مقصود نہیں ہے

خیال کا تجزیہ کیجئے تو سینہ تانے ہوئے ایک پیکر شباب عورت کی تصویر نگاہوں کے سامنے آجائے گی ؎

میں نقش قدم سے پھر پوچھوں کہ دل جانے کس طرح چلا جاتا ہے

"جانے کس طرح" درست ہے یا "نجانے کس طرح" اس کو مستند اہل زبان جانیں، ہمارے خیال میں اگر "جانے" کے بجائے "نجانے" ہوتا تو شعر کی تمام خوبی خاک میں مل جاتی اسی "جانے" سے معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والی سادہ کمسن عورت ہے مرد نہیں۔ یہ زبان خاص عورتوں کی تھی جس کو بالکل اسی طرح نظم کر کے ضمناً یہ واضح کر دیا کہ کہنے والی معشوق عورت ہے۔

ہم اس موضوع کو یہاں زیادہ طول دینا نہیں چاہتے دیگر عنوانات کے تحت میں جو اشعار نقل کئے جائیں گے ایسے مناسب مقامات پر ان کے محبوب کی صنف کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائیگا۔

حقیقتِ عشق: محبت کیا ہے؟ اس کا جواب فلسفیوں نے کچھ دیا، ماہرین طب نے اور کچھ، صوفیوں نے کچھ اور، گویا عشق کا جواب سب سے جدا رہا، شاعروں نے محبت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ آثر نے عشق کو "شورش صبر آزما" سے تعبیر کیا ہے ؎

غرض اک شورشِ صبر آزما ہے کسی انداز کا دیوانہ بن جا

محبت ایک شورش ہے جو طاقت دل کی آزمائش کرتی ہے عشق ایک اضطراب صبر آزما ہے۔ عاشق کے لیے یہ ضروری نہیں کہ محبت کرنے کے لیے حسن کی ادائے خاص کا انتخاب کرے کسی انداز کا دیوانہ بن جائے اور بس، اس کے بعد یہ شورش صبر آزما سرگرم کار رہے گی اور عشق کے مزے پیدا کرے گا ؎

نگاہ ناز تیری شوخیوں سے بدگمانی ہے
یہ چنگاری مرے سینے میں تو نے تو نہیں رکھ دی؟

اس شعر میں محبت بجائے شورش صبر آزما کے "شورش صبر آزما" ہے۔

عشق کو خلش کا مترادف مانا ہے ؎

عشق ہے خلش کیسہ چین کی خلش دشمن
دار جس کو کہتے ہیں، خوابگاہ سرمد ہے

ایک اور شعر میں عشق کو درد کہا ہے ؎

ازل کو مجھ سے جو پوچھا تجھے ہے کیا درکار
مراد عشق تھی لیکن زباں سے نکلا "درد"

شاید یہ اشارہ کر دینا مناسب نہ ہو کہ شعر میں صنعت ایہام کا صرف تعریف سے مستغنی ہے۔

ایک اور مقام پر عشق کو امتحان سے تعبیر کیا ہے ؎

عشق کی خود آزمائش کر عشق خود امتحان ہے پیارے
باوجود ان تمام تاویلوں کے عشق ایک ناقابل تشریح
حقیقت ہے ؎
رہا ہے جس کو کہنے سننے سے عشق کیا داستان ہے پیارے
اسقدر ناقابل تشریح ہے کہ حسن بھی حیران رہ جاتا
ہے کہ عشق کا مدعا اور منشا کیا ہے۔
حسن خود نما کو بھی جستجو سے مقصد ہے
عشق بے مدعا و مطلب مقید ہے
آخر کار عشق ایک جذبہ خوددار ہے، اسقدر خوددار
کہ حسن سے بھی نہیں جھکتا اس قدر خوددار کہ حسن کو بھی عشق
خوددار پر عشق مغرور کا دھوکا ہو جاتا ہے ؎
بدگماں ست کوئی اتنا نہیں کہنے والا
عشق خوددار ہے، خودسر نہیں، مغرور نہیں
عشق میں تمکین بھی ہے، آن بھی، اور شان بھی
عشق کو اک جذبۂ خوددار ہونا چاہیے
کسی کے ناز سے لٹتا رہا نیاز رہے
فتادگی میں بھی اک شان اختیار رہے
عارفوں کی نگاہ میں عشق سب کچھ ہے اسی سے قوت
حیات، یہی وجہ تخلیق ہے یہی اصل حیات، یہی ایمان ہے
یہی خدا ؎
محبت نہیں ہے تو پھر کچھ نہیں یہ دولت نہیں ہے تو پھر کچھ نہیں
محبت ہی انسان کو انسان بناتی ہے ؎
انسان کو بے عشق سلیقہ نہیں آتا
جینا تو بڑی چیز ہے مرنا نہیں آتا
محبت ہی ایمان ہے ؎

محبت کے بندوں کو انسان جانا، محبت ہی کو ہیں نے ایمان جانا
اسی عشق کی تبلیغ اس دلکش انداز میں کی جاتی ہے ؎
نہیں ملتی جو دولت بیدار عشق کا اک حسین خواب تو دیکھ
علامت عشق ؎ عشق کی وہ منزل ہے جہاں ذرا شبہ بودوہست نہیں
فکر کنا و دو بست نہیں اندوہ بلند و پست نہیں
منزلت اپنی کچھ اے عشق رنگیں اجرا
آپ محفل ہے، ترے در خور کوئی محفل نہیں

فریضہ عشق:۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی سلسلے میں
کچھ فریضہ عشق کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ ہر انسان جانتا ہے کہ
نماز پڑھنے سے پہلے طہارت ضروری ہے، اپنے کو اس درگاہ
پاک میں جانے کے قابل بنانے کے واسطے غسل کرتے ہیں
وضو کرتے ہیں لیکن نماز عشق کی منزل اس قدر بلند اور اعلیٰ
ہے کہ اس کے واسطے آب طاہر سے غسل و وضو کافی نہیں بلکہ
کامل ہے جنہیں ادق پر ستادی جاتا ہے
بے خون میں نہائے ہوئے سجدہ نہیں کرتے
علاوہ بریں ہر روز پانچ وقت ادائے فرض کر لینا کافی ہے
اس سے زیادہ زحمت شرع نے نہیں دی اگر محبت کا فریضہ ایسا
نہیں جس سے انسان اس آسانی سے سبکدوش ہو سکے، تمام
زندگی بھر ادا کرے پھر بھی یہ ادا نہ ہوگا۔
نہیں پنجگانہ نماز آخر جب وقت آئے پڑھ لیا
یہ فریضہ عشق کا عمر بھر جو ادا کرو تو ادا نہ ہو
صرف یہی نہیں کہ مسجد میں جاکے قیام و قعود، رکوع و سجود
بجا لائے اور نماز ہو گئی، نماز عشق کا مقام اور ہے عنوان اور ہے
وہ نماز عشق ہے بوالہوس تہ تیغ جس کا مقام ہے
نہ رکوع ہیں نہ سجود ہیں نہ قعود ہے نہ قیام ہے

غزل

خواجہ عزیز الحسن مجذوب

غمہائے دہر مجکو پریشاں نہ کر سکے — وہ عشق کیا جو درد کو درماں نہ کر سکے
اس شوخ کو درونِ دل و جاں نہ کر سکے — ہم حسبِ شوق خاطرِ مہماں نہ کر سکے
کب عیشِ کیف نشاط کا ساماں نہ کر سکے — "دشواریِ حیات کو آساں نہ کر سکے"
ہم دل میں ضبط اس کی یہاں نہ کر سکے — جو اختیار صورتِ جاناں نہ کر سکے
وہ شوق ناتمام ہے۔ وہ عشق خام ہے — جو ہجر اور وصل کو یکساں نہ کر سکے
اس بلبلِ اسیر کی مجبوریاں نہ پوچھ — جو سیر کیسی، ذکرِ گلستاں نہ کر سکے
وہ ننگِ عاشقاں ہے۔ وہ ہے ننگِ عاشقاں — رگ رگ کو دردِ دل جو رگِ جاں نہ کر سکے
کرتے کچھ اور مدحتِ لب ہائے بتاں ابھی — لیکن بپاسِ عظمتِ قرآں نہ کر سکے
مشکل کو میری کہہ نہ کشاکش ہے اے فلک — کردے محال ہی اگر آساں نہ کر سکے

مجذوب کی نگاہ میں مجنوں ہی وہ نہیں
ذرّے کو جو نظر میں بیاباں نہ کر سکے

سالِ نو — "کس نے فون پہ دی سالِ نو کی تہنیت مجھکو" — علی سردار جعفری

پوری نظم افسانہ نمبر میں پڑھیے

نظریہ حیات غالب کی نظر سے

سید سجاد علی مہر اکبر آبادی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ!
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

اگر یہ جنون خود ساختہ نہیں تو اور کیا ہے کہ شاہد ہستی کو غالب کی نظر سے دیکھنے چلا ہوں اور وہ بھی ذوق نظارۂ جمال کے تقاضہ ہائے پیہم سے۔ نوائے غالب کو صفحۂ قرطاس پر پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، مگر گریہ بمقدار حسرت دل، اعتراف کم مائگی کے ساتھ قلم اٹھا رہا ہوں۔ اس لیے اغیار کے خندہ ہائے بیجا کا کوئی گلہ نہیں ——

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

اجزائے نگاہ و آفتاب منتشر ہیں، اُن کو یکجا کرنے کی جرأت کر رہا ہوں ——

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخون دل
سازِ چمن طرازیٔ داماں کیے ہوئے

مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ میری آواز حلقۂ اہل علم میں بہ مجلس کوئی خراج تحسین وصول نہ کر سکے گی۔ اور نہ اس کی کوئی تمنا یا خواہش ہی تھی۔ ایک شوق تھا جس کی تکمیل کی آرزو ایک خواب تھا جس کی تعبیر کا انتظار —— جو نکہ اعتراف کم مائگی ہے نہ اس کی فراوانی مجھے کچھ لکھنے سے باز رکھتی ہے مگر "تم زدہ چلے بلا حق خامہ فرسا کا" چند سطور منصۂ ظہور پر آ ہی گئیں، گو وہ اہل بینش کے لیے کوئی دلچسپی فراہم نہ کر سکیں۔

غالب کی تراکیب "جمال دلفروز"، "صورت مہر نیم روز" اور "نظارہ سوز" کو غیر مانوس قرار دینے والے۔ اس کے اشعار کو لغو اور بے معنی کہنے والے ذرا اس طرف بھی دیکھیں کہ ایک "شاعر مہمل گو"، ہم کو کس قدر بیش قیمت درس حیات دے رہا ہے۔ میں اس وقت غالب کے اُن چند اشعار پر اکتفا کروں گا جن کے ذریعہ اس "شاعر آتش نفس" نے لوگوں کے ہیجانِ عمل کی آتش کو بھڑکانے اور مقصد حیات کو بلند کرنے میں مدد دی ہے۔ اور جن میں حیات کے مختلف پہلوؤں پر۔ زندگی کے نوعی اصولوں پر روشنی ڈال کر ارباب خرد کے لیے وہ مواد فراہم کیا ہے جو تا قیامت درسِ حیات کی فراہمی میں مدد دیتا رہے گا۔

ہمدردی، اخوت، اور محبت جو نوعِ انسان کی مخصوص صفات ہیں اور جن کے بغیر انسان حقیقی معنے میں انسان کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہے، اُس کے اشعار کے لفظ لفظ سے ظاہر ہوتی ہیں وہ انسانیت ہمدردی کا ایک ایسا نقش مرتسم کرتا ہے۔ جسے حوادث روزگار کے تھپیڑے کسی طرح بھی مٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ صرف زندہ رہنے کی خاطر دنیا میں سانس لینا حقیقی زندگی نہیں ہے۔ ہاں اگر کسی مظلوم کی فریاد پر دل اُس کی مدد

کے لیے آمادہ ہو جائے۔ ہاتھ کی کرسی کی حفاظت کے لیے تیار ہوں۔ پاؤں جادۂ راہِ وفا سے دشمن ہوں، آنکھیں کسی کی محبت اور بے بسی پر گر پڑ کر آنسو نثار کریں، تو یہ ہے زندگی۔ غالب کہتا ہے ؎

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

اس شعر کے ذریعہ اُس نے ہمدردی کا وہ سبق دیا ہے جو ایک انسان کی زندگی کو کامل بنانے کے لیے کافی ہے۔ انسان کی زندگی بغیر جذبۂ ہمدردی کے یقیناً نامکمل ہے کیونکہ یہی جذبہ مابین حیوان و انسان طرۂ امتیاز ہے۔ اس شعر میں وہ کسی خاص فرد یا قوم کی تخصیص نہیں کرتا بلکہ محبت کا ایک عالمگیر پہلو پیش کرتا ہے جو امتیازِ "ما و تو" کو بالکل فنا کر دینے والا ہے۔ اُس آدمی پر کس طرح لفظ "انسان" کا اطلاق کیا جا سکتا ہے جو اپنے اندر جذبۂ ہمدردی و ایثار کو فنا کر چکا ہو اور بنی نوعِ انسان کی تکلیف پر مدد دینے کے لئے آمادہ ہو جانا تو درکنار لفظی ہمدردی کو بھی کام میں نہیں لاتا اور پھر ہم کو یہی کہنا پڑتا ہے کہ "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا" ایسا شخص انسان صورت تو ضرور ہے لیکن انسان سیرت نہیں۔ حقیقت اُس کی کمینی فطرت اور زندگی اُس کی موت ہے لیکن اگر غالب کے مندرجۂ بالا شعر پر عمل کیا جائے تو آنکھ سے گرنے والا ہر ہر قطرہ زندگی کا ثبوت ہو جائے۔

"غم" اور "زندگی" یہ دو الفاظ ایسے ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ اس پردۂ دنیا پر ہم کو کوئی نظیر ایسی نہیں ملتی کہ کسی شخص نے کسی نہ کسی قسم کے غم کا تجربہ نہ کیا ہو۔ رنج و الم انسان کی زندگی کے جزوِ اعظم ہیں اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے کسی طرح انکار بھی نہیں کیا جا سکتا چنانچہ غالب کہتا ہے ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حیات و غم اس قدر ایک دوسرے سے متواصل ہیں کہ سوائے موت کوئی دوسری چیز ان دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کر سکتی جب تک انسان زندگی کی گھڑیاں گن رہا ہے اس وقت تک اُسے پیمانۂ الم کو بھی منہ سے لگانا پڑیگا۔ لیکن غم کی بوجھ سے تھک کے بیٹھ جانا، رنج و آلام میں ہمت ہارنا یقیناً بزدلی کے مترادف ہوگا۔ غالب ہم کو مصیبت میں رہکر زندگی کی دشوار گذار منازل کو طے کرنا سکھاتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

دنیا کے بحرِ بیکراں میں کشتیِ حیات کو غم و الم کے تھپیڑوں کے درمیان کامیابی کے ساتھ کھے لے جانا یہ ہے زندگی۔ شکایتِ رنجِ گراں نشیں کے بجائے وہ ہم کو قوتِ صبر آزما پیدا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ہمت و استقلال کو کسی حالت میں بھی ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے یہ اُن کے اشعار کے حرف حرف سے ظاہر ہے مصائب و آلام کا ہمت کے ساتھ مقابلہ کرنا اُس کے الفاظ الفاظ سے آشکار۔ غرض ہمدردی و محبت استقلال و ہمت کے وہ گراں بہا اسباق پیش کرتا ہے جو ایک انسان کو شاہراہِ زندگی کو کامیابی کے ساتھ طے کرنے میں کافی ساتھ دیتے ہیں۔ غم کو کس قدر خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

وہ نوحۂ غم کو بھی ایک دلچسپی کی چیز سمجھتا ہے۔ اگر نغمۂ شادی اُسے خوش کرنے کے لئے نہیں ہے تو وہ نوحۂ غم ہی کو ذریعۂ رونق بناتا ہے۔ اسی مضمون کو ایک جگہ اور کہتا ہے ؎

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

اُسے غم پست نہیں کرتا۔ بلکہ اُسے ہنگامہ سمجھ کر خوش ہوتا اور غنیمت خیال کرتا ہے۔ تجربۂ ہائے غم کے بعد وہ سراپا ساز آہنگ شکایت نہیں بلکہ گلچیں گلستانِ تسلی نظر آتا ہے وہ بجائے نڈھال ہونے کے اُسی غم کو اپنے لئے دلجمعی اور دلبستگی کا سامان قرار دیتا ہے۔

لیکن پھر بھی وہ اس عارضی زندگی کو جو اسے دی گئی ہے اور جو وہ ہمت و استقلال کے ساتھ بسر کرتا ہے حقیقی زندگی خیال نہیں کرتا۔ وہ اس مستعار زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں سمجھتا اور اس کی بلند نظر میں اُس کی کوئی وقعت نہیں۔ ایک جگہ کہتا ہے ؎

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

یہ زندگی جو ایک حباب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی غالب کی نظر میں سراسر سراب معلوم ہوتی ہے۔ وہ اس زندگی اور اس کی تمام لطافتوں اور رعنائیوں کو ہیچ خیال کرتا ہے۔ ایک جگہ اسی مضمون کو اور کہتا ہے ؎

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

عالم مع اپنی تمام رنگینیوں اور رعنائیوں کے غالب کے سامنے آتا ہے لیکن وہ اُسے ایک نظر کا دھوکا اور وہم خیال کرتا ہے۔ اس پر نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ وہ ایک غیر مستقل اور مستعار زندگی کو لذت آشنا بنانا نہیں چاہتا۔ ؏

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے

ایسی موہوم اور بے اعتبار زندگی سے دل لگانا جسے فنا کے تھپیڑے ایک دم میں برباد کر دیں غالب کے نزدیک بالکل بیکار اور لاحاصل ہے۔ وہ جیتا ہے۔ مرنے کی خاطر چنانچہ کہتا ہے :- ؏

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

لذت زندگی صرف خیال فنا ہی سے حاصل کرتا ہے منزلِ فنا اس کے لئے کس قدر شیریں ہے کہ اُس کا خیال ہی زندگی میں اُس کے لیے باعثِ زندگی ہے۔ وہ صرف اس خیال سے زندہ ہے کہ "جلوۂ برقِ فنا" کا نظارہ کرے گا اس کی یہی رعنائیٔ خیال اس کی پریشانیٔ خاطر رفع کرنے کے لیے کافی۔ اور یہی محشرِ خیال اس انجمن ناز میں اس کے لئے وجہ تسکین —

وہ حیاتِ زندہ کا قائل ہے۔ حیاتِ مردہ کا نہیں — حیاتِ زندہ اُسے عالی حوصلگی کا درس دیتی ہے اور حیاتِ مردہ پست ہمتی سکھاتی ہے۔ بلند ہمتی کو انسان کی عین فطرت سمجھتا ہے پست ہمتی اس کی نظر میں ذلیل و خوار ہے۔ وہ دیکھتا اور سمجھتا ہے کہ انسان کے دماغ میں قدرت نے وہ قوتیں ودیعت کی ہیں جو دنیا کی کسی اور شے میں نہیں — وہ انکو صحیح طور پر استعمال کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ صرف فضا میں سانس لینا زندگی نہیں ہے۔ حیات نام ہے جنبشِ پیہم کا

حیات نام ہے اُس انتھک سیال کا جو انسان کے جذبۂ انسانیت کو جلا بخشتی رہتی ہے۔ جد و جہد انسان کی زندگی کے دو اہم ستون ہیں۔ غالب کہتا ہے ؎

جو ترے بیداد سے ہی زندگی کی جان ہیں
سکون اور سکوت میں مزہ کہاں حیات کا

سکون اور خاموشی کے ساتھ تقدیر پر بھروسہ کرکے بیٹھنا یہ جینا نہیں ہے۔۔۔ بازوؤں کی قوت کو جہد اظہار کے لئے استعمال کرنا یہ ہے زندگی ۔۔۔ ہیجانِ عمل کی آتش کو تیز تر کرنا ہی مقصد حیات ہے ورنہ زندگی زندگی کہلانے جانے کی مجاز نہیں۔ درحقیقت انسان کی زندگی بغیر شورش اور عمل کے بیکار ہے حیات کا حقیقی لطف اسی وقت میسر آسکتا ہے جب کسی خاص مقصد کے تحت جوش اور سرگرمی کا اظہار کیا جائے۔

غالب نے حیات کے مختلف پہلوؤں پر اپنی رائے ظاہر کی ہے کہیں استقلال و صبر کی تلقین کرتا ہے تو کہیں شورش عمل کی تعلیم دیتا ہے۔ غرض کہ وہ کوئی کسر انسانی ترقی کی کوشش میں اٹھا نہیں رکھتا۔ تمام انسانی کمزوریاں ایک ایک کرکے محسوس کرتا ہے۔ زندگی کی حقیقی شاہراہ پر روشنی ڈال کر انسان کو اُسی پر چلنا سکھاتا ہے۔ انسانی ترقی اور تکمیل انسانیت کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ ایک ایک کرکے گنواتا اور پھر ان پر عمل کرنا بتاتا ہے وہ انسان کو طرح طرح کے جوش دلاکر زریں اصولوں پر کاربند ہونے کے لیے ابھارتا ہے۔ غرض وہ اپنے ان چند اشعار کے ذریعہ ایک ایسا مکمل درسِ حیات دے گیا ہے کہ جس کی پیروی کرنے والا مظہر انسانیت بن جاتا ہے اور لوگوں کی نظریں اُسی انسان میں صفاتِ انسانیت کو تلاش کرتی نظر آتی ہیں ۔۔۔

ہفتہ وار اخبار مستقبل جونپور

اپنی نوعیت کا واحد ہفتہ وار ہے، بلند پایہ علمی ادبی اور مذہبی مضامین کے ساتھ ہفتہ بھر کی اہم خبروں کا بھی مرقع ہے مستقبل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ہر ماہ کا آخری پرچہ اپنے خریداروں کی خدمت میں بصورت ماہنامہ پیش ہوگا، لکھائی چھپائی دیدہ زیب ہے مستقبل کی حیثیت کو دیکھتے ہوئے سالانہ چندہ کچھ نہیں صرف تین روپئے ششماہی عہ دو روپئے سہ ماہی ایک روپیہ، ماہ ذی الحجہ کی آخری تاریخ تک خریدار بننے والوں کو آٹھ آنہ کی رعایت دی جائے گی۔

ادارہ:- ضیاء اللہ محمد مشت ندوی، محمد ثناء اللہ ندوی، محمد فضیل ندوی،

خط وکتابت کا پتہ:- منیجر اخبار مستقبل جون پور

عالمِ یاس

شیلے کی ایک نظم "اسٹینزاز رٹن اِن ڈیجکشن نیر نیپلز" کا ترجمہ

احمد مجتبیٰ زیدی فیض آباد

دھوپ کی گرمی ہے مطلع صاف اور جل کا جوش — نیلگوں ننھے جزائر اور کوہِ برف پوش
کھولتا ہے شرح اور صبح کو سنہرا آفتاب — اک طرف غنچوں کے گرد بیتی ہے روحِ شراب
گونجتا یہ وقت ہے جس وقت ہر آواز نے — شور دریا نے ہواؤں نے پر پرواز نے
جذبۂ نا آشنا کا ساز دل میں بھر دیا — لطفِ تنہائی کو ان سب نے دوبالا کر دیا

شہر کچھ اور بعید کچھ سیوار ہے یوں پانی میں — جسم سیمیں پر نمایاں ہوتی ہیں جیسے رگیں
یوں چمکتی ہیں لبِ ساحل پہ موجیں بحر کی — ماہ پارے جیسے حل کر دے سمندر میں کوئی
اضطرابِ نغمہ اک پیدا ہے موجِ آب سے — آنکھیں خیرہ ہیں مری مہرِ منور تاب سے
بے سکون تنہائی میں میری یہ سب کچھ ہے خراب — بیکسی ہمدم کے یہ نقشِ مناظر ہیں بر آب

کیا کروں شیرازۂ جسمانی ہے بکھرا ہوا — قلب کو راحت نہیں تو یاس کا سیلاب چلا
بے نیازی عجزِ فقیرانہ بھی تو حاصل نہیں — درد کا احساس جس کو ہو نہ وہ دل نہیں
لطفِ الفت لطفِ شہرت لطفِ فرصت دادِ غم — پُر تسلی ہو رہا ان سے اور رہیں محرومِ رسم
زندگی جیسے کٹتے ہیں یارو ہنس کر جینے سے — اور یہی تریاق بنتا ہے ستم پر سینے سلف

مجھ کو مشکل ہاں و سوال پھر شوق سامان ہو گئیں — "مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں"
حیرتی میں لیٹا رہوں گا دیر تک میں خاک پر — طفلِ اک معصوم سے جو تھک گیا ہو کھیل کر
اور پھر رو کر اشکِ غم پلکوں پہ میں کچھ کم کروں — ہیں نے بے اندوہ کے طوفاں سے بیگانہ جنوں
مجھ پہ طاری موت کی سی نیند تب ہونے لگے — اپنے سانسے گرم ہیں یہ جسم ٹھنڈا ہو چلے

اور مرے تخیلِ خمرزدہ میں یہ جھنکری ہوا
اور دل کی راگ کو اپنی بنا جائے فضا!

افیونی

چودھری محمد علی

افیونیوں کا حال سننے سے پہلے تھوڑا سا افیون کا حال سن لیجئے اس میں نا مناسب ہے کوئی حرج نہیں ہو اس کے بعد افیونی کا حال سن کر جی بھر کے ہنس لیجئے افیون کا پودا آپ نے دیکھا ہے یہ ڈیڑھ سے چار فٹ تک بڑھتا ہے اور اس کے سرے پر سفید پھول لگتا ہے پھول کے بیچ میں ایک ڈونڈی ہوتی ہے پنکھڑیوں گرنے کے بعد ڈونڈی میں کسی نوکدار چیز سے لکیریں بناتے ہیں جس میں سے افیون رس کر ڈونڈی پر سوکھ جاتی ہے ڈونڈی کے اندر بیج ہوتے ہیں جس کو پوست کہتے ہیں ان سے ٹھنڈائی بنتی ہے اور دوسری طرح کھائی جاتی ہے۔ کبھی کبھی پھول لال ہوتا ہے آپ نے اردو شاعری میں لالہ کا ذکر سنا ہوگا اسی افیون کے سرخ پھول کو لالہ کہتے ہیں افیون سے بہت سی چیزیں نکلتی ہیں جو دوا کے کام آتی ہیں اس میں کئی طرح کی الکلی کی طرح کی ایسڈ ہوتی ہے اس کا ذکر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں!

بیہوشی کی دوا بھی اسی افیون سے بنتی ہے۔ افیون کے نقصانات دنیا کو بہت دنوں سے معلوم تھا اور لوگ اس کے روکنے کی کوشش کیا کئے مگر خاص کر چین میں اس کی کھپت بہت رہی اور لوگوں نے فائدہ کی وجہ سے اس کی تجارت کو روکنا پسند نہ کیا صرف ہندوستان سے ۱۰ کروڑ سالانہ تک کی افیون باہر گئی ہے ۱۸۷۰ء میں انگلستان نے صرف ٹرکی سے کچھ اوپر ۶۴ لاکھ کی افیون خریدی تھی جس سے طرح طرح کی دوائیں بنی ہونگی ۱۸۹۳ء میں ایک شاہی کمیشن مقرر ہوا اس میں آٹھ آدمی تھے ۱۸۹۵ء میں ان کی رپورٹ نکلی ۸ میں ۷ آدمیوں نے رائے دی تھی کہ افیون سے بہت نقصان نہیں ہے جن کا فائدہ تھا وہ اس کی تجارت کو کیوں روکتے مگر چین نے جہاں افیون کی کھپت بہت تھی قسم کھائی کہ افیون نہ کھائیں گے لڑائی کے بعد لیگ آف نیشنز نے بھی زور دیا کہ افیون کی کھیتی روک دی جائے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ چین اس وقت تک جاپان ایسے بہادر ملک کے سامنے اڑا ہوا ہے۔ اب لکھنؤ کے افیونی کی کہانی سنئے:۔

ہر جگہ کی کوئی نہ کوئی چیز مشہور ہوتی ہے۔ لکھنؤ کی انوکھی چیزوں میں لکھنؤ کا افیونی بھی ہے۔ چین نے گلہ بھر افیون کی ایسی آؤ بھگت کی کہ اپنے کو تباہ کر کے رکھ دیا مگر ایمان کی پوچھئے تو لکھنؤ کو اس کے ساتھ جو طفلی بھی کی اور ایسی آنکھ پھیری کہ جیسے کبھی جان پہچان ہی نہ تھی۔ ان تلوں تیل ہی نہ تھا گویا پرانی یادوں سے علاقہ توڑنے کی ایسی آنکھ پھیرائی ہندوستان نے بھی جیسا چاہئے ویسا نباہ نہیں کیا مگر اس میں ہندوستان کا بس نہ تھا اگر بیاہ تو بیگم کا وہ گھر اسہاگ رہا تو دوسروں کے ہاتھوں ایسا ہوا جیسے بعض گھروں میں ساس نندیں میاں بیوی میں پھوٹ ڈلوا دیتی

اُن میں اسی طرح اچھے والوں نے جہاں کہیں افیم اور افیونی کے
بیچ میں آکر اور کود دی اور دیے ایسے تاؤ دیتا رہے کہ اُسکا
مزاج سے نوبت بگاڑ تک پہونچی۔ بگاڑ سے بڑھی تو جھگڑا
چُکتا ہو گیا اگر بالکل ایسا نہیں ہوا تو بات اُس کے بعد جھگڑ
تو ضرور پہونچ گئی لکھنؤ کا افیونی اس کو پیار سے چنیا بیگم
کہتا تھا اگر مالوہ اس کا میکہ سمجھیے تو لکھنؤ کو اس کی سسرال
جانئے جہاں پہونچکر افیون نے وہ مزاج و مقام پایا جو دوسرے نشہ
کو نصیب نہیں ہوا۔ وہ سنری جگہ اگر کسی نے اس کو منھ لگایا تو
ڈبیہ میں گولی بنا کر رکھ لی بڑی بڑائی یہ کی کہ خدا امید کا پاؤ دور
اس پہل دیا اور وقت پر نگل گیا منہ بان کو مزا و طلاوہ حلق
تالو نے مزہ پایا کسی افیونی کی ایک ریوڑی کھو گئی وہ پیسہ
دو پیسہ کا تیل لایا اور چراغ جلا کر ریوڑی کو ڈھونڈنے لگا
لوگوں نے ہنسنا شروع کیا کہ میاں دمڑی کی ریوڑی اور دو پیسے
لیے پھرا کہ ایک دھیلے کا تیل جل گیا اتنے میں تو نہ جانے کتنی
ریوڑیاں آ جاتیں افیونی نے جواب دیا کہ جبھی ریوڑی گئی
تو کس کی تھی جیب میں اور پلی ہوئی ہیں وہ ریوڑیوں کا کام نہیں
سچ تو یہ ہے کہ کوئی بے رحم پالے تو دانتوں کے نیچے
رکھ کر چبا ڈالے بھلا یوں تھوڑی کھاتا ہیں تو اُس کو
زبان کے نیچے دبا کر اُس کو چوستا اور چپکا کر زبان سے
ادھر اُدھر کی ٹکیا بناتا پھر زبان ہی کی الٹ پلٹ سے اسکی
گولی بناتا اُس کو زبان کی نوک پر رکھتا وہ گولی منھ بھر میں
پھر پھیل جاتی گھومتی اُس کا رس گھل گھل کر حلق میں
جاتا جیوں جیوں گولی چھوٹی ہوتی جاتی پیارا مزہ بڑھتا جاتا
آپ جانئے ہماری یہ چنیا بیگم کی نفاست پسندی تھی جب اس کا
یہ پیار تھا تو اصل چنیا بیگم کی آؤ بھگت کتنی ہوتی ہوگی لکھنؤ میں
افیون کی گولی نگلنا بدتمیزی سمجھا جاتا تھا بعض ہوا لوگ اس کو
گھول کر پیتے تھے افیون کا گھولنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں تھا۔ پکی نہ
زور سے پھیرے نہ آہستہ سے پھیرے گولی انگوٹھے اور دو
انگلیوں کے درمیان میں آ جائے جیسی پانی میں یوں ڈوبے کہ
گولی انگلیوں میں برابر گھومتی رہے اور پانی کا رنگ گہرا
ہوتا جائے مگر جو گالی یعنی افیون کی کیٹ پانی میں نہ ملنے
پائے وہ گھلی ہوئی افیون کو خون کبوتر کہتے ہیں اگر افیون
کم ہوئی یا پانی زیادہ ہوا تو رنگ چوکھا نہیں آ سکتا افیون
کا گھولنا ایسوں ویسوں کا کام نہیں تھا کہ کٹا اور لے دوڑی۔

رستم سے ذرا کہہ تو سر تیغ تلے دھر دے
یہ کام نہیں کہ جو ہر کارے دہ ہر مردے

یہ تو وہ افیون ہوئی جو بندھے ٹکے پر وقت پر پی جاتی
تھی نا وقت کی افیون کو چسکی کہتے تھے یہ بڑے مزے
کی چیز تھی جب یار دوست اکٹھا ہو گئے تب ہی چلنے لگی
افیون کو لوگ کہتے ہیں کہ سب بیماریوں کی دوا ہے اور خود
بیماری ہے یہ بات تو حکیم ڈاکٹر جانیں ہم نے تو یہ دیکھا ہے
کہ افیونی میں بہت سی باتیں ایسی ہو جاتی ہیں جو بے افیون
کھائے دوسرے میں نہیں دکھائی دیتیں باتوں میں نرمی۔
آپس میں میل محبت غصہ کے اوپر پورا قبضہ۔ چال میں نرمی بھی
والی دوسرے کو کہاں نصیب ہے انگلستان کے مشہور ادیب
ڈی کوئنسی لکھتے ہیں کہ افیم کھا کر مجھکو سب سے زیادہ مزہ
اسمیں آتا تھا کہ شہر کی گلیوں میں پھر کر غریبوں کی حالت
دیکھکر میرے دل میں ہمدردی اور نرمی پیدا ہو جاتی تھی افیونی
کی چال میں وہ ہلکا پن ہوتا ہے کہ دھمک کیسی آدمی پاؤں
کی آہٹ نہ پائے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے غبارے پہ بیٹھے

چلے جاتے ہیں بھنگ کے نشے میں یہ عیب ہوتا ہے کہ خیالات
پر قابو رکھنا نہیں مگر جس کے خلاف اُمنگ تو نشے ہی چلے جاتے
ہیں اگر کسی کی باتیں دماغ میں تھیں تو وہی کہہ دیا۔ فرانس
کے مصنف ڈلیر نے یہی لکھا ہے انہوں نے ایسا نہیں بیان
جس طرح کی بات جو ہو وہی دماغ میں آ گئی پھر اپنے بس میں
کوئی عشق و محبت کے خیالات کا بیکو ہا بیگا۔ افیونی کو بھی
بہت ہوتی ہے کہ کھانے میں وہ مزہ آتا ہے کہ بادشاہ کو
نصیب نہیں۔ آصف الدولہ بہادر لکھنؤ کے نواب جن کی سخاوت
مشہور ہے ان کا نام لیکر لکھنؤ کے دوکاندار آج تک صبح کو
دوکان کھولتے ہیں ان کے وقت میں بہت سے نشے باز اور
افیونی جو کسی کام کے نہ رہ گئے تھے مفت کی تنخواہیں اور
کھانا پاتے تھے کیونکہ بادشاہ کا فرض تھا کہ اپنی رعایا کی ہر طرح
کی خبر لے۔ آصف الدولہ کے بعد سعادت علی خاں بیٹھے۔ یہ
بڑے منتظم تھے انہوں نے دیکھا کہ بہت سے ہٹے کٹے تندرست
مفت خورے نشہ بازی کا بہانہ کرتے ہیں کام کاج کے
نکھٹو بنا کرتے ہیں رات کو افیونیوں کے اوپر پہرا مقرر
کروا کر کوئی کھانے نہ پائے۔ بہتوں نے توبہ کر لی سیدھے
ہو گئے کتنوں نے بادشاہ کو صلواتیں سنائیں کچھ ایسے بھی
تھے جنہوں نے بادشاہ کا حکم نہ مانا اور خوب کھایا صبح کو
سب کا حال بادشاہ سے بیان کیا گیا جن لوگوں نے ضبط کر لیا
تھا ان کی تنخواہیں بند کر دی گئیں کہ یہ پکے افیونی نہیں ہیں
اگر چاہیں تو اپنی محنت سے روزی کما سکتے ہیں باقی لوگوں
کی تنخواہیں بحال رہیں کیونکہ یہ بیچارے بیکار اور بے بس تھے
افیمچیوں کی بھلی ایسی ہوتی ہے کہ دوپہرے افیم کر بڑے اچھے ہیں
آج کی چیزیں بنانے میں کمال ہوتا ہے لیکن افیونی جو بھی

تھوڑے دن ہوئے مرے ہیں کانے تھے کسی نے پوچھا کہ آنکھ
کیسے گئی کہنے لگے کہ نواب صاحب کے یہاں مصاحب تھے جام
تھا سر شام پینڈا جھیل رہے تھے کہ پنک آ گئی اور منہ کے بل
سر پونڈے سے پار ہا جو آنکھ میں گھس گیا ان لوگوں میں میل
محبت کا یہ حال ہے کہ اگر مٹھائی کی ایک ہی ڈلی ہے تب بھی
جتنے یار دوست ہیں ذرا ذرا چکھ لیں گے کل کھلا کر پاس
ذرا نے پاس لگا اپنے پیارے ایک دوسرے سے باتیں کریں گے
تاکہ میں بولیں گے ماشاء اللہ کتنا ہو گا تو والا ان کہیں گے آغا
کرا نعمان کہیں گے مجھے وار باتیں ایسی ہوں گی کہ دل موہ لیں
داستان کہنے پر آ گئے تو سماں باندھیں گے کہ آنکھوں کے
سامنے چلتی پھرتی تصویریں دکھائی دیں اگر پنک میں آ گئے
تو گھنٹہ دو گھنٹہ کی خبر لی پھر کیا مجال جو کوئی یار دوست ٹوکا
دے کر جگا دے بچے کا سونا اور سوتے میں اس کا مسکرانا
دیکھ کر ماں کیا خوش ہوتی ہے۔ ایک افیونی دوسرے کی پنک
سے باغ باغ ہو جاتا ہے اور پنک والا بھی جب جی چکا تو
باتوں کا سلسلہ وہیں سے شروع کر دیا جہاں سے پنک
آئی تھی کیا ممکن جو داستان کے لشکر سے کہیں سے
بھول آ جائے۔ سردی کی تکلیف ان لوگوں کو بالکل نہیں معلوم
ہوتی قصہ مشہور ہے کہ دو افیونی سو رہے تھے ایک نے
کروٹ لی اور دھم سے زمین پر آ رہا گرنے کی وجہ سے چونک
تو پڑا اگر پھر بھی اپنی جگہ پڑا رہا دوسرے سے پوچھنے لگے۔
"ارے آغا صاحب یہ دھماکا کہاں ہوا؟" دوسرے نے کہا کچھ نہیں
دالان تم چارپائی پر سے گر پڑے ہو اور تم کو خبر نہیں ہوئی یہ سن کر
کہنے لگے ماشاء اللہ سچ کہا تم نے بڑی چوٹ آئی جس طرح پنک
میں وقت کا پتہ نہیں چلتا اسی طرح نشے میں فاصلے کا پتہ بھی

غائب ہو جاتا ہے۔ ایک افیونی کی عادت کہ چلم بھرنے کے لیے آگ کی ضرورت ہوئی چلم پکڑ لئے، گھر آگ لینے چلے دروازے سے نکلتے ہی سڑک کی بڑی دور کی لالٹین سے کوئلہ جلانے لگے اور ایک ایک کر کے سب کوئلے پھینک دیئے کہنے لگے ڈاکو، ابے مجھے کوئلے نہ دیکھے دسے اور خالی چلم لئے گھر چلے آئے اسی طرح ان لوگوں کو اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہیں رہتا ایک افیونی کی گھولی ہوئی افیم چوہا آکر پی جاتا تھا چوہے کے افیون پینے پر آپ تعجب تو کیجئے جیسا کہ منی کے چوہے سیانے مانے جاتے ہیں تو افیونی کے گھر کے چوہے افیونی کیوں نہ ہوں انیسویں صدی کے آخر میں جب لکھنؤ کے چنڈو خانے قانوناً بند کر دیے گئے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ ان مکانوں میں نہ معلوم کتنی چھپکلیاں اور چوہے جنھوں نے چھت میں بلیں بنا لیں تھیں مر گئے۔ ان کو ہمیشہ سے چنڈو کے دھوئیں کی عادت ہو گئی تھی آدمیوں نے اپنی جان بچانے کی کوئی نہ کوئی ترکیب نکال ہی لی مدک پینے لگے افیون ترک کر دی اپنی اپنی ہڈیاں الگ الگ رکھ لی جانور بیچارے کیا کرتے ان کی جان پر بن گئی! ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ایک افیونی کی گھولی ہوئی افیون چوہا آکر پی جاتا تھا ایک دن اسکو پکڑنے کی تاک لگائی پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھے اور پلنگ کے نیچے افیون کی کٹوری رکھ دی حقہ کا چلم سامنے سے نکال کر پلنگ پر رکھ دیا کہ اسی سے پکڑیں گے! پینک سے چونکے تو اپنے پاؤں کے انگوٹھے کو چوہے کا سر سمجھے آہستہ آہستہ جلتا ہوا چلم اٹھایا اور بہت پھرتی سے جھک کر انگوٹھا پکڑ لیا جلتا ہوا چلم کھال کے اندر اتر گیا۔ بے چین ہو گئے کہنے لگے کاٹ کمبخت کاٹ اگر میں چھوڑنے کا نہیں۔ افیونی کی دنیا ہی دوسری ہوتی ہے۔ لکھنؤ میں عیش باغ کا میلہ انکے زمانہ میں بہت مشہور چیز تھا یار دوست جمع ہوتے تھے جوتے پڑتے تھے ہر طرح کے لوگوں کی ٹکڑیاں الگ الگ جمتی تھیں دوپہر سے لیکر بڑی رات گئے تک رنگ جما رہتا تھا ایک افیونی نے دوسرے افیونی سے کہا آؤ ناں عیش باغ کے میلے چلتے ہو؟ اس نے کہا یار چلیں گے مگر ہم بھیڑ میں بچھڑ جائیں گے اس نے کہا بھلا وہاں ایک دوسرے کو ڈھونڈے کیسے لیں گے؟ اس نے کہا ہاں ہم بتائیں مٹی کی قندیلیں بکتی ہیں ایک کہو ہاں تو بس ایک قندیل لے لینا وہ ڈور ڈال کر دیا اور جلا کر گلے میں لٹکا لینا ہم جب آئیں گے تم کو دور ہی سے جان لیں گے پہلے دوست نے یہی کیا مگر گلے میں قندیل لٹکائے لٹکائے تھک گئے اس کو اتار کر ایک پیڑ کی ڈالی میں لٹکا دیا اور خود تھوڑی دور پر دوسرے پیڑ کی ٹیک لگا کر دوست کا راستہ دیکھنے لگے پینک آ گئی جب پینک سے چونکے اور اس قندیل کو دور سے دیکھا سب باتیں یاد آ گئیں کہنے لگے "اب بھی ہمارا دوست ہم کو نہ پہچانے تو غضب ہے وہ سامنے ہم کھڑے ہیں! — اب تو مکتبوں کا رواج ہی اٹھ گیا نہیں تو ہر جگہ مکتب تھے محلے میں دو دو تین تین مکتب ہوتے تھے ان مکتبوں میں اگر لڑکوں کی خوش قسمتی سے افیونی مولوی صاحب ہوئے تو لڑکوں کی چاندی تھی ایک مولوی صاحب مکان کے قریب ہی پڑھاتے تھے ایک دن ان کے شاگردوں نے آ کر حال بیان کیا کہ مولوی صاحب ہاتھ میں حقہ لئے ٹہل ٹہل کر پی رہے تھے کہ ایک شاگرد نے تختی دکھائی دوسرے ہاتھ میں تختی لے لی اور دیکھنے لگے دیکھتے دیکھتے پینک آ گئی ذرا دیر میں چونکے تو حقہ پھینک دیا اور کہنے

لگے بہت خوب کہی پیچھے سے ایک لالہ جی حقے کی نے منہ میں لگا کر جھک کر طرح بیٹھ گئے۔ افیون کا اثر دیکھا گیا ہوتا ہے کہ آدمی پانی سے ڈرنے لگتا ہے یہ لڑکپن میں ایک افیونی تھے بہت زمانہ ہوا بیچارے مرگئے مگر مرتے دم تک نہیں نہائے خود کہتے تھے کہ اپنے بس بھر تو پانی نہیں چھوا ہے مرنے پر دوسرے نہلاویں تو نہلا دیں اگر آپ ان کو دیکھتے تو آپ کے دعوے میں شک نہ کرتے تیس چالیس برس کا زمانہ ہوتا ہے ایک انگریز کلاں صاحب بستہ پہ افیونی باتیں کر رہے تھے انھوں نے چھیڑنے کے لیے کہا کہ سرکار افیون کی کاشت روکنے والی ہے بس پھر کیا تھا جتنے افیونی اس جگہ تھے بپھر پڑے! ان لوگوں کو غصہ سے کیا واسطہ مگر اس خبر کو سنتے ہی بیتاب ہو گئے کہنے لگے سرکار اس دھوکے میں نہ رہے اگر ایسا کیا تو بڑی گھمسان لڑائی ہوگی! ہاں جب افیم ہی نہ رہی تو جی کے کیا کریں گے۔ بی چنیا بیگم نے بیچنے پر تین حرف! مجھے کیا ہو توپ کے منہ میں ڈال دیں پر ارے کوئی پیچھے ہٹنے والے ہیں۔ ان صاحب نے کہا سرکار نے اس کا انتظام پہلے ہی سے کر لیا ہے آگ بجھانے والے انجنوں میں برف کا پانی بھروا کر دور ہی سے وہ فرّانے ماریں گے کہ آپ لوگ توک دم نکل جائیں گے۔ یہ سن کر سب کا جوش ٹھنڈا ہو گیا آنکھوں میں آنسو بھر آئے کہنے لگے لو یہ کوموت ہی کا سامنا ہے! ــــ جاڑوں میں اور یا یوں ان اور دوسرے ملکوں میں بہت دنوں سے ہے مگر لکھنؤ نے اس کے دھوئیں کو ٹھنڈا اور پانی سے بھرا اچھا بنانے کی ترکیب دوسری نکال ہی لی۔ چنڈو کا دھواں گرم ہوتا ہے لکھنؤ کی مدک ستی کے حقہ پر پی جاتی ہے جس کا دھواں پانی میں سے ٹھنڈا ہو کر منہ میں آتا ہے چنڈو میں جلی افیون کی چراند ہوتی ہے مدک میں افیون کو آگ پر گلا کر جنگلے پان کے پتوں میں لت کرتے ہیں اور چلم کو توڑ کر چھوٹی کر لیتے ہیں اس پر پیتے ہیں اس کا سوندھا دھواں اپنی ہی مہک رکھتا ہے کوئی چلم کو اسے محبت کے مہر دکھتے ہیں۔ افیونی چاہے فرانس کا ہو یا انگلستان کا چین کا ہو یا ایران کا یا جنت نشان ہندوستان کا سب کے سب ایک بات میں ہم خیال ہیں یعنی یہ دنیا ہم کو پسند نہیں اگر بس چلتا تو اسکو بگاڑ بگاڑ کر عمر خیام کی طرح ایک دوسری دنیا بناتے جس میں درد نہ ہوتا تکلیف نہ ہوتی اور تخیل کے مزے ایسے ہوتے کہ زمین پر ہی بیٹھے بیٹھے آسمان کی خبر لایا کرتے!

(بہ اجازت ڈائرکٹر صاحب آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

ضروری اطلاع

۱- ہماری اپنے لکھنے والوں سے گذارش ہے کہ وہ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھیں کہ تمام افسانے اور نظمیں ہمارے "افسانہ نمبر" کے لیے ۱۰ دسمبر تک دفتر میں پہونچ جائیں۔

۲- "افسانہ نمبر" ۱۰ جنوری ۱۹۴۲ء کو شائع ہوگا۔ ہم اپنے خریداروں سے اس دیری کی ابھی سے معافی چاہتے ہیں۔ "افسانہ نمبر" اگر پندرہ تاریخ تک نہ پہونچے تو ہمیں ایک خط لکھئے اور ساتھ ہی اپنے ڈاکخانہ کو بھی اطلاع دیجئے۔

مینیجر

کلامِ سائل

نواب سراج الدین احمد خان سائل دہلوی جانشین حضرت داغ مرحوم

ہمیں کو منتخب فرمائینگے دل دیکھنے والے
ہمیں ہیں جوہرِ شمشیرِ قاتل دیکھنے والے

ستمگر ہیں بہت کم رقصِ بسمل دیکھنے والے
جگر سے ہاتھ دھو لیں جو نہیں دل دیکھنے والے

یہی گر جلوہ ریزی ہے جو گنڈی اہلِ عرفاں پر
کرینگے بات بھی تم سے بمشکل دیکھنے والے

تقاضائے دل و دیدہ ہے معقولِ ادا ہونا
ہیں دونوں جان اندازہ قاتل دیکھنے والے

نہ قیس ناقہ باقی ہے نہ دشتِ نجد میں مجنوں
اُٹھائیں پردۂ بے چاکِ محمل دیکھنے والے

ہمجو سے بے تعلق ہے ہماری بادیہ گردی
نہیں نقشِ کفِ پا اپنی منزل دیکھنے والے

لئے بیٹھے ہیں آئینہ بغل میں یہ تمنا ہے
کہ تجکو دیکھ لیں اُس کے مقابل دیکھنے والے

جوابِ لن ترانی پر نہ تیور ڈھیل کر لینا
مزا تو جب ہے جب ہو جائیں قائل دیکھنے والے

یہی دم خم دکھائے تیغِ ابرو نے اگر تیری
کہیں گے دیکھ لیجیو مجکو قاتل دیکھنے والے

بتوں کو مات کرتے ہیں ترے مشتاقِ نظارہ
خبر محفل کی لے تصویرِ محمل دیکھنے والے

تمہیں کیوں بن دکھائیں کیوں ہی ایسوں پہ صدقے دو
بڑے ہیں مانگنے والے بڑی دل دیکھنے والے

جنہیں آنکھیں خدا نے دی ہیں اُن سے چھپ نہیں سکتے
تمہیں پہچان لینگے صاف سائل دیکھنے والے

کارل مارکس کی رومانی زندگی

ملک سلمان الارشد۔ فاروقی

سوشلزم موجودہ دور میں ایک خاص اہمیت حاصل کرچکا ہے۔ اور اس کے معتقدین کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ سوشلزم کو یہ مقبولیت جن ہستیوں کی بدولت حاصل ہوئی۔ ان میں سے کارل مارکس کا درجہ سب سے بلند و برتر ہے اور اسی وجہ سے کارل مارکس کو "سوشلزم کا پیغمبر" کہا جاتا ہے۔ محبت جو ایک فطری جذبہ ہے اس کا شکار کارل مارکس بھی ہوا۔ اور اس کی محبت بہت دلچسپ اور پُرکیف ہے۔

جس زمانہ میں کارل مارکس برلن یونیورسٹی میں فلسفہ اور قانون کی تعلیم حاصل کر رہا تھا اس وقت اُس کی شناسائی ایک نوجی انسو ویسٹ فیلسن سے ہوگئی۔ اور رفتہ رفتہ وہ ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے ویسٹ فیلسن کی لڑکی گینی اپنے حسن و خوبصورتی کی بنا پر ایک خاص شہرت کی مالک تھی۔ اس کی نرگسی آنکھیں۔ پتلے پتلے نازک ہونٹ۔ ستواں ناک۔ گہرے سرخ گلاب کے مانند رخسار۔ ہزارہا نوجوانوں کو اپنا گرویدہ بنا چکے تھے

کارل مارکس اپنے دوست کے ہمراہ اس کے گھر جایا کرتا تھا۔ اور اس طرح سے اس کا تعارف گینی سے ہوگیا اور اس کے حسن کا جادو کارل مارکس پر بھی چل گیا۔ اور وہ بہت بری طرح سے اُسکے تیرِ نظر کا گھائل ہوگیا۔ مگر گینی نے کوئی توجہ نہ کی۔ لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ کارل مارکس اس کی پرستش کرتا ہے تو وہ اسے حقیر سے دیکھنے لگی۔ مارکس ابتدا ہی سے حساس واقع ہوا تھا۔ اس لئے وہ گینی کے اس طرزِ عمل سے بہت متاثر ہوا۔ اور اسی اثر کی بنا پر اس کی شاعری کا آغاز ہوا۔

عوام میں مشہور ہے کہ ویسٹ فیلسن نے کارل مارکس کو شاعر بنایا۔ حالانکہ اس کی شاعری کی بنیاد گینی کے تغافل کی بنا پر ہوئی۔ مارکس جب کوئی تازہ نظم کہتا تو وہ ویسٹ فیلسن کو ضرور سناتا۔ کیونکہ اس طرح سے گینی بھی اسے سن لیتی تھی۔ ایک روز شام کے وقت وہ اپنی تازہ نظم لے کر گیا۔ اتفاق سے ویسٹ فیلسن وہاں موجود نہیں تھا۔ کارل مارکس نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر گینی سے اظہارِ محبت کر دیا۔ گینی اس اظہار پر بہت افروختہ ہوئی۔ اور اسے سخت و سست کہا اور اسی وقت گھر سے نکال دیا۔

بیچارا مارکس اس سانحہ سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اسنے اُن تاثرات کو فوراً نظم میں منتقل کر دیا۔ دو تین روز بعد جب ویسٹ فیلسن اسے اپنے گھر لے گیا اور کوئی نئی چیز سنانے کی فرمائش کی تو مارکس نے وہ نظم جس کا عنوان اس نے "مفلس کا اظہارِ محبت" رکھا تھا۔ ایک خاص پُرسوز لہجہ میں سنانا شروع کیا۔

مفلس!
دنیا کا ٹھکرایا ہوا ہیرا ہے۔
جس کی آب و تاب سے لوگ ناواقف ہیں
اس کے پاس جذبات ہوتے ہیں، انمول پاکیزہ
آہیں ہوتی ہیں۔
اور کچھ ظلم کی داستانیں!
جن کے بوجھ سے اس کی روح دبی ہوتی ہے۔
لیکن اس روحی اذیت کے باوجود وہ نہایت خوش
اور بشاش رہنے کی کوشش کرتا ہے۔
اگرچہ اس کا دل مرجھایا ہوتا ہے۔
مگر — کبھی ایک لطیف کرن اس کے غمگین ظلمات
دل کو منور کر دیتی ہے
اس کرن کا نام
محبت ہے!
وہ مسرور رہتا ہے۔
اس نعمت کے مل جانے پر!
اس وقت وہ اپنے افلاس کو بھول جاتا ہے۔
اور ایک عام انسان کی طرح اپنی تمنا کا اظہار
کر دیتا ہے۔
مگر — مغرور حسن!
جو دولت و حشمت کا طالب ہوتا ہے۔
اُسے ٹھکرا دیتا ہے۔
اور اسی لیے مفلس کا محبوب اس کی تحقیر کرتا ہے۔
مضحکہ اڑاتا ہے۔
نفرت کرتا ہے

لیکن افسوس!
وہ انسانیت کی قدر نہیں کرتا۔
وہ روح کی پاکیزگی کو نہیں دیکھتا۔
وہ ان گہرائیوں تک نہیں پہونچتا جو انسان کو انسان
بناتی ہیں۔
شاید حسن مفلس کے لیے اندھا ہوتا ہے
کیا ایک مفلس کو۔
محبت کرنے کا حق حاصل نہیں!
محبت جو ایک ایسا دریا ہے جس کا پانی سب پیتے ہیں
اُس پانی کے پینے کے لیے امیر اور غریب کی
تمیز کیسی؟
جو پیاسا ہو پانی پیے۔
کیونکہ پیاس لگنا ایک لازمی امر ہے
محبت قدرت کی طرف سے عطا کیا ہوا ایک انعام ہے
اور اس کا عطا کرنے والا
ایک بہت بڑا بادشاہ ہے۔
شہنشاہوں کا شہنشاہ!۔
بادشاہوں کا پیدا کرنے والا۔
دولت و حشمت بخشنے والا۔
اس لیے اے محبوب!
تو مفلس کی محبت کو نہ ٹھکرا!
کیونکہ اس طرح تو ایک گناہِ عظیم کا مرتکب ہوگا۔
دیکھ وقت ہے جاگ۔
دل کی آنکھ سے دیکھ!!
جس وقت کارل مارکس یہ نظم پڑھ چکا۔ تو اُس —

محسوس کیا کہ اس کے دل پر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے گینی اس تذکرے کو سن کر اس قدر مسرور ہوئی کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ویسٹ فیلن نے مارکس کو بہت داد دی۔

کارل مارکس کا یہ تحفہ بارگاہ حسن میں قبول کر لیا گیا اور گینی اس کی طرف ملتفت ہوئی تھی۔ نتیجہ یہ کہ گینی اور مارکس ایک دوسرے سے ملنے لگے گینی پر مارکس کی صحبت کا یہ اثر ہوا کہ اس کے تمام خیالات کارل مارکس جیسے ہو گئے ایک روز جب کارل مارکس اپنے نظریات پیش کر رہا تھا گینی نے بے اختیار مارکس سے کہا۔

"پیارے مارکس! آخر تم اپنے خیالات کی اشاعت کیوں نہیں کرتے۔ وہ دنیا کے لیے انمول جواہر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیا تم ڈرتے ہو کہ سرمایہ دار تم سے خفا ہو جائیں گے اور تم مصیبتوں میں گھر جاؤ گے؟ مگر مارکس! دلیری مرد کا زیور ہے۔ اور جس کے پاس یہ زیور نہیں وہ مرد نہیں ہے۔ بلکہ عورت سے بھی بدتر ہے اور ہیجڑے کے مقابلے سے بھی اس کی وسعت کم ہے"

مارکس نے اس موقعہ کو غنیمت جانتے ہوئے آخری مرتبہ قسمت آزمائی اور کہا۔

"گینی! مصیبت سے میں نہیں گھبراتا بلکہ مجھے ایک شریک کار کی ضرورت ہے۔ جو ایام مصیبت میں مجھے ہراساں نہ ہونے دے۔ ورنہ میرے پائے استقلال میں لغزش آ جائے گی۔ اور میں اپنے خیالات کی اشاعت نہ کر سکوں گا۔ مگر میرے شریک کار کے خیالات بھی میرے ہی ایسے ہوں اور اگر ایسا شریک کار مجھے مل جائے تو گینی! میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ ضرور! ضرور!

گینی! تم اس معاملہ میں میری مدد کر سکتی ہو۔ دنیا میں شاید تم ہی ایک ایسی ہستی ہو جو میری شریک کار بن سکتی ہے گینی! معاف کرنا میں نے سچائی کا اظہار کر دیا"

گینی مارکس کی شخصیت سے مرعوب ہو چکی تھی دوسرے وہ اس کے خیالات کی خواہاں تھی۔ اس لئے وہ کارل مارکس کی شریک کار بننے پر آمادہ ہو گئی ——

منگل کے روز ٹریلیس کے گرجا میں کارل مارکس اور گینی ایک دوسرے کے ہو گئے —— !

"افسانہ نمبر"

ہم اپنے افسانہ نمبر کے لیے ہندوستان کی چوٹی کے لکھنے والوں کے افسانوں اور نظموں کی امید کرتے ہیں چند لکھنے والوں کے نام حسب ذیل ہیں تنقیدی مضامین۔ حضرت فراق گورکھپوری جناب اقبال انصاری ایم۔ وغیرہ افسانے۔ جناب علی عباس صاحب حسینی۔ جناب عمر علی صاحب جناب اطہر انصاری صاحب۔ جناب حیات اللہ صاحب انصاری۔ جناب احتشام حسین صاحب رضوی۔ جناب تارا شنکر صاحب ہنس و جناب علی سردار صاحب جعفری جناب مسیح الحسن رضوی محترمہ شفیق بانو وغیرہ وغیرہ ڈرامے۔ جناب خان بہادر نواب جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی جناب جاہت علی صاحب سندیلوی نظمیں۔ حضرت جوش ملیح آبادی حضرت جگر مرادآبادی حضرت ساغر نظامی جناب خان بہادر نواب جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی عالیجناب مہدی علی صاحب منتخب حضرت اسرار الحق صاحب مجاز۔ حضرت سرور شاہجہانپوری جناب علی سردار صاحب جعفری وغیرہ وغیرہ

غزل

منظور حسن شور
ایم۔ اے، ایم۔ ایل اے
ایل۔ ایل بی۔ ایم۔ اے

ہوئی نہ وجہ سکوں چشم تر کی چارہ گری
رہی چھلک کے بھی مینائے دل بھری کی بھری

بتا تو اے دلِ وحشی یہ ماجرا کیا ہے
یہ اضطرابِ مسلسل! یہ سوختہ جگری

یہ میری آنکھ میں آخر کہاں کی آئی تری
چھلک چھلک کے بھی ہے چشم تر بھری کی بھری

یہ کس کے گریۂ شب کا اثر ہے وقتِ سحر
کہ ہے ستارہ بھی اشکِ چکیدۂ سحری

حریفِ برقِ تجلی نگاہ شوق کہاں
حریم حسن میں کس کو مجالِ دیدہ وری

ہزار سجدۂ دیر و حرم سے بہتر ہے
اک آہِ نیم شبی، ایک گریۂ سحری

سکونِ دل بھی ہے اِک اضطراب کی صورت
جنونِ شوق نہیں آشنائے چارہ گری

جو تم ملے تو کچھ اپنا پتہ نہیں ملتا
فغانِ نیم شبی ہے نہ گریۂ سحری

اک آہ کھینچ کے اے شور اٹھ گئے وہ بھی
میں ختم کر نہ سکا شرح سوختہ جگری

سوزِ ناتمام

ماہر القادری

وہی عقل کی پرستش، وہی حوصلے کی خامی
نہ وہ جراتِ کلیمی نہ وہ ذوقِ ہمکلامی

مرے روز و شب کی فطرت جو بدل سکو بدل دو
کہ نہیں قبول مجھ کو مہ و مہر کی غلامی

مرے حالِ مضطرب پر ابھی ہنس رہی ہے دُنیا
ابھی ڈھیل دے رہا ہے مرا سوزِ ناتمامی

میں زبان سے کیوں کہوں کچھ مری خامشی ہے سب کچھ
مری ہر نظر گذارش، مرا ہم نفس پیامی

مرے سوزِ دل کی قیمت فقط اک نگاہِ اُلفت
ترے دردِ دل کا سودا ابھی عشرتِ غلامی

نئے کارواں کی فطرت ہے تمام تر سیاست
نہ حُدی کی اب ضرورت نہ وہ ذوقِ خوشخرامی

مجھے زندگی کی خاطر نہیں ذلتیں گوارا
مجھے راحتیں مصیبت مجھے موت ہے غلامی

مجھے کیا پیام دیگی تری زندگی کی دُنیا
کہ فنا کی وادیوں میں مجھے دی گئی سلامی

مجھے ڈر ہے کا جنوں کو نہ خرابِ جہل کر دے
یہ غرورِ عقل و دانش یہ جنونِ پختہ کامی

مرے دل نے آج ماہر کوئی چیز اُن سے مانگی
بہ نگاہِ مستِ خسروؔ بہ سرورِ قلب جامیؔ

عورت

حکیم چودھری سراج احمد دریابادی

عورت کائنات کا ایک دلکش فریب ہے جس کی حیات رنگین کے ایک ایک ذرہ میں صدہا جاذب نظر اور مرکز توجہ رعنائیاں ہیں جو دنیا والوں کو دعوت نظارہ و ترغیب پیش دیتے رہتے ہیں حسن و شباب کے یہی وہ حجاب آسا لمحات ہیں جن پر مرد کی خودداری و استغناء کی ہمیشہ بھینٹ چڑھائی جانے والے جانتے ہیں کہ راز نسواں کا محرم ہونا ہر شخص کے بس کی بات نہیں اس لیے کہ اس کے عناصر زندگی میں فطرت کے وہ رموز پنہاں ہیں جن سے اگر انسان باخبر ہو جائے تو کائنات کی ہزاروں حقیقتوں کا خود بخود انکشاف ہو جائیگا اور یہی وہ مسئلہ ہے جس کا حل قیامت سے پہلے مصالح قدرت کے خلاف ہے ورنہ پھر نہ یہ دنیا رہیگی نہ دنیا والے۔ سچ تو یہ ہے کہ حقائق نسواں کی ہمہ گیر اور فاتح فطرت کا تحمل آدمی نہ کر سکے۔ نسوانیت کا یہ ادنی کرشمہ ہے جس نے آدم کو ارتکاب گناہ پر آمادہ کر دیا۔ یہ شیطان کا نفسیاتی تجربہ تھا کہ عورت کو جس چیز سے حکماً روکا جائے اس کے دل میں اسی کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ شیطان نے اسی فطرت سے فائدہ اٹھا کر رغبت دلائی ہوگی اور شجر ممنوعہ کی طرف پہلا ہاتھ حوا نے بڑھایا ہوگا آدم نے محبت سے مجبور ہو کر الزام اپنے سر لے لیا اس طرح یہ انکا وہ اعتراف شکست تھا جس کی سنت لطیف پر آج بھی حوا کی بیٹیاں فاتحانہ اور آدم کے بیٹے مفتوح و مجبور بکمر خوش و مطمئن عمل کرتے چلے آتے ہیں حالانکہ اس شکست کی مصالح خداوندی خود متقاضی تھی اس کو ایک ایسی دنیا بنانی تھی جو نغموں سے بھرپور مسرتوں سے ہمکنار رنگینیوں سے معمور اور حسن و محبت سے مخمور ہو۔

عورت اس نتیجے سے البتہ ایک مستقل غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی اور زلیخا نے مقابلہ شروع کر دیا۔ ایک ایسے پیغمبر جس کے تحفظ کی قدرت خود ضامن تھی بالآخر نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا زلیخا کی زندگی میں عورت کے لیے مکمل درس موجود ہے در اصل اس کو مقابلہ کرنا چاہیے ایسے مرد کا جو پیغمبر نہ ہو مگر اسکو پتا کیا جائے کہ عورت کی حوصلہ مندیاں شخصیت کی قائل نہیں وہ اپنی پرستش ہر انسان کا فرض سمجھتی ہے اور اس سے گریز کرنے والے کو دائمی شکست دینا چاہتی ہے یہی وقت ہوتا ہے جب اس کی تمام پوشیدہ قوتیں مشتعل ہو جاتی ہیں اور دامن تقدس کو محفوظ رکھنے والا کبھی نہ کبھی گریز کی سزا ضرور پا جاتا ہے دنیا والے نسوانیت کو عریاں اسی حالت میں دیکھ سکتے ہیں درحقیقت مرد کی نیاز مندی حقیقی عورت کو حجابات رنگین میں پوشیدہ کر دیتی ہے جس کے مختلف نتائج تلخ بیوفائی کج ادائی رکھکر انسان خود اپنی تشفی کر لیتا ہے ایسے حالات میں عورت کی فتوحات کا باعث اس کی وہ مقرریب کمزوریاں ہوتی ہیں جو انسان کو مفتوح ہو جانے کی ترغیب دلاتی ہیں لیکن اگر اس کا محبوب شکستوں سے اپنا دامن بچاتا

چاہتا ہے تو پھر وہ خود ایک دلکش مفتوح بن جاتی ہے اور محبوب کی حیات مستقرہ میں گم ہو جاتی ہے یہی وقت ہے کہ مرد اس کی چھینیوں کا پورا لطف اٹھا سکتا ہے اور اسے عارضی شکست بھی دے سکتا ہے دائمی شکست تو خود ہی کو نصیب ہو کر رہتی ہے جس پر ہزاروں فتحمندیاں نثار۔

عورت محبت کی تکمیل اور محبوب کو مسخر کر لینے میں اس لیے اور بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتی ہے کہ یہی اس کا پہلا اور آخری حاصل زندگی ہے وہ ایک مرتبہ سے زیادہ نہ محبت کر سکتی ہے اور نہ اس کے پاس کچھ رہ جاتا ہے جو دوسری محبت کے لیے اٹھا رکھے بعد میں آنیوالی تمام محبتیں تصنع اور فریب کاری میں مبتلا کرنیوالی ہوتی ہیں عورت کی زندگی کا یہ نہایت دلچسپ کرشمہ ہے کہ انتہائی عالم مدہوشی میں بھی اس کے تمام حرکات و سکنات مکر و فریب کے دامن سے ہوا پاتے رہتے ہیں وہ مرد کی طرح صرف ایک جھلک سے ہوش و حواس نہیں کھو بیٹھتی بلکہ انتہائی بیخودی میں بھی ہوشمند رہتی ہے وہ محبت کی پہلی پر کیف چنگاری کو اس احتیاط سے پرورش کرتی رہتی ہے کہ دنیا والے بالکل بے خبر رہیں اسی لئے مرور ایام کے بعد بھی جب اس کے محبوب کا سامنا ہو جاتا ہے تو اسکا گذشتہ نقش محبت تازہ ہو کر سدا بہار ثابت ہوتا ہے اور یہی اسکا سرمایۂ حیات ہے

حقیقی عورت وہی ہے جو اپنے ظاہر و باطن دونوں کو منزہ بنائے رکھے کسی چیز سے متاثر رہنے کے لیے عدم واقفیت ضروری ہے محبت کرنے والے کو اسی اصول کے ماتحت وہ مستقل دھوکے میں مبتلا رکھتی ہے جس سلوک کی خواہشمند ہوتی ہے خود وہی کرنے لگتی ہے خوش کرنے کے لئے خفا ہو جاتی ہے اور فرد گذاشتوں کا انتقام لینے کے لئے خوشامد کرنے لگتی ہے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ پیشانی کے ادنیٰ اتار چڑھاؤ سے کام نکل جاتا ہے ورنہ مہاتما گاندھی کی ستیہ گرہ سے زیادہ مؤثر اس کا قیمتی آنسو ثابت ہوتا ہے جس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔

دنیا والوں نے عورت کو سمجھنے کے لئے نئی طرح سے کوششیں کیں مگر اس کی زندگی کے لیے مہلک صرف دو گروہ ثابت ہوئے ایک وہ جو اس کو دہرو اتقا کی دیوی بنا دینا چاہتا ہے اور دوسرا وہ جو حجلۂ رنگیں سے نکال کر مردانہ خط و خال میں شمع محفل بنانے پر مصر ہے۔

پہلا گروہ ایک حد تک ناقابل اعتبار ہے اس لئے کہ اس کی خشک اور غیر دلچسپ فطرت لطافت نسواں سے مانوس ہو ہی نہیں سکتی اور یہ انسان کی عادت ہے کہ جو چیز اس کی عقل و سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے وہ اس کا دشمن ہو جاتا ہے بعینہٖ یہی اسباب یہاں بھی پیش آئے اس لئے جھنجھلا کر عورت کی زندگی کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ایک لایعنی ہستی بنا کر رکھ دیا وہ دنیا کے سامنے بے بس لڑکی فرمانبردار بیوی اور بے اختیار ماں بنا کر لائی گئی اس کی زندگی سے انسانیت فنا ہو گئی اب وہ اس دنیا میں رہنے کے قابل ہو گئی جہاں جاذبیت و دلکشی سے محروم حوریں رہتی ہیں۔ ورنہ اس دنیا میں رہنے والی عورت کی عصمت و عفت کا صحیح مفہوم حسن و شباب کے رنگین مشاغل اور زندگی کے آخری لمحات تک انکا تحفظ ہے جن کا برقرار رکھنا اللہ تعالیٰ کی فطرت ہے ورنہ وہ خود اپنے مقصد وجود کی تکذیب کر دیگی کیونکہ قدرت

نے پیامِ حسن بناکر اس کو دنیا میں بھیجا ہے ۔ خوش مذاق انسانوں تک اپنا پیام پہنچانا اس کا فرض اولین ہے کامیاب ترین عورت وہی ہے ۔ جو خود محبت کرے اور دوسرے کو کرنے دے مگر انتخاب صحیح اور مذاق سلیم کا اہتمام ضروری ہے ایسا نہ ہو کہ پیامِ حسن ان بدصورت اور بدخواندہ انسانوں تک بھی پہنچ جائے جو کسی طرح اس کے مستحق نہیں ایک حسین سلیقہ شعار اور خوش مذاق عورت میں خودداری تمکنت حوصلہ مندی اور وسعت نظر ہونا ضروری ہے اگر کوئی بدنصیب ان صفات سے محروم ہے تو وہ عورت کہلانے کی ہرگز مستحق نہیں بلکہ وہ ایک بدصورت عورت کے شباب سے زیادہ قابل نفرت ہے جو دنیا کی مہلک ترین مصیبت اور ایک انسان کے لئے سب سے بڑی سزا ہے ۔ میں پیر طریقت اور جوان صالح کے زہد واتقا اور خلوص کا قائل نہیں بہشت کو اگر حوروں سے مزین نہ کردیا ہوتا تو وہ ترک لذات اور لطف ودلچسپیوں کو اپنے ہاتھوں ملیامیٹ کردینے پر آمادہ نہیں ہوسکتا تھا مگر نتائج کا اشارہ کچھ اور ہے دنیا میں رنگینیت نسوانیت سے کنارہ کشی فطرت کو غیر مانوس رکھکر دائمی محرومی کا باعث ہوکر رہیگی اور نسوانیت مظلوم پر جبر واستبداد کا ادنیٰ انتقام ہے اب دوسرا دور گو ہے جس کو اپنی تہذیب وسعت نظری اور قدرشناسی پر ناز ہے وہ چاہتا ہے کہ عورت اپنی ساری صنفی خصوصیات ترک کرکے مرد بنجائے اس مقصد کی تبلیغ اس انہماک سے کیجارہی ہے کہ خود عورت اپنی حقیقی منزل بھول کر نیازمندانہ حالت تماشبین ہوتی جاتی ہے دیکھنے والی آنکھیں اور سمجھنے والی عقل شاہد ہے کہ آجکل کی ترقی یافتہ عورت نسوانیت کا مکمل ترین مرقع نہیں کہی جاسکتی ۔ کاش عورت صرف عورت ہی رہتی تو اس کے سامنے کی ساری کائنات مسخر و مطیع سر جھکائے کھڑی رہتی عورت اس لئے دنیا میں نہیں آئی تھی کہ وہ مردوں کے لیے ایک خوبصورت کھلونا بنجائے اور جب کھیلتے کھیلتے ان کا جی بھر جائے تو وہ چکنا چور کردیں ۔ بلکہ وہ ایک مستقل ہستی بنکر اور ایک مستقل پیام لے کر زمین اس وقت آئی تھی جبکہ دنیا میں چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی تھی جس کے پرتو سے عالم انسانیت منور ہوگیا تھا مگر آج وہ خودغرض انسان کی ابلہ فریبیوں میں مبتلا ہوکر اپنے پیام کو بھلا اور پیمبری سے دست بردار ہوگئی صنفی نسوانیت سے عورت کی بغاوت نے اس سے وہ تمام آلات حرب چھین لئے جو اس کی فتوحات کا باعث تھے مرد ازلی مفتوح ہوکر انتقام کی آگ سے جل رہا تھا اس زریں موقع کو ہاتھ سے کیوں جانے دیتا اس نے اپنے خوبصورت حریف کو خالی ہاتھ دیکھکر بھرپور وار کردیا ۔ عورت کو حرم سرا سے گھسیٹ کر کالج سینما کلب اور پارکوں کی زینت بنادیا گیا ہے ۔ اب وہ ایک ایسی ہستی ہوکر رہ گئی ہے جس کی زندگی دنیا والوں کے لئے سبق آموز اور عبرت انگیز ہے

"نادان دانا"

آپ شاید مجھ سے پوچھیں گے کہ ہنگام سفر
آپ پر حملہ وہ کرتے ہیں کیا تیاریاں

دشمنوں کی نقل و حرکت پر رہی تیری نظر
رخ ہے انکا کس طرف لیکن فوج ہے انکی کہاں؟

ایک ایکٹ کا مکمل ڈرامہ
میں افسانہ خبریں پڑھئے

طلبگاریاں!

یکتا حقانی

محبت بنوعِ دگر چاہتا ہوں — میں اپنا انھیں منتظر چاہتا ہوں
اُدھر بھی تبسم اِدھر بھی تبسم — یہ ماحول میں عمر بھر چاہتا ہوں
مقابل میں اپنے دلِ بے خبر کے — فقط اک دلِ باخبر چاہتا ہوں
ہٹا دیجئے رُخ سے گیسوئے مشکیں — شبِ زندگی کی سحر چاہتا ہوں
نہیں ہے کوئی قیدِ حسن و محبت — ہر اک رہگزر سے گزر چاہتا ہوں
تمھیں دیکھنا منظرِ عام پر میں! — نہیں چاہتا ہوں۔ مگر چاہتا ہوں

میں دنیائے رنج و الم میں بھی یکتا
خودی چاہتا ہوں۔ اگر چاہتا ہوں

لطیف نظر

لطیف قریشی

حجاب آنکھ سے اور دل سے اضطراب اُٹھا — اُٹھا اُٹھا مرے ساقی ذرا نقاب اُٹھا
یہ بزمِ وعظ نہیں بزمِ مے ہے اے واعظ — کتاب ہاتھ سے رکھ ساغرِ شراب اُٹھا
سُنا دے قسمت واژوں کے راز اے مطرب — میں اپنا جام اُٹھاتا ہوں تو شراب اُٹھا
نگاہِ یاس سے لے کام بزمِ حیرت میں — نہ دے جواب مگر تہمتِ جواب اُٹھا
فلک سے برق گری زلزلے ہزار آئے — مگر نہ در سے ترے خانماں خراب اُٹھا

لطیف دیکھ کے حالِ خراب کو میرے
ہر ایک سمت سے اک شورِ انقلاب اُٹھا

تاریخ ہندوستان کا ایک گمشدہ ورق

چودھری عبدالرؤف احتشام لکھنوی

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

زمانہ نام ہے انقلاب کا۔ دنیا کی ہر چیز کائنات کا ذرہ ذرہ تغیر پذیر اور تغیر پسند ہے۔ یہ ہے وہ عمل جس پر دنیا نہایت بے دردی کے ساتھ عمل کرتی چلی آرہی ہے۔ اٹھارویں صدی ہندوستان کا وہ منحوس دور ہے جب سارے ملک میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ مرکزی حکومت کمزور تھی۔ میر جعفر کو غداریوں اور سازشوں کا شکار ہونا پڑا۔۔۔ میر جعفر کی ہوس سلطنت نے انگریزوں کے قدم بنگال میں جمائے لیکن برے کا انجام بھی برا ہوتا ہے اس کو بھی انگریزوں کی چالاکیوں کا شکار ہونا پڑا۔ اب میر قاسم کے سر پر مسند بنگال کی گئی۔ اس کو بھی انگریزوں کی چالاکیوں کا بخوبی تجربہ ہو چکا تھا اس لیے اس نے اپنا دار السلطنت مرشد آباد سے مونگیر تبدیل کر دیا۔ مونگیر میں اس نے ضروریات کے مطابق ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ لیکن غریب کو چین نہ نصیب ہو سکا تاجروں پر ٹیکس لگانے کی وجہ سے انگریزوں سے اختلاف رائے شروع ہو گیا۔ آخر دونوں ایک دوسرے سے برسر پیکار ہو گئے۔ کئی لڑائیوں میں شکست دیکر جنرل وینسٹارٹ نے مونگیر کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ میر قاسم کا ستارہ گردش میں تھا اور اس کا اقبال ختم ہونے والا تھا۔ آخر کار شکست ہوئی۔ قلعہ کے اندر ہی اندر وہ نہ معلوم کہاں غائب ہو گیا؟ آیا زمین نگل گئی یا آسمان۔ یہ ایک معمہ ہے جو نہ حل ہو سکتا ہے نہ ہو گا۔

میر قاسم کے دو بچے تھے ایک لڑکا جس کا نام خسرو پرویز تھا اور ایک لڑکی جس کا نام شیریں تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی صورت دیکھ کر زندہ رہتے تھے۔ ان دونوں کو میر قاسم نے اپنے وفادار ملازم "سمرو" کی نگہبانی میں دیدیا تھا۔ نازو نعمت کے پلے دونوں نہایت حسین تھے۔ ان کے قتل تباہی کی ایک المناک داستان ہے لیکن اختلاف بیان ہے چنانچہ ایک مورخ اس واقعہ کو یوں تحریر کرتا ہے۔

میر قاسم کی فراری کے بعد اس کا نوکر سمرو اس کی تلاش میں نکلا۔ پہلے وہ خفیہ سرنگ میں داخل ہوا۔ اس سرے سے اس سرے تک تلاش کیا۔ لیکن بیسود مایوس ہو کر وہ واپس لوٹا کہ شاید وہ ابھی قلعہ ہی میں ہوں۔ سرنگ قلعہ کے اندر شاہی قبرستان میں کھلتی تھی۔ وہ باہر نکلا اور بچوں کو ایک محفوظ مقام پر چھپا کر سرنگ کا دروازہ بند کر دیا۔ اور پھر تلاش میں مصروف ہو گیا بدقسمتی سے پہرے داروں کی نظر اس پر پڑی اور وہ گرفتار ہو گیا۔

لیکن وفاداری نے اس کی زبان بندی کر دی اس نے نہ تو نواب کے بچوں کا پتہ بتایا اور نہ سرنگ کا راستہ۔ بچے اپنے

تنا غمگسار ثمرو کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے لیکن اس کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ بچوں کو کیا معلوم کہ وہ دشمنوں کے چنگل میں پھنس گیا ہے منتظر نگاہیں ہر آہٹ کو نجات دہندہ سمجھنے پر مجبور کر رہی تھیں آخرکار انتظار کی شدت سے گھبرا کر خسرو نے شیر کا لباس تبدیل کیا (جس کو ثمرو اسی غرض سے پہلے ہی رکھ گیا تھا) اور ہاتھ میں ستار لیکر نوکر کی تلاش میں قبرستان کی طرف بڑھا۔ میر قاسم کے ڈوب مرنے کی خبر نے انگریزوں کو مطمئن کر دیا تھا۔ اس وقت وہ خواب نوشیں کے مزے لے رہے تھے خسرو قبرستان میں آزادی کے ساتھ گھوم رہا تھا لیکن بدنصیب باپ اور نوکر جس کی تلاش میں وہ سرگرداں و پریشان تھا یہاں موجود نہ تھے۔ غم فراق نے اسے پاگل بنا دیا اور وہ اس حالت میں درد بھری آواز میں گانے لگا۔

مضطرب کر دینے والے نغموں نے فضائے سکوت میں ہیجان سا پیدا کر دیا۔ فوج کے سپاہی خواب سے بیدار ہونے لگے بندوقیں سنبھالے ہوئے وہ آواز کی طرف بڑھے۔

رات کا سماں۔ ۔ ۔ ۔ چاند طلوع ہو رہا تھا گیت ختم ہو گیا۔ سراسیمگی کے عالم میں وہ اپنی جائے پناہ کی جانب بڑھا۔ کلائیو نے اس کے لباس سے شیر کا اندازہ کیا بندوق سیدھی کی اور فائر کر دیا۔ آواز کے ساتھ ہی ایک دلدوز آہ فضا میں گونج گئی اور ایک انسانی ڈھانچہ دھم سے زمین پر گر پڑا۔ سپاہی شکار کی طرف تیزی سے بڑھے۔

"آہ! یہ کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔" کلائیو گلوگیر لہجے میں بولا۔ "یہ تو کوئی ساوی مخلوق ہے آہ اس کا لباس اس کی موت کا باعث ہوا۔ مجھ سے ناقابل معافی گناہ سرزد ہوا ہے میرے خدا مجھے معاف کر۔ ۔ ۔ ۔ اتنا حسین اور معصوم چہرہ" اس نے اپنی ٹپی سے مردہ چہرے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا "کتنی حسرتناک موت ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

گولی ٹھیک بائیں پہلو کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ نرم اور نازک ہاتھوں میں ابھی تک ستار تھا۔ بچپن ہی سے خسرو پرویز اور شیریں کو علم موسیقی کا شوق تھا۔ علاقہ بنگال میں جو اہمیت اس فن کو حاصل ہے ظاہر ہے چنانچہ نواب نے اساتذہ کے ذریعہ ان کو موسیقی کی پوری تعلیم دلوائی تھی اور وہی موسیقی آج شہزادہ کی موت کا باعث ہوئی

اہل شہر نے باوجود پہچاننے کی لاعلمی کا اظہار کیا جس کی وجہ سے کلائیو اس شہزادہ کو غیر ارضی مخلوق سمجھنے پر مجبور ہو گیا

(۳)

ساری رات اور دن شیریں نے تنہائی میں گزاری گو کہ اب ملاقات کی تمنا رکھنا محض فضول اور بیکار تھا کیونکہ ان کا عزیز بھائی گوشۂ لحد میں ابدی نیند سو رہا تھا۔ دوسرے دن، دن بھر کی جدائی کے بعد وہ سمجھ گئی کہ اس کا عزیز بھائی اور نوکر کسی نہ کسی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ چنانچہ رات ہوتے ہی وہ مصیبت آزمائیوں کی تاب نہ لاکر خود ان کی تلاش میں چل دی۔ تاریک راستے میں وہ دلیری کے ساتھ چل رہی تھی نصف شب گزر چکی تھی اور ہر طرف ہُو کا عالم تھا چلتے چلتے وہ چور ہو گئی اور اس کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ کمزوری کی وجہ سے سر چکرا رہا تھا اور اس کو راستہ تک نہیں دکھلائی

دے رہا تھا۔ جھاڑیوں اور کانٹوں نے اس کے بدن کو چھلنی بنا دیا تھا مگر وہ برابر چلتی جا رہی تھی۔ آخر وہ قبرستان کے ایک گوشہ میں تنہا پہونچی۔ یہاں بیتاب ہوکر اُسنے درد بھری آوازوں سے اپنے بھائی، باپ اور نوکر کو پکارنا شروع کیا لیکن جواب میں بازگشت کے علاوہ اسے کچھ سنائی نہ دیا۔

جو کچھ فوج کے سپاہی بندوق اور مشعلیں لیے ہوئے آواز کے تعاقب میں چلے۔ تھکاوٹ اور بھوک کی شدت سے بیتاب ہوکر یہ سات آٹھ سال معصوم بچی ایک درخت کے سہارا ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی کچھ فاصلہ سے کسی کے چلنے کی آواز آئی قبرستان کے درختوں کے سوکھے پتے کھڑکے اور خاموش فضا میں ارتعاش سا پیدا ہو گیا۔ ننھا سا دل سینے میں لرز گیا، دمکتی ہوئی آنکھیں تاریک رات میں اس کو اپنی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئیں شیر یا بھیڑیے کے خوفناک تصور نے اُسے لرزہ براندام کر دیا۔ جان بچانے کے خیال سے وہ ایک طرف بھاگی لیکن قبل اس کے کہ وہ درختوں کی آڑ میں چھپ سکے ایک دھماکا ہوا بندوق سینے میں پیوست ہو گئی اور تمام سپاہیوں میں بھاگدڑ مچ گئی۔ افراتفری کے عالم میں سب مردہ لاش کی طرف بڑھے اور سب سے پہلے اس جگہ پہونچنے والا کلائو تھا۔

"میرے خدا ——— یہ کیا"، کلائو نے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ کیا سچ مچ وہ آسمانی مخلوق تھی جسے کل ہی میرے بیرحم ہاتھوں نے ملک عدم پہونچایا۔ آہ!........ آج وہ پھر یہاں موجود ہے یہ کس کی بے چین روح ہے جو رات کے سناٹے میں درد بھرے نغمے گاتی ہوئی قبرستان کا طواف کرتی ہے........ اس کو کس کی تلاش ہے۔

"اُف! حسن اور معصومیت کی زندہ تصویر بالکل وہی۔ ہو بہو وہی جس کو کل ہم نے دفن کیا ہے" اس کے بعد کلائو سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سرخ خون فوارہ کی طرح بہہ کر زمین پر جم رہا تھا جسم پر شیر کی کھال پڑی ہوئی تھی۔

حقیقت میں دونوں بھائی بہن شکل و صورت میں یکساں تھے اکثر محل میں نوکروں کو دھوکہ ہو جاتا تھا کہ شہزادہ کون ہے اور شہزادی کون ہے؟

دوسری صبح نہایت احترام اور عزت کے ساتھ میر قاسم کے آخری نشان تمنا اور سرمایۂ حیات کو اس کے بھائی کے بغل میں ہزاروں من مٹی کے نیچے دبا دیا گیا۔

اس مضمون کا کتبہ لارڈ کلائو نے دونوں مقبروں پر نصب کر دیا: "کلائو نے اپنی عمر میں دو بیگناہوں کا خون کیا ہے جن معصومیت کی پرستش کے خیال سے دل کانپ اُٹھتا ہے۔ حقیقت میں وہ دونوں فرشتہ تھے۔ اور مخلوق سماوی سے تعلق رکھتے ہیں۔ میرے بیرحم ہاتھوں نے انہیں ابدی نیند سلایا خدا اُن پر اور مجھ پر رحم کرے"

اور اس طرح میر قاسم کی آخری یادگاروں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر کے ظالموں نے صفحۂ ہستان کا ایک گلدستہ بنا کر رکھ دیا۔

تجدیدِ شوق

شوق گھنڈوی

حسنِ معصوم کی کیا شانِ خود آرائی ہے — عالمِ قدس کا ہر ذرہ تماشائی ہے
کس تکلف سے وہ مصروفِ خود آرائی ہے — آئینہ سکتہ میں ہے عکس تماشائی ہے
ہائے کمبخت طبیعت بھی کہاں آئی ہے — جو جفاجو ہے ستم کیش ہے ہرجائی ہے
میں جدھر جاتا ہوں سب کہتے ہیں سودائی ہے — میری تقدیر میں رسوائی سی رسوائی ہے
یوں تو سوسن نے بھی کہنے کو زباں پائی ہے — پر میسر اُسے کب طاقتِ گویائی ہے
آج کچھ اُن کی جفاؤں میں کمی پاتا ہوں — دلِ بیتاب کو احساسِ شکیبائی ہے
روئے روشن پہ زلفوں کا تسلسل توبہ! — سچ تو یہ ہے سحر و شام کی یکجائی ہے
جانتا ہوں نہ نبھے گی مری اُن سے لیکن — دل کو کیا کہئے کہ مجبورِ شناسائی ہے
وہ عیادت کو جو آئے تو یہ منھ سے نکلا — زندگی بن کے مرے گھر میں قضا آئی ہے
جستجو دہر میں رہ کر نہ سکوں کی تو کر — بیقراری تو یہاں رازِ مسیحائی ہے

شوق اک ہمدمِ دیرینہ کے پہلو میں رہیں
ایسی تقدیر بھلا ہم نے کہاں پائی ہے

اضطراب

یحییٰ حقی ۔ اعظم گڈھ

ستم ہے دردِ محبت نے بیقرار کیا — سکون و صبر کے دامن کو تار تار کیا
جسے وہ بھول چکے تھے وہ عہد تازہ کیا — دلِ فسردہ کو پھر مست اعتبار کیا

شریکِ غم میں ہے روداد خونچکانیِ دل — زبانِ درد ہے مصروف ترجمانیِ دل
ہزار صورتِ تسکیں تلاش کی لیکن — نہ کام آئی مرے سعی و جانفشانیِ دل

شبِ خموش میں دیکھا بہت ستاروں کو — چھپا یا آنکھ میں فطرت کے ماہ پاروں کو
کبھی جنونِ محبت کا یہ تقاضا تھا — لگاؤں آگ جمال آفریں ستاروں کو

کسی کے دل میں اثر ہو تو بات بن جائے — کسی کا لطفِ نظر ہو تو بات بن جائے
میں "اضطراب" سراپا ہوں جس کی نظروں میں — اُسی کو میری خبر ہو تو بات بن جائے

توبہ

شفیق بانو

کسی کو غم ہوتا ہے تو غم کی باتیں یاد کر کے روتا ہے چیختا ہے سر پھوڑتا ہے اپنی زندگی کو تاریک کر دیتا ہے تباہ ہو جاتا ہے اس کی صورت دیکھ کر لوگوں پر غم کا اثر پڑتا ہے لیکن اس غم کے فلسفہ میں بھی ہندوستان کے مردوں کی منطق نرالی ہے۔ وہ تفریح کر کے غم کو بھلانا چاہتا ہے وہ عشق ہوتی ہے... مسکراتی جوانی حسینہ حوروں کو اپنا جی بہلاتا ہے۔ شراب پیکر سرور حاصل کرتا ہے کام میں کر روح کو بیدار کرتا ہے اور عیش و نشاط کی محفلیں گرم کر کے عہد گزشتہ کے نقش مٹاتا ہے۔ ماں مر جائے باپ ختم ہو جائے بیوی دم دیدے۔ بچے ہنستے کھیلتے موت کی آغوش میں جا سوئیں۔ آندھی آئے طوفان آئے بجلی گر پڑے۔

دنیا میں مصیبت آفت میں دیکھا مبتلا چیخ پکار کر رہے ہوں لیکن انہیں اپنے سکون سے مطلب خوشی چاہیے خواہ انہیں ہزاروں نعمتیں بھی ہوں عبدالرؤف جس نے اپنی زندگی کا بیش قیمت حصہ ذکیہ جیسی حسین بیوی کی صحبت میں گذارا ایک دو سال نہیں پورے دس سال۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر خدا نہ کرے کل دنیا میں ذکیہ کا دم نہ ہوا تو عبدالرؤف بھی جان سے گذر جائیگا یا کم از کم اپنی دنیا کو تاراج کر ہی دیگا۔

لیکن ہوا کیا؟ ادھر ذکیہ بیمار ہوئی ادھر ادھر ان کی دلچسپی ختم گویا ساری محبت کی کہانیاں فرضی تھیں اور حسن کی ناز برداریاں محض نفس پرستی تھی انسانیت کا اس سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

مرنے کے بعد اس روحانی خلش کو مٹانے کیلئے جو دل میں ہوئی رہی تھی عبدالرؤف نے اپنے دوست فرخ مرزا کے ساتھ تفریح میں جانا شروع کر دیا۔ کہاں؟ وہیں جہاں تہذیب اخلاق و انسانیت ہمدردی چھین کر معاوضہ میں ذلت دی جاتی ہے جہاں خرت میں زہر کے گھونٹ پلائے جاتے ہیں۔ جہاں کر دولت عزت لوٹ کر۔ بدنام کر کے کوڑی کوڑی کا محتاج کر کے دھتکار دیا جاتا ہے۔ فرخ مرزا خود ازل سے یہ عادتیں باپ دادا سے وراثت میں لیکر پیدا ہوئے تھے لیکن رؤف کو بھی اپنے ہی جیسا بنا ڈالا۔ شروع شروع تو رؤف کو اپنے ضمیر کی ملامت سنکر رونا آتا لیکن رفتہ رفتہ رؤف کا ضمیر مردہ ہو گیا۔

وہ روز کسی نئی پری چہرہ [illegible] کی مشہور طوائف سعیدہ کے پاس گیا۔ یہ اوروں سے کچھ مختلف تھی وجہ یہ کہ اس کی ماں اگرچہ طوائف تھی لیکن باپ ایک بہت بڑا لکھ پتی اور شریف خاندان سے تھا یہی وجہ تھی کہ اس کی صورت پر شرافت اور معصومیت برستی تھی۔ میاں رؤف کچھ ایسا الجھا کہ پھر اوروں کے ہاں جانا چھوڑ دیا۔ تمام طوائفوں میں کھلبلی مچ گئی اور وہ سعیدہ پر خار کھانے لگی۔

رؤف تعلقدار کا لخت جگر تھا اس لیے کچھ آنیوالے زمانہ کا زیادہ خدشہ نہ تھا وہ اپنی یہی زندگی بہترین سمجھتا تھا۔ دن کا پورا وقت اور رات کا بیشتر حصہ وہ صرف سعیدہ کی پوجا میں گذارتا

"اور ہر وقت شراب کا جام ہاتھ میں ہوتا ایک دن نشہ میں بولا "سعیدہ باغ میں تمہیں آکاش کا ستارہ بنا سکتا ..... تم کسقدر حسین ہو... تمہارے ہاتھ سے شراب پینے میں کتنا لطف آتا ہے بس دنیا ہے اور تم ہو — یا تم ہو اور میری دنیا"

سعیدہ کے پاس خدا جانے ایسی محبت کا راگ الاپنے والے کتنے آئے اور گئے کتنوں نے اُسے حسین کہا اور ختم — کسی نے مخمور آنکھوں کی تعریف کی کسی نے اُس کی سڈول گردن کی کسی نے اُس کے بھولے پن کی کسی نے اُس کی میٹھی میٹھی باتوں کی — کچھ حضرات ایسے بھی آئے جو ناصح بنکر — لیکن سعیدہ اپنی جگہ پر سعیدہ ہی رہی۔ اس وقت بھی وہ رؤف کے محبت بھرے لفظوں سے متاثر نہ ہوئی صرف اپنی خوبصورت آنکھیں اس کی طرف اٹھا دیں — رؤف یہ کہکر آگے بڑھا "سعیدہ تمہاری آنکھوں میں شراب ہے شراب۔ میری شراب سے بڑھکر" رؤف کو یہ نہیں معلوم تھا کہ سعیدہ کی آنکھوں کی کشش محدود نہیں بلکہ ایک ایسا چشمہ ہے جس سے سب اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔ عین سرور کی حالت میں اس کی دکان پر اور بھی خریدار حسن آئے۔ سعیدہ نے ایک دکان دار کی حیثیت سے ہر ایک کی تواضع کی لطف یہ روح فرسا نظارہ کی تاب دلا سکا اس نے محفل ختم ہونے پر اپنے دل کا حال سنایا کہ اس طرزِ عمل سے اُسے کتنا دُکھ ہوتا ہے اور وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ خوشامد بھی کی گڑگڑایا بھی — رویا بھی — چلایا بھی غصہ بھی کیا۔ لیکن سعیدہ کے ایک جواب نے تمام قصہ کو ختم کر دیا "رؤف صاحب آپکو شاید غلط فہمی ہوئی۔ کیسی عصمت آپ گھر والی کا گھر نہیں بلکہ ایک طوائف کا بالاخانہ ہے جہاں آپ سے بھی زیادہ دل گردہ والے دولت والے حسن پرست آ آکر سجدے کیا کرتے ہیں اگر میں آپ کا حکم سنوں تو دُکان کو کیا نیلام کر دوں۔ چھوٹے طبقہ سے لیکر بڑے بڑے جبہ و قبا والے مولانا بھی تشریف لاتے ہیں۔ بہانہ تو یہ ہوتا ہے کہ حقانی غزلیں سننے آئے ہیں لیکن حقیقت اس سے مختلف ہوتی ہے۔

رؤف نے اس خوشنما پروں والی تیتری کو دعوت دی کہ وہ تمام جائداد و مکان لے لے شرطیں لکھوا لے اور اس سے نکاح کرے۔ اُس نے جھڑک دیا۔ ہونہہ! جب یوں ہی آپ کا وار نہ چلا تو یہ دوسرا جال بچھا دیا۔ شمع جبتک کہ روشن ہے اُس پر پروانوں کا ڈھیر لگتا رہتا ہے اور کتنے ہی خاک ہو کر گرتے رہتے ہیں۔ کسی جاہل ناتجربہ کار کو یہ دھوکا دو تو دو میرے یہاں ان بے معنی سوالات کا کوئی محل نہیں"

رؤف کو ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے اُسے تیسری منزل سے نیچے گرا دیا۔ اُس کا دماغ چکرا گیا "یا اللہ دولت لٹا کر بیچ منجدھار میں تنہا رہ گئی اور پھر کیسی بری عادتیں آگئیں — اب یہ جواب"؟

اس نے ایک دم اپنے دل کو سخت بنا لیا۔ اور بغیر سعیدہ پر نظر ڈالے اٹھکر چل دیا۔ گھر میں آیا۔ کمرے میں نڈھال ہو کر گر پڑا بہت دیر پڑا رہا۔ اُسے اپنی مرحوم بیوی یاد آئی۔ کتنی معصوم اور محبت پرست تھی پھر اسے یہ خیال بھی آیا کہ وہ کتنا نیک تھا۔ اٹھا کسی فوری جذبہ سے متاثر ہو کر قبر کی طرف چل دیا۔ کچھ پھول قبر پر بکھیرے اور فاتحہ پڑھکر دونوں ہاتھ قبر پر رکھ کر جھک گیا۔ اُسے اس وقت بڑا سکون محسوس ہوا۔ آنکھ لگ گئی کیا دیکھا کہ مرحومہ کھڑی ہے لیکن کچھ غصہ سا چہرہ پر ہے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہہ رہی ہے "کیا یہی محبت تھی؟ رؤف کیا تم مرگئے تھے

تک میرا خیال تھا۔ اور تم دیکھو تو سہی تم نے اپنی حالت کیا بنالی بال اُلجھے ہوئے پریشان سے ساتھ ہیں میرے دل تھا اُنھیں کیا۔ اسی لیے سمجھانے آئے ہو کہ تم ان کی عزت نہ کرو۔ اب بھی توبہ کرو اپنے سب افعال ٹھیک کرو۔ یہ دنیا سرائے ہے۔

پاسترے ہٹ۔ آنکھ کھلی تو سوائے قبرستان کے سناٹے کے وحشت کے کچھ نہ تھا۔ عہد کیا۔ اب ساری باتیں بھول جاؤں گا اور اُس کے بعد سب کو معلوم ہوگیا کہ رؤف تھک کر پھر نیکی کے مرکز پر واپس آگیا

خزاں کا موسم آیا اور گیا۔ موسم بہار نے کروٹ لی۔۔۔
رؤف کا دل گھبرا گیا۔ اس نے نوٹوں کی گڈی لی اور جلد سامان سفر ٹھیک کیا۔ اور سیاحت کرتے ہوئے بمبئی جا پہنچا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہمارا راستہ پھر کچھ ہوش نہ رہا!
شہر کی مشہور و دنیائے فلم کی آفتاب ہری چہرہ مس وسیم سے متعارف ہوا تو وہ تین منٹ اخلاقیات کرتیں ورنہ کہہ دیتیں رؤف صاحب معاف کیجئے گا مجھے اس وقت جانا پڑ رہا ہے یا ڈنر میں جانا ہے"

یہ اپنا سا منہ لیکر رہ جاتے۔ یہ تو کہنے کی ہمت ہو نہیں سکتی تھی میں اس عرصے میں بہت دور سے آکر بیٹھا تھا کہ آپ سے گفتگو کر سکوں چھ ماہ اسی طرح مس وسیم کی کوٹھی کے چکر لگائے اور اس دوران میں مختلف بیش قیمت تحفے بھی پیش کئے بہترین قیمتی انگوٹھیاں گھڑی، ٹیبل لیمپ، چاندی کا ٹی سٹ وغیرہ وغیرہ جن کو مس وسیم لیتے ہوئے تھینک یو کہتی اور مسکراتے ہوئے یہ فقرہ بھی کہہ دیتی رؤف صاحب آخر آپ کو اس قدر تکلیف کیا ضرورت تھی۔
یہ بیوقوف پھولے نہ سماتے اور خوب خوش ہوتے کہ بارگاہ حسن میں نذرانہ عقیدت منظور ہوگیا۔ آخر ایک دن اپنے دل کے

تقاضے سے مجبور ہو کر مس ولیم کو خط لکھا اور اپنے تمام دلی جذبات بیان کر دیے اُس نے خط پڑھا ہنسی۔ اور کہا " اس دنیا میں بھی کیسے کیسے بیوقوف رہتے ہیں۔۔ خوب۔۔ میں انھیں پسند بہت اچھی لگتی ہوں۔ دعوت دی ہے کیا بہ قید کرنے کی۔ ظاہر ہے کو جی چاہا ہوگا سو یہ ایک ترکیب سوجھی! بیوی بننے کی آرزو کی جا رہی ہے یہ نہیں جانتے کہ مجھ میں بیوی بننے کی صلاحیت کہاں ہے! محفل کی شمع بن چکی۔ اپنے فن میں کمال رکھتی ہوں جس وقت پردہ پر لوگ ہزاروں کی تعداد میں سنیما شروع ہونے کا انتظار کرتے ہیں اس وقت میرا ہر سانس۔ ہر لفظ ہر انداز انھیں مجروح کر دیتا ہے اور ہزاروں خط تعریفی آتے ہیں۔ روزانہ کی ڈاک میں دو سو سے زائد خطوط ہوتے ہیں۔ کلرک بھی لکھتے لکھتے تھک جاتا ہوگا۔ میں تو شاید کسی خط کو کھول کر پڑھنا کیا سمجھتی بھی نہیں یہ نئے کھلاڑی زندگی کا کھیل کھیلنے چلے اور پھر مجھ سے!

فلم آدم آئینہ کے سامنے ٹر ٹر اتا یہ بھی ایک حسن ایکٹنگ تھا رؤف کو قطعی یقین تھا کہ مس ولیم ان کے خط کو نعمت غیر مترقبہ سمجھیں گی دو سرے روز گئے تو اُس نے سیدھے منہ بات بھی نہ کی۔ انھوں نے ذرا دیر گفتگو کی درخواست کی تو اکتائے ہوئے بیٹھ گئی جب انھوں نے قصہ الف لیلی کی طرح رومانی لفظوں میں اپنی محبت کا فلسفہ بیان کرنا شروع کر دیا تو وہ یہ کہکر " معاف کیجئے رؤف صاحب مجھے اس وقت "اسٹوڈیو" میں جانا ہے" جلدی اور یہ جا وہ جا غائب موٹر کا ہارن بجاتا ہوا سے باتیں کرتی سڑک سے گذر گئی۔
یہ عشق بہت مہنگا نظر آیا العرض رؤف اٹھکر سیدھا ہوٹل پہنچا اسے رنج، غصہ، افسوس سب کھائے جا رہے تھے اور بس چلتا تھا ورنہ کچھ تو سزا دیتا۔ آج توبہ کے بعد رؤف کی توبہ پھر ٹوٹ چکی تھی۔ رنج و غم کو سرور کی کیفیت میں بدلنے کے لیے پھر جام تھام لیا

پہونچ چکا تھا۔ وہ وہ بھول گیا کہ اس نے توبہ کی تھی اُسے یاد نہ رہا کہ وہ کس کی طرف جا کر عہد کر چکا تھا آج عہد ماضی کا کوئی خیال تھا صرف موجود تکلیف کا احساس تھا کہ کس طرح نفس کی تسکین کرے۔ ہوٹل کی ویٹرس کھانا کھلانے آئی۔ پھر مسکراتے ہوئے پھل پیش کئے۔ رؤف نے ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ ویٹرس کافی حسین تھی اور شکل سے بیس سال یا بائیس عمر ہوگی رؤف نے فوری سکون حاصل کرنے کو اس کی طرف دیکھا اور بطور انعام دس دس کے دو نوٹ اسے پیش کئے وہ خوشی سے اوچھل پڑی تھی ہوٹل میں صبح سے شام تک نہ جانے کتنے آتے رہتے تھے پر ایسا شیر دل ابتک کوئی نہ آیا تھا۔

سال گزر گیا۔ ویٹرس سے بھی دل بھر گیا اصلیت یہ تھی کہ وہ لاکھ چاہتا تھا۔ سوچتا تھا کہ دنیا میں کسی ایک کو اپنا بنالوں لیکن بنا نہ سکتا تھا۔ اُس کا دل اسے ہر بار دھوکا دیتا تھا وہ اپنے ارادوں کو ہر نئے دور میں کمزور پاتا تھا۔

اب گرمی کا دور دورہ تھا لہذا رؤف جیسا لاپرواہ دولتمند کہاں سکون سے بیٹھ سکتا۔ ڈلہوزی پہاڑ پر پہنچ گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی روح پرور ہواؤں نے اس کے جسم میں روح میں تازگی کی لہر دوڑا دی اب یہاں پھر وہی تھا اور شب تنہائی۔ کوٹھی کا چپہ چپہ جنت کی سی آرائش کئے خاموش تھا۔ رؤف سے تنہائی برداشت نہ ہو سکی۔

وہ تفریح کو جا رہا تھا راستہ میں ایک پہاڑن گھڑی سے گھاس سکھوڑ رہی تھی۔ رؤف نے ہزاروں حسن کی خریداریاں کی تھیں لیکن ایسا الھڑ شباب اور ایسا معصوم حسن اُس نے کبھی نہ دیکھا بہت دیر تک مبہوت ہو کر دیکھتا رہا۔ ہمت کر کے آگے بڑھا۔ اور مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"لڑکی ہم یہاں باہر سے آئے ہیں ہمیں ایک مالی کی ضرورت ہے اگر تمہیں معلوم ہو تو بتلاؤ بہت مہربانی ہوگی"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ اُس نے نظر جو اٹھائی تو رؤف ایک نواب کی مانند کھڑا تھا۔ فوراً وہ جا اپنے باپ کو بلالائی اور چند منٹ میں مالی کی تنخواہ وغیرہ طے ہو گئی اور کوٹھی میں رہنے کی جگہ بھی۔ دوسرے دن مالی مع لڑکی کے ڈیوٹی پر تھا۔ اور رؤف حسین پہاڑی لڑکی کے حسن جانسوز کے دیکھنے میں مشغول۔

رؤف کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا آج ہی اس نے اپنی زندگی شروع کی ہے حالانکہ اس سے بیشتر خدا جانے کتنی مرتبہ وہ اپنی زندگی کے ورق اُلٹ چکا تھا۔ اب اُس نے طے کر لیا کہ بس آج سے توبہ کرلوں اور باقی زندگی اس حسین مورت کو شریک حیات بنا کر گذار دوں گا۔

حسین پہاڑن کو قدرت نے اپنے فیاض ہاتھوں سے دل کھول کر حسن بخشا تھا۔ ملازمت کے بعد تو میلے کپڑوں کے بجائے سفید ساری اور ساٹن کا شلوکا پہنے تھی۔ وہ پھولوں کی روشوں کے پاس جب شام کو پھول توڑتی تو ایسا معلوم ہوتا گویا کوئی آسمانی حور اتر آئی ہے۔

سیزن ختم ہوا۔ پورے چھ مہینہ گزر گئے۔ سوکھی شباب اوج پر تھا۔ عشق کا بھی سیزن ختم ہو چکا تھا۔ حسین پہاڑن سے بہت سے جھوٹے سچے وعدے کر کے یہ حضرت رخصت ہو رہے تھے وہ بیچاری انہیں اسٹیشن پر پہونچانے گئی اور روتے روتے برا حال کیا۔

"کب آؤ گے تم؟"

"کہہ تو رہا ہوں کہ جلد ہی سردی ختم ہوتے ہی پھر واپس آجاؤنگا اور پھر اپنے ساتھ ضرور لیجاؤنگا۔ اس وقت کچھ وہاں جائداد وغیرہ کا انتظام کرنا نہ ہوتا تو تمہیں چھوڑ کر کبھی نہ جاتا"

"پہچانا؟ تم... میری"

کیا تمھیں میرے وعدوں پر اعتبار نہیں یقین کرو میں نے دنیا میں اور اپنی زندگی میں پہلی بار بس تم سے محبت کی ہے۔ تم سے جدا ہو کر میں شاید زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ تم حقیقت سمجھو!

حسینہ پہاڑن کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ سر ہل گیا۔ یہ گویا اس کی دنیا میں کا طوفان گیا۔ دوسرا سیزن آیا اور ختم ہوا۔ گرمی شروع ہوئی۔ پہاڑوں پر چڑھائی شروع ہو گئی۔ سب نے لیکن رؤف نہ آیا وہ انتظار کرتی رہی۔ اُسے اب برادری کا اور باپ کا بھی احساس باقی نہ تھا۔ وہ بالکل دیوانگی کے عالم میں روزانہ گھر سے نکل جاتی اور رؤف کا راستہ دیکھتی ہر اس پہاڑی پر چلی جاتی جہاں رؤف اس کے ساتھ جا کر تفریح کرتا تھا۔ ہر پھر کو وہ حسرت سے دیکھتی۔

گرمی کا سیزن ختم ہوا۔ موسم سرما نے کروٹ لی اور پہاڑی حسینہ اس انتظار میں رہی کہ رؤف کبھی نہ کبھی ضرور آئیگا!!

ایک روز بہت دیر تک وہ وہیں بیٹھی رہی۔ جہاں رؤف نے عہد و پیمان کئے تھے اُس میں اب ہمت باقی نہ رہی تھی۔ بخار سے جسم پھنک رہا تھا وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ برف گرنے لگی۔ رات کی وحشت نے اُسے آگاہ کیا لیکن اپنی جگہ سے نہ ہلی ایک نعرہ تنا کہا اور گردن ڈھلک گئی "کیا رؤف تم کبھی نہ آؤ گے۔ یہ سب وعدے دھوکے ہی تھے!!"

رؤف کو یہ بھی خیال نہ رہا تھا کہ اُس نے کسی سے کچھ وعدہ کیا تھا۔ اُس کی نیکی کی توبہ پھر ٹوٹ گئی تھی وہ پھر اپنے نئے خیالوں میں اُلجھا ہوا پھر سے اپنی زندگی کے نئے ورق کو الٹ رہا تھا اور پرانے ورقوں کو بھلانے کی کوشش۔ اُس کا واحد مشغلہ صرف چھلکتے ہوئے جام تھے اور عیش و نشاط۔

شہری ہنگاموں سے گھبرا کر کچھ دنوں کے لیے ایک گاؤں میں چلا گیا وہاں دیہاتی زندگی کی سادگی کے لطف اُٹھانے لگا گاؤں کے سارے آدمی سلامی کے لیے آئے اور کیوں نہ آتے آخر کو تو رعیت تھی۔ سرکار کو نذرانہ بھی دیئے اور بہت سارے پھولوں کے ہار ڈالے۔

گاؤں کے کمہار آمی کی لڑکی مالتی بھی ہار لیکر آئی اُس کا ہار سب سے زیادہ خوبصورت پھولوں کا تھا۔ باپ نے تاکید کردی تھی کہ "سرکار کو بہت تمیز سے ہار پیش کرنا"

مالتی اس انداز سے آگے بڑھی گویا سامنے بہت بڑے دیوتا کھڑے ہیں۔ رؤف نے دیکھا کہ گاؤں کی جاہل سی کچیلی میلی لیو میں ایک چاند بھی چھپ چھپ کر نکل رہا ہے اُس نے اپنا سر آگے بڑھا دیا اور مالتی نے ہار گلے میں ڈال دیا۔

رؤف نے کہا: "ہار ڈالنے سے ہار ہوتی ہے"!

مالتی سرکار کے اس اچھوتے مذاق پر مسکرا کر شرما گئی رؤف کا دل گاؤں میں ایسا لگا کہ جنگل کو منگل بنا دیا۔ سات مہینے اس طرح گزار دے کہ گاؤں کے سب لوگ گرویدہ ہو گئے جلسے کرتا۔ گاؤں کے آدمیوں کو تمام دنیا کی باتیں بتاتا کھیتی باڑی کرنے کی صفائی کی کھانے پینے کی ہدایت کرتا۔ گاؤں کے سادہ لوح آدمی اپنے سرکار کو بہت دعائیں دیتے اور روزانہ اس کے لیے سوغات لاتے۔

مالتی شروع شروع تو بہت ڈری لیکن رؤف نے نہ معلوم کتنے خوبصورت لفظوں میں اسے قول دیئے کہ رام کر ہی لیا۔

شہری محبت اور گاؤں کی محبت میں فرق ہوتا ہے شہری محبت ہوا کا رخ دیکھتی ہے اور گاؤں کی محبت صرف خیالوں میں اپنا تمر دیدیتی ہے۔

بیچاری مالتی نے اپنا تن من دھن سب کچھ رؤف کے چرنوں پر نچھاور کر دیا۔ رؤف نے پھر اپنے دل میں نئی خوشی نئی اُمنگ، نئی روح، نئی دنیا، نئے جذبات محسوس کیے اور مالتی سے کہا۔ مالتی! میں سمجھتا ہوں کہ میں ابتک بڑی بھول میں تھا جو لطف سادہ زندگی میں ہے اور جو خلوص جاہل دلوں میں ہے وہ شہری فضا میں کہاں ۔۔۔ مجھے آج پہلی مرتبہ اپنے دل میں خوشی محسوس ہوئی اور سمجھتا ہوں کہ تم پہلی بیوی ہو جس نے میرے بردے میں ہوک پیدا کر دی اب تمہارے بغیر زندگی کی نیا پار نہیں اتر سکتی ۔۔۔ مالتی سنتی رہی اور خوش ہوتی رہی اُسے کیا معلوم تھا کہ رؤف کی محبت "موسمی محبت" ہے احساس کا قول وقتی تفریح ہے

گاؤں کی عورتیں بڑے زور شور سے ہر جگہ مالتی ۔ اور رؤف کے قصے بیان کرنے لگیں۔ کھیا کا اُٹھنا بیٹھنا مصیبت ہو گیا۔ اُس نے بہتیرا حالات کو سدھارنا چاہا مالتی کو ڈانٹا کئی روز بند رکھا لیکن مالتی پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا وہ اس خیال سے خوش رہی کہ رؤف میاں کے ساتھ چلی جائیگی۔

رؤف کا دل بھی ایسی باتیں سن کر گھبرا گیا تھا اسے جانے کا سامان ٹھیک کر لیا۔ ٹھیک رات کے دو بجے کسی کی پرچھائیں دکھائی دی چونک پڑا "تم اس وقت کہاں؟" "میں اس لئے آئی ہوں کہ تمہارے ساتھ چلوں گی" ۔ "میرے ساتھ؟"

"ہاں اور نہیں تو کیا" ۔ روتے ہوئے "یہاں اب میرا کون ہے تم ہی کو اپنا کہہ دیا اور سمجھ لیا"

"لیکن مالتی میں تمہیں پھر کسی اور کے ہاتھ بلا بھیجوں گا اس وقت تو گاؤں میں یونہی میرے متعلق چرچا ہو رہا ہے"

"لیکن میں تو اتنا انتظار اب نہیں کر سکوں گی"

"کیوں مالتی"

مالتی نے اس کے جواب میں گردن جھکالی اور آہستہ آہستہ تمام واقعات بتائے کہ وہ اپنی قسمت کی ستم ظریفی سے رؤف کی وجہ سے بدنام ہے اور پھر رؤف کی محبت کی رسید یا امانت کی محافظ ہے ایسی نازک حالت میں وہ اکیلی کیا کرے گی؟ آنے والی بدنامی کا کس طرح مقابلہ کرے گی ۔ مالتی کا دل بھر آیا رونے لگی لیکن اُسکے گرم گرم سانس اور آنسو رؤف کو متاثر نہ کر سکے۔ سب کچھ سُنا اور جھوٹی تسلیاں دیکر اُسے واپس کر دیا اور خود اطمینان سے اپنے گھر واپس آگیا۔

مالتی اس کے پاس سے اٹھی تو بہت دلگیر تھی اُسے دنیا سے نفرت ہو گئی اور تمام باتیں سوچ کے وہ آگے بڑھی اور بہتے ہوئے دریا میں گر کر ہمیشہ کے لیے بہہ گئی مٹ گئی۔ پانی نے ایک دفعہ اُسے اُچھالا پھینکا اور پھر آغوش میں لے لیا۔ پانی کی لہریں برابر ہو گئیں

گاؤں میں چند روز طرح طرح کی باتیں ہو کر خاموشی چھا گئی باپ رنج کے مارے زہر کھا کر سو گیا۔ ایک ہی بچی تھی بیوی ذرا سی دودھ پیتی چھوڑ کر مری تھی غریب نے جوانی اس کی پرورش پر ختم کر دی۔ اس کا یہ حشر وہ نہ دیکھ سکا!!

رؤف میاں کو تو کبھی اس دیہاتی لڑکی کا خیال تک نہ آیا اور آتا بھی کیسے جس وقت بھی انکا ضمیر انھیں ملامت کرتا یہ فوراً اُسکا تدارک ساغر پر ساغر پی کر کرتے ۔ ازل سے دستور یہی بنا رکھا تھا ۔ ہر اچھوتی زندگی کو داغدار بنا کر خود پھر سے اپنی زندگی کا نیا صفحہ اُلٹ کر نیا حساب شروع کر دیتے۔

رؤف کسی شادی میں مہمان گئے وہاں انکو خاص طور سے آراستہ کمرہ دیا گیا۔ یہ اخبار پڑھ رہے تھے۔ شادی کا مکان تھا۔ کوئی بھولے سے کسی کام سے چلی آئی یہ صاحب خانہ کی لخت جگر تھی۔ جسے یہ یاد نہ رہا تھا کہ یہ کمرہ مہمان کو دیا گیا ہے۔ بہت بے تکلفی سے

پھول دامن سمیٹے چلی آئی۔ ایک دم نظر پڑتے ہی وہ سہم سی گئی
رؤف کہتے ہی رہ گئے معاف کیجئے اب چلا جا رہا ہوں آپ جو
چاہیں اگر اٹھا سکتی ہیں۔ لیکن وہ روپوش ہو چکی تھی۔ رؤف بھی دیر
تک وہیں سوچتے رہے اسے جاتے اپنے دل میں کیا کہتے جو
— تو بے مہری مجبول ہے — سُنا ہے ان کا ذکر خاندان
میں لوگ اچھے لفظوں میں نہیں کرتے۔ — ہو گا — مجھے کیا
بات آئی گئی برابر ہوگئی۔ رؤف دیکھ چکے تھے سر سے پاؤں
تک وہ لڑکی حسن کا مکمل نمونہ تھی باتوں باتوں میں اُس کے
چھوٹے بھائی سے اور کھیل کھیل میں نام اور لکھنے پڑھنے کی
باتیں پوچھ لیں تھیں — اب صرف یہ سوچ رہے تھے کہ کیونکر
حاصل کروں؟

گھر آتے ہی اُس کے باپ کے نام خط لکھا۔ بیوی کے مرنے کے
بعد کے واقعات کہ کس طرح اُسے تکلیف ملتی رہی اور گھر کے قیمتی سامان
برباد ہو گئے — روپیہ پیسہ کوئی دیکھنے والا نہیں باتیں بنانے والے تو
ہزاروں ہیں لیکن میری حالت سنبھالنے والا کوئی نہیں۔ میں اس کے لیے
بھی تیار ہوں کہ معقول روپیہ جائداد مجھ سے لکھوا لی جائے" نہیں
نہیں کرتے ہوئے بھی لڑکی والوں نے دولت کی لالچ میں آکر شادی
کر ہی دی — سب بھول گئے کہ یہ وہی رؤف صاحب ہیں جن کی عیاشی
کے افسانے دور دور تک زبان زد تھے!

آج رؤف نے پھر سے توبہ از سر نو کر لی تھی — اور دل میں
عہد کیا کہ اب آئندہ واقعی پاکبازی کی زندگی گذاریگا — اب
بیچارہ توبہ نہ کرتا تو کیا کرتا — عمر کا تقاضا تھا — پچاس کے لگ بھگ
پہونچ چکا تھا تاہم دیکھنے میں وہ اتنا حسین اور کم عمر معلوم ہوتا کہ
مشکل سے کوئی اُسے پینتیس کا بتاتا۔ بیوی فردوس جس نے
خیر سے ابھی زندگی کی بیسویں بہار میں قدم ہی رکھا تھا۔ اگرچہ

رؤف اُس کا ہر طرح خیال رکھتا اور سب کچھ خاطر کرتا لیکن وہ کچھ عجیب
سی ہو کر رہ گئی تھی۔ نوکر چاکر عیش و آرام۔ دولت شان و شوکت موٹر
وغیرہ ہر چیز تھی لیکن خوشی نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی چیز کھو گئی
یا دنہ رہی! —

نفسیاتی اصول ہے کہ اگر انسان فطرتی حساس ہو اور مصلحت پسند
تو اسے گذشتہ باتیں سکھ نہیں لے سکتیں۔ رؤف نے سمجھا کہ
شائد یہ بھی کوئی تعریف کی بات ہے اُس نے عہدِ گذشتہ کی رنگین
شامیں عیش و نشاط کی راتیں — دوسری حسین عورتوں کی محبت
بھری باتیں سب کچھ سنا کر موجودہ خیال نہایت پاک صاف ظاہر
کیا لیکن فردوس کے دل میں میل بیٹھ گیا۔ وہ اسے بہت ذلیل سمجھتی
اور بات بات میں کہہ اُٹھتی "خدا غارت کرے ان ماں باپ کو جنہوں
نے دولت دیکھی خصلت نہ دیکھی — عزت نہ دیکھی"

مہینوں کیا سال گذر جاتے لیکن فردوس سیدھے منہ بات
بھی نہ کرتی اُس کی نظروں میں کوئی وقعت ہی نہ تھی

رؤف اب اس عالم میں پہونچ چکے تھے جہاں توبہ بھی توبہ
کرتی ہے گذشتہ زندگی کا افسوس — بیوی کی بے رخی —
دولت کی کمی صحت کا رخصت ہونا۔ یہ سب باتیں سوہانِ روح
بن گئی تھیں۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ رؤف کبھی بڑھا نہ ہوگا
اور اُس کی صحت تھی بھی ایسی لیکن شراب کی زیادتی نے پھیپھڑوں
پر اثر کیا اور وہ چند روز کے بخار میں ریت کی دیوار کی مانند گر گیا

اب اُس کی بیکسی کی نوبت یہاں تک پہونچ چکی تھی
بخار چڑھا ہوا — اپنے دالان میں لیٹا اللہ اللہ کر رہا ہے
دوست احباب مزاج پرسی کو آ جا رہے ہیں۔ بیوی بھی بیوی
کی حیثیت میں خدمت کر دیتی ہے۔ لیکن رؤف کی تکلیف میں
کمی نہیں ہوتی جہاں ذرا سانس لیا اور آرام سے لیٹا نیند آ!

غنودگی میں ہوئی اور چونکا خواب میں اُسے گذشتہ صورتیں سونے نہیں دیتیں۔ نیک بیوی کے مرنے کے بعد اُسے بھول جاتا۔ پھر وہ مختلف حسین لڑکیوں سے شادی کے وعدہ کرکے بھول جانا۔ دولت کے چند کھوٹے سکوں سے غریب گاؤں کی لڑکیوں کو تباہ و تاراج کرنا۔ ہر توبہ کے بعد پھر وہی باتیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رؤف کا رُواں رواں کانپ رہا ہے۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا لیکن موت اُس سے قریب ہوتی چلی آرہی تھی!!

کبھی کبھی ہچکیاں مار کر رونے لگتا۔ ضمیر کی ملامت اُسے کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتی تھی۔

فردوس کو بلایا اور کہا "مجرم ہوں پکا پاپی ہوں توبہ شکن ہوں۔ دنیا میں بہت سی زندگیوں کی اپنی ناپاک زندگی پر کرنے کے عہد تمہیں بھی اپنے پہ قربان کیا۔ شباب کیا تھا ایک سیلاب تھا جس میں بہتا چلا گیا.... بہتا چلا گیا۔ ایسا ڈوبا پھر کبھی نہ اُبھرا — توبہ پہ توبہ کی لیکن ہر بار ٹوٹ گئی۔ افسوس ہے کہ تمہیں خوش نہ رکھ سکا — تمہارے جذبات کی قدر مجھ سے نہ ہوسکی — میں اپنی عمر ختم کر چکا — تم نے اب شروع کی ہے۔ احسان ہوگا بیگم! مرتے وقت معاف کردو — بخش دو"

فردوس آخر کو تو ہندوستانی بیوی تھی لاکھ بیزار سہی لیکن رؤف کے لفظوں نے دل کو ہلا دیا۔ رو پڑی اور کہا "میں نے معاف کیا۔ میرا خدا معاف کرے رؤف — تم بھی میرا کہا سنا معاف کرنا"!!

رؤف نے جھکتے ہوئے فردوس کا ہاتھ آنکھوں سے لگا لیا!!

رفتہ رفتہ رؤف کا سانس بگڑا اور کچھ گھبرا کر بے ربط فقرے بولنے لگا "میں توبہ کرتا ہوں ہاں..... ہاں آج سے بس توبہ — اب سامنے سے ہٹ جاؤ — دیکھو یہ خوفناک شکلیں کیسی ہیں..... مجھ کمزور سے انتقام نہ لو — بدلہ نہ لو — نہیں نہیں کون کہتا ہے — ہرگز نہیں — میں نے اُس کا خون کیا؟... میں نہیں تھا — میں نے دھوکے دیے؟ نہیں غلط ہے۔ میں نے فریب بھی... نہیں مجھے معاف ہی کردو — یہ لاکھوں فریادی کہاں سے آگئے! میں کہاں تک دیکھوں — دیکھو — بس — انسان ہوں — مجھے نہ ڈراؤ — سامنے سے ہٹ جاؤ — معاف — توبہ کرتا ہوں..... توبہ" یہ کہتے کہتے آنکھیں بند ہوگئیں!!

خاک کا پتلا خاک میں مل گیا — جس نے بے شمار جام ہونٹوں کو لگائے تھے آج اُس کی توبہ مستقل ہوگئی — جس نے خدا جانے کتنے دھوکے دیے تھے آج اُسے موت نے دھوکا دیا!!

جس نے دوسروں کو رُلایا تھا آج احساس نے اُسے رُلا رُلا موت کی آغوش میں سلا دیا!!

کوٹھی وہی تھی۔ دولت وہی تھی — بیوی سامنے بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ بچے رو رہے تھے جو آخری پونجی یا بڑھاپے کی یادگار چھوڑے تھے — کمزور پودا بغیر مالی کے رہ گئی —

جسدِ خاکی خاموش تھا۔ دونوں ہاتھ سینہ پر اِس انداز سے رکھے رہ گئے گویا توبہ کے لیے آگے بڑھ رہے تھے چہرے پر غرور ختم ہو کر انکسار باقی رہ گیا تھا۔ موت نے عہد شکنی۔ توبہ شکنی کا قصہ ختم کر دیا!!

افسانہ نمبر بطور نمونہ نہیں بھیجا جاسکتا۔ افسانہ نمبر کے لئے ۶ر کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں

حسنِ اتفاق

خالد حسین قادری آگرہ

رات کا وقت تھا۔ سردیوں کی طویل راتیں۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سڑکیں سنسان تھیں آخری تاریخوں کا چاند آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔ اس کی پیلی پیلی کرنیں تاریکی سے مسلسل جنگ کر رہی تھیں سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں خوش و خرم بیٹھے تھے ۔۔ مگر وہ اپنے مردہ لڑکے پر جھکی ہوئی رو رہی تھی ۔ کیسا درد ناک تھا وہ سین۔ اس کی پہلی اولاد، دل کا سرور، اکلوتا بچہ آہ مردہ پڑا تھا۔ ڈاکٹر اپنے دواخانہ میں دونوں ہاتھوں سے ماتھا تھامے میز پر کہنیاں ٹکائے جھکا ہوا بیٹھا تھا غم سے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔۔ اس کے چمنستانِ حیات کا پہلا پھول کھلا تھا لیکن موت کے ظالم ہاتھوں نے اسے یوں توڑ لیا۔ جیسے بے رحم گلچیں ڈالی سے پھول۔ ڈاکٹر نے ایک لمبی سرد آہ بھر کر اپنی ہتھیلی گال پر رکھ لی۔ اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے مگر اس کا دل رو رہا تھا۔ برابر کے کمرے سے مسلسل سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔

آہ۔ اس کا گلشن حیات پامال ہو چکا تھا۔

یکایک ہال میں زور سے گھنٹی بجی۔ ڈاکٹر ایک دم چونک پڑا۔ گھنٹی پھر بجی۔ ڈاکٹر آنسو خشک کرتا لڑکھڑاتا ہوا کمرے میں آیا ہال میں تاریکی تھی اور موت کا سکوت ۔۔۔ سیدھا گھونسا اور زرد چہرہ صرف اندھیرے میں وہ اتنا دیکھ سکا۔

"آداب عرض۔ ہے ڈاکٹر صاحب" اجنبی نے سلام کے بعد اندھیرے میں ہاتھ ملانے کے لیے بڑھایا۔ "شاید آپ مجھے پہچانتے نہ ہوں" اجنبی نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "میں سخت ضرورت سے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ وہ سخت گھبرایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ تھکے ہوئے کتے کی طرح وہ زور زور سے ہانپ رہا تھا۔

"کیا کام ہے" ڈاکٹر نے افسردہ لہجے میں دریافت کیا

"ڈاکٹر صاحب میری بیوی سخت بیمار ہے اُسے شدید دورہ ہوا ہے"۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا اس کا باپ بھی اسی دورہ میں مرا تھا"

ذرا چل کر دیکھ لیجیے آپ کی مہربانی ہوگی۔۔۔۔ وہ مر رہی ہے" اجنبی کی آواز میں سوز تھا اور لہجہ موثر تھا اس کا ایک ایک لفظ ڈاکٹر کے دل میں اتر رہا تھا۔

"آہ! ہم دونوں بدقسمت ہیں" ڈاکٹر نے سانس لیکر کہا "میرا پیارا اکلوتا بچہ ابھی مرا ہے" ڈاکٹر نے بیزار سے لگتے ہوئے کہا۔ بھائی میری دلی ہمدردی تمہارے ساتھ ہے۔ مگر افسوس۔۔۔ میں مجبور ہوں۔ اپنے پیارے بچے کی لاش جس کو میں نے زندگی بھر اکیلا نہیں چھوڑا یوں کیسے چھوڑ کر جا سکتا ہوں"

"ڈاکٹر یہ سب درست ہے مگر میری قلبی کیفیت کا اندازہ آپ ہی کر سکتے ہیں۔ ذرا، تھوڑی دیر کے لیے چلئے آپ جلد ہی واپس آجائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب وہ مر رہی ہے۔ دیکھئے ایک مر چکا ہے اور دوسرا مر رہا ہے" اجنبی کے لہجے سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔

"تم مجھے مجبور کر رہے ہو" ڈاکٹر یہ کہتا ہوا ہال سے کرہ میں آگیا۔

بچے کی لاش پر اُس کی ماں اسی طرح سسکیاں لے رہی تھی۔ آہ۔ اس کی زندگی بھر کی کمائی یوں لٹ چکی تھی سرہانے موم بتی جل رہی تھی۔ دم بدم پروانے آ رہے تھے اور جل جل کر ختم ہو رہے تھے موم بتی بھی اس کے فراق میں آنسو بہا رہی تھی — آہ ہماری زندگی موم بتی کی طرح ہے جو برابر گھلتی جاتی ہے مگر پتہ نہیں چلتا۔

پچھلے تمام واقعات ایک ایک کر کے ڈاکٹر کے دماغ میں آ رہے تھے — وہ جوانی کی امنگیں، ولولے، شادی خدا نے انھیں جوانی ہی میں ایک بچہ دیا۔ اس کی معصوم شرارتیں آہ سب غایب — اس کی عمر ۴۵ برس کی ہو چکی تھی اس کی بیوی ۳۵ سال کی — اس کی پہلی اولاد — اور شاید آخری اولاد — اب بڑھاپے میں کیا امید تھی کہ اولاد ہو

"میری پہلی اور آخری اولاد" یہ خیال آتے ہی ڈاکٹر پاگل سا ہو گیا۔ اس کے قدم لڑکھڑانے لگے وہ دیوار کا سہارا لیتا ہوا برابر کے کمرے میں آگیا۔ یہ اس کے بچے کا کمرہ تھا اس کی اسکول کی کتابیں "کتاب دان" کے سہارے کھڑی تھیں، سامنے کھونٹی پر اس کا نیا سوٹ لٹک رہا تھا اس نے کس قدر شوق سے اسے بنوایا تھا۔ ابھی وہ صرف ایک ہی بار پہن پایا تھا۔ کونے میں اس کی ہوائی بندوق رکھی تھی۔ ہر اتوار کو وہ شکار کھیلنے جایا کرتا تھا — آہ مگر آج وہ خود موت کا شکار ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر نیم پاگل ہو رہا تھا۔ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے وہ ہال کے قریب پہنچ گیا۔ وہ بالکل بھول گیا تھا کہ کوئی ہال میں اس کا منتظر ہے۔

اجنبی نے مایوس ہو کر پھر گھنٹی بجائی ڈاکٹر ایک دم ٹھٹکا جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے جاگ پڑے وہ پھر اجنبی کے پاس پہنچا۔

"بھائی میں تم سے کہہ چکا میں نہیں جا سکتا" ڈاکٹر نے کراہتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر میں سمجھتا تھا آپ کپڑے پہننے گئے ہیں۔ وہ مر رہی ہے۔ میں یہاں ہوں مگر اس کی چیخیں اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ اچھے ڈاکٹر جلدی چلو" اجنبی نے ڈاکٹر کے شانہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "میرے پاس گھوڑا گاڑی ہے تم بہت جلد یہاں واپس آجاؤ گے۔ خدا کے لیے ڈاکٹر جلدی کرو"

"تم مجھے مجبور کر رہے ہو۔ میری بیوی اکیلی ہے — بھائی میں ہرگز نہیں جا سکتا" ڈاکٹر نے کہا"

"ڈاکٹر مجھے مایوس نہ کرو۔ یہاں آس پاس کوئی اور ڈاکٹر بھی نہیں ہے ورنہ میں تمھیں تکلیف نہ دیتا۔ جلدی کرو۔

ڈاکٹر اجنبی کے مسلسل اصرار سے مجبور ہو گیا۔ اجنبی کی آواز میں ایسی کشش تھی کہ وہ یہ بھول گیا کہ اس کا بچہ مردہ اور اس کی بیوی اکیلی ہے۔ ڈاکٹر نے اپنا بیگ اور آلہ اٹھایا اور اجنبی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چلنے لگی مگر وہ اپنے خیالات میں ایسا مستغرق تھا کہ اُسے کچھ پتہ نہ چلا۔ چاروں طرف رات

کی سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ چاند بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ ستارے مدہم امید کی طرح چمک کر چھپ جاتے تھے۔ گاڑی ایک پل پر سے گذر رہی تھی۔ پانی کا شور گاڑی کی گڑگڑاہٹ سے مل کر دہشتناک آواز پیدا کر رہا تھا۔ ڈاکٹر اس آواز سے یکایک چونک پڑا جیسے معصوم بچے کسی بڑے خواب کو دیکھکر چونک پڑتے ہیں۔

"گاڑی روکو میری بیوی اکیلی ہے" وہ ایک دم چلایا "ٹھہرو میں یہاں سے کسی کو اس کے پاس بھیج دوں"

گاڑی والے نے گاڑی کو اور تیز کر دیا۔ ڈاکٹر پھر گہری فکر میں کھو گیا۔

"کیسی تاریک رات ہے" اجنبی نے کہا

ڈاکٹر نے آہ بھر کر کہا "ہمارے نصیب کی طرح"

وہ سوچنے لگا — وہ بالکل اکیلی ہے جس کو میں نے عمر بھر پل بھر کے لیے آنکھوں سے جدا نہ کیا آج وہ بالکل اکیلا ہے۔ اب وہ ہمیشہ کے لیے اکیلا رہیگا — میں یہاں ہوں وہ نہ جانے کیسی ہوگی۔ میں کیوں چلا آیا۔ اس کو اکیلا چھوڑ کر چلا آنا نہ تھا ابھی سب کچھ باقی ہے کسی کو بھیج دیتا یہاں سے وہ اکیلی ہوگی — ڈر سے گی تو نہیں — مجھے یہاں آنا ہی نہ چاہیے تھا۔ مگر نہیں ہمدردی شرافت انسانیت اور دھرم ڈاکٹر کے فرائض ہیں۔

اجنبی سوچ رہا تھا — اے معبود! اب وہ کیسی ہوگی آہ یہ شدید درد سے جان لیوا۔ اور یہ بیماری ہمارے دس سالہ تعلقات کو منقطع کردیگی — اے معبود رحم رحم ہمارے چمنستان محبت کو پامال نہ کر — اپنی رحمت سے اس گلستاں کی آبیاری کر — اگر وہ خدانخواستہ مرگئی۔ تو — تو — میں کہیں کا نہ رہونگا

خلاق عالم اگر بلاتا تو دونوں کو ایک ساتھ بلاتا —

گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ سامنے کی کھڑکیوں میں سے روشنی کی زرد زرد کرنیں باہر آرہی تھیں۔ تمام میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ڈاکٹر اور اجنبی کمرے میں پہنچے — کمرہ میں دہشت برس رہی تھی۔ اور موت کا سا سناٹا۔ اجنبی نے اندر قدم رکھتے ہی زور دار چیخ ماری "آہ اب اسے ہمیشہ کے لیے سکون ہوگیا۔ اجنبی لڑکھڑا کر قریب صوفہ پر گر پڑا۔

ڈاکٹر نے جھک کر مریضہ کے چہرہ کو دیکھا۔ چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ خد و خال کی دلکشی پر موت فریفتہ ہوچکی تھی۔ کمرہ میں ہر چیز پر موت اپنا پورا تسلط جما چکی تھی۔ ڈاکٹر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیوں ڈاکٹر صاحب" اجنبی نے مایوسانہ انداز سے پوچھا "اب ہماری اور تمہاری حالت بالکل یکساں ہوگئی وہ — وہ تو — " ڈاکٹر کے حلق میں آواز پھنس کر رہ گئی۔

(۲)

ریل گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی جارہی تھی۔ سامنے کھڑکی سے دلچسپ مناظر نظر آرہے تھے۔ سورج کی آتش بار شعاعیں پانی کی مرتعش لہروں کو چمکا رہی تھیں — دور سبزہ زاروں میں گائیں چر رہی تھیں آپس میں چھیڑ چھاڑ بھی کرتی جاتی تھیں۔ چرواہا اپنی دھن میں مست بانسری پر ایک دلکش راگ الاپ رہا تھا۔ ڈاکٹر اپنے مخصوص درجہ میں بیٹھا ہوا یہ تمام منظر دیکھ رہا تھا۔ گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی۔ درجہ کا دروازہ یکایک کھلا اور ایک جوان جوڑا داخل ہوا۔

"معاف فرمائیے گا وقت ذرا سا تھا اور کہیں بھی جگہ نہ

اگلے اسٹیشن پر میں دوسرے درجہ میں چلا جاؤں گا" نووارد نے رومال سے پسینہ خشک کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر نے کھڑکی سے منہ پھیرتے ہوئے کہا "کچھ مضائقہ نہیں آپ تشریف رکھئے"!

نووارد ڈاکٹر کی صورت دیکھتے ہی کھڑا ہوگیا۔

"ارے تم کہاں" ڈاکٹر کے منہ سے یکبارگی نکلا۔

نووارد وہی اجنبی تھا۔ دونوں بغل گیر ہوئے۔ اجنبی ڈاکٹر کے پاس بیٹھ گیا۔ عورت دوسری سیٹ پر جہاں ایک بچہ اور بیٹھا ہوا تھا۔ بیٹھ گئی۔

تمہارے ساتھ یہ کون ہیں" ڈاکٹر نے پوچھا

"یہ ـــ یہ" اجنبی نے رکتے ہوئے شرمیلے لہجہ میں کہا "آپ کی بھاوج"

"واقعی" ڈاکٹر نے حیرت واستعجاب سے پوچھا۔

"یہ بچہ کس کا ہے" اجنبی نے پوچھا۔

"تمہارا بھتیجہ" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اجنبی کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں

"میاں آؤ بیٹے" ڈاکٹر نے بچے کو پیار سے بلایا

"انہیں سلام کرو۔ دیکھو یہ تمہارے چچا ہیں"

یادِ ماضی

ستارے جب بساطِ چرخ سے روپوش ہوتے ہیں
نسیم صبح سے غنچے جب ہم آغوش ہوتے ہیں
شرابی کی طرح سے جب حسیں مدہوش ہوتے ہیں
دلِ پرغم کے نالے جب اذیت کوش ہوتے ہیں

تو اک پر کیف سی شے آکے دل کو گدگداتی ہے
نکل پڑتے ہیں آنسو جب تمہاری یاد آتی ہے

پوری نظم افسانہ نمبر میں پڑھئے

سوز شاہجہانپوری

"ہندستان" کانگریس کا ہفتہ وار اخبار پڑھئے

پتہ: نیشنل ہیرلڈ بلڈنگ جو لکھنؤ قیمت فی پرچہ سالانہ ۳ روپیہ

ہمارے مستقل لکھنے والے

گاندھی جی۔ جواہر لال نہرو۔ ڈاکٹر محمد اشرف۔ مسیح الحسن رضوی

سلام مچھلی شہری۔ وجاہت سندیلوی۔ مسعود اختر جمال

اضطراب عالم

عشرت علی۔ صدیقی

یورپ کی لڑائی اب مغربی محاذ تک محدود نہیں رہی ہے بلکہ اس کے اثرات ساری دنیا پر چھا گئے ہیں۔ کوئی ملک اپنی مرضی سے اور اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے اس میں شریک ہے اور کوئی اپنے آقا کی مرضی سے ٹھونس دیا گیا ہے کچھ ملک ایسے بھی ہیں جو بظاہر یوں کہئے کہ جس حد تک ممکن ہے اپنا دامن بچائے ہوئے ہیں مگر جنگ کے زہریلے چھینٹے کم و بیش ہر ایک کے دامن پر پڑ چکے ہیں کہنے کو روس غیر جانبدار ہے لیکن اپنی حفاظت کے لیے اس نے پولینڈ فن لینڈ، رومانیہ اور بالٹک اور بلقان کی ریاستوں پر چھاپا مارا۔ ترکی لڑائی سے الگ ہے لیکن درہ دانیال کے اردگرد کے علاقہ میں اس نے بھی مارشل لا نافذ کر دیا ہے۔ غرضکہ آج کی دنیا بڑی حد تک ایک ایسے انسان سے مشابہ ہے جس کے بدن میں زہریلا مادہ پیدا ہو گیا ہو اور علاج معالجہ کی طرف سے لاپرواہی برتنے کی وجہ سے اب یہ حالت ہو گئی ہو کہ کبھی ہاتھوں میں پھوڑا بن کر پھوٹ نکلے کبھی ٹانگوں میں زخم کر دے کبھی پیٹھ میں سرطان بن کر ابل پڑے اور کبھی آنکھ بن کر انسان کی موت کا باعث بنتا ہے۔

اضطراب کی کسی پچھلی اشاعت میں میں نے جنگ کے بنیادی اسباب پر ایک اچٹتی نظر ڈالی تھی۔ یہاں اس کی تفصیل بیان کرنا نہیں مقصود ہے بلکہ بتانا صرف یہ ہے کہ پچھلی جنگ عظیم کے بعد سے عالمگیر امن کے نام نہاد علمبرداروں کی عادتیں اس درجہ خراب ہو گئیں اور وہ ایسی ایسی علتوں کا شکار ہو گئے کہ بین الاقوامی سیاست میں زہریلا مادہ پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ امن کے محافظوں کی لیتی نہ چھوٹنا سکیں نہ چھوٹیں اور یہ مادہ بڑھتے بڑھتے اس نوبت کو پہونچ گیا کہ دوسری عالمگیر جنگ کی شکل میں پھوٹ نکلا اور ابھی تک بہہ رہا ہے۔ البتہ کبھی کبھی مواد کوئی چھیچھڑا پھنس کر اس تسلسل کو روک دیتا ہے۔ لیکن گھاؤ پھر کھل جاتا ہے اور اگر نہ کھلا تو مادہ دوسری جگہ توڑ کر اپنی راہ نکال لیتا ہے پولینڈ کی لڑائی۔ فن لینڈ اور روس کی ٹکر۔ ہالینڈ اور ناروے پر جرمنی کے حملے۔ فرانس کا مورچہ۔ انگلستان اور جرمنی میں بمباری کا مقابلہ۔ پھر افریقہ میں چھوٹے چھوٹے بہت سے مورچے بلقان کی کشمکش اور دفعتاً یونان پر اٹلی کا حملہ — ان سب واقعات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ تشبیہ اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔

سردی کا موسم آجانے سے یورپ کی لڑائی کسی قدر ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ افریقہ میں بھی برطانوی سمالی لینڈ کے خاتمہ کے بعد سے کوئی خاص مورچہ نہیں ہوا تھا۔ ۲۸، اکتوبر کو یونان پر اٹلی کے اچانک حملے نے یہ جمود توڑ دیا۔

اٹلی ایک عرصہ سے یونان پر دانت لگائے ہوئے تھا اس لئے کہ بحر روم پر اس کا قبضہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ یونان کا ساحل اس کے اثر میں نہ آجائے۔ اس کے علاوہ وہ سوئز پر بھی نظر جمائے تھا بلکہ ایک

جرمنی سے خشکی کے راستہ سے اس طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس محاذ پر اٹلی کو کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی تھی اور جرمنی بھی کہر اور برفباری کی وجہ سے خاموش تھا۔ باہمی مشورہ سے طے پا گیا کہ بحروم روم کو لڑائی کا مرکز بنا دیا جائے۔ چنانچہ اٹلی نے حکومت یونان کو الٹی میٹم دیدیا کہ وہ اپنی زمین پر اٹلی کو فوجی اڈے بنانے کا حق دیدے ورنہ تین گھنٹہ کے اندر اندر اطالوی فوجیں دھاوا کر دیں گی یونانی حکومت نے کچھ تو اپنے قومی وقار کے پاس سے اور کچھ برطانیہ اور ٹرکی کی مدد کا بھروسہ کر کے اٹلی کا مطالبہ رد کر دیا اور جنگ شروع ہو گئی۔ یونان کی جو اہمیت اٹلی کے لئے ہے وہی برطانیہ کے لئے ہے۔ اسی لئے برطانیہ نے کسی قدر توقف کے بعد یونان کو کمک بھیج دی۔

یونان اور اٹلی کی لڑائی کو ایک مہینہ ہو گیا ہے۔ اس عرصہ میں عجیب عجیب خبریں آتی رہی ہیں۔ جن میں سے تازہ ترین یہ ہے کہ اب یونان کی سرزمین پر کوئی اطالوی سپاہی نہیں رہ گیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یونانیوں نے بڑھکر البانیہ کے بعض مقامات پر قبضہ کر لیا ہے۔ یونانیوں کے طبعی حالات کو دیکھتے ہوئے یہ تو یقینی ہے کہ اٹلی کو یہاں کافی دقتیں اٹھانا پڑی ہونگی۔ آگے بڑھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ پیرس کی پہاڑیاں اور کیچڑ سے بھری ہوئی دریاں ہیں جنمیں اٹلی کے ٹینکوں اور بھاری توپوں کا گذر نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی بات ہے کہ یونان والے اپنے قومی وقار کی حفاظت کے لیے لڑ رہے ہیں اور لڑائی میں اپنی جانوں کی بازی لگائے ہیں لہذا اٹلی کی ہار کچھ عجیب بات نہیں یونان کے دشوار گذار راستے اس موسم میں بالکل ہی ناقابل گذر ہو گئے ہیں البتہ موسم بدلنے پر اٹلی ایک دفعہ پھر پورے زور سے حملہ کریگا۔

پھر بھی یونان کی خبروں سے ہمیں پولینڈ اور فن لینڈ کی لڑائیوں کی خبریں یاد آتی ہیں جن میں ایک عرصہ تک برابر یہی ظاہر کیا جاتا رہا کہ پولینڈ میں جرمنی ہار رہا ہے اور فن لینڈ کی فوجوں نے آگے بڑھکر روس کے علاقے چھین لئے ہیں پھر ایکدم سے معلوم ہوا کہ پولینڈ میں جرمنی جیت گیا۔ اور فن لینڈ نے روس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے

جنگ نے یونان تک پہنچکر مشرق قریب کو بھی بے چین کر دیا ہے۔ فلسطین اور شام کے ہوائی اور سمندری اڈے۔ عراق کا تیل اور ترکی کے ساحل مقامات جنگی اعتبار سے اتنے اہم ہیں کہ جرمنی اور اٹلی ادھر متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ ملک ابھی تک برطانیہ کے اثر میں ہیں اور جگہ جگہ برطانی فوجیں مقیم ہیں اس لیے اس طرف اگر لڑائی شروع ہوئی تو بہت سخت مقابلہ ہوگا۔ سردست یونان کی لڑائی کا سب سے زیادہ اثر ترکی پر پڑ رہا ہے اور ترکی کے ارباب حل وعقد کے عندیہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا جھکاؤ برطانیہ کی طرف ہے ظاہر ہے کہ جرمنی اسے برداشت نہیں کر سکتا لیکن روس نے اسے روک رکھا ہے ترکی اور روس کی دوستی سے ایسی صورت پیدا ہو گئی ہے کہ نہ برطانیہ ترکی کو دبا سکتا ہے اور نہ جرمنی اس کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی کر سکتا ہے دونوں کو اندیشہ ہے کہ اگر ترکی پر حملہ ہوا تو روس بھی جنگ میں پھاند پڑے گا۔

روسی وزیر اعظم موسیو مولوٹاف کا اپنے متبیل [illegible] روس سمیت برلن جانا اور ہر ہٹلر اور ان کے مشیروں سے تبادلہ خیال

کرنا سیاسی اعتبار سے یورپ کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ اس وقت جرمنی کے سامنے دو مشکلیں ہیں ایک تو یہ کہ اسے ڈر ہے کہ کہیں برطانیہ کے کہنے میں آکر ترکی یونان میں مداخلت نہ کر بیٹھے اور دوسرے یہ کہ خود امریکہ میں روزولٹ کے تیسری بار صدر منتخب ہو جانے سے برطانیہ کو وہاں سے دن بدن زیادہ سے زیادہ مدد مل رہی ہے جرمنی اس کے مقابلہ میں روس سے سامان حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ۱۲ نومبر سے ۱۴ نومبر تک برلن میں جو ڈھونگ رچایا اسکا سبب صرف یہ تھا کہ وہ روس کی مدد سے یہ دونوں مشکلیں آسان کرے۔ ایک طرف تو ترکی پر روس سے دباؤ ڈلوا کر اسے برطانیہ سے منحرف کر دے اور دوسری طرف روس سے سامان جنگ اور کچھ مال حاصل کرکے اپنی اقتصادی حالت مضبوط کرے۔ اگر روس پوری طرح جرمنی کے ساتھ آجائے تو جرمنی کو ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ وہ پورے یورپ کو اپنے اثر میں لے آئیگا اور بغیر لڑائی کو آخر حد تک پہنچائے اپنا مقصد حاصل کرلے گا۔

مولوٹاف اپنے ساتھ ماہرین کا جو لاؤ لشکر لائے تھے اس سے پتہ چلتا ہے کہ جرمنی اور روس کی بات چیت کافی حد تک پہنچ گئی ہے لیکن اس تاریخی ملاقات کے نتائج پر دونوں طرف جو خاموشی ہے اس سے تو شبہہ ہوتا ہے کہ جرمنی روس کو موہ لینے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ غالباً اسی لیے اب ہٹلر نے اپنے وزیر خارجہ ربن تراپ کی مدد سے دانستہ میں ایک دوسرا جال بچھایا ہے اور یورپ کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو جرمنی اٹلی اور جاپان کے معاہدے میں شرکت کے فائدے اور مستقل امن کے سبز باغ دکھا دکھا کر محور کی تابعداری پر آمادہ کر رہا ہے۔ ہنگری رومانیہ اور سلواکیہ اس جال میں پھنس چکے ہیں اور خبر ہے کہ بلغاریہ کے بھی وزیر اعظم اور وزیر خارجہ جرمنی جا رہے ہیں۔

یورپ کی اس پیچ در پیچ سیاست سے ہٹ کر نگاہ مشرق بعید پر پڑتی ہے یہاں جاپان ادھم مچائے ہوئے ہے چین میں تین برس کی مسلسل لڑائی کے بعد بھی اتنی سکت ہے کہ وہ جاپان کو نہ صرف روکے ہوئے ہے بلکہ اس سے مفتوحہ علاقے بھی ایک ایک کرکے چھینے رہا ہے جاپان نے غالباً چین کو ناقابل تسخیر سمجھ کر ہی اب جنوب کا رخ کیا ہے انڈوچین پر اس کا قبضہ ہو گیا لیکن سیام میں ابھی لڑائی ہو رہی ہے ہینان اور جنوبی انڈوچین میں جاپانی فوجوں کی نقل و حرکت جاری ہے اور ڈر ہے کہ کہیں اس سے ان کا دھاوا جزائر شرق الہند پر نہ ہو جائے اس جوار میں سنگاپور واقع ہے جہاں برطانیہ کا بہت زبردست سمندری اڈا ہے اور اسے جاپان کے مقابلہ میں امریکہ سے بھی مدد کی امید ہے اگرچہ جزائر فلپائن میں منیلا کے مقام پر امریکہ کا سمندری اڈا ہے لیکن وہ جاپان کو روکنے کے لیے ناکافی ہے البتہ سنگاپور مل کر امریکہ کیساتھ ملکر جاپان کے مقابلہ میں ایک اچھی خاصی طاقت کھڑی کر دیگا۔

Accession Number 123802
Date 21.3.95

نسیم سندیلوی بی اے آنرز ایڈیٹر اینڈ پبلشر نے شاہی پریس میں چھپوا کر جاپلنگ مارٹ دفتر اضطراب لکھنؤ سے شائع کیا